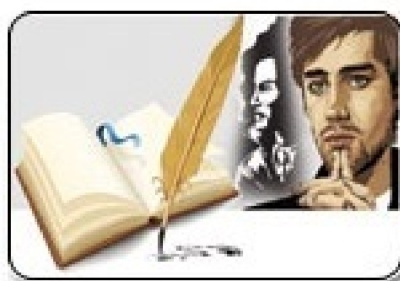




ناول......پری زاد: یہ دنیا ظاہر پرستوں کا ڈیرہ ہے......

من کتنا ہی میلا کیوں نہ ہو تن اجلا ہونا چاہیے، انسان کی سب سے بڑی دشمن اس کی توقعات ہیں، دنیا کے بدصورت آئینوں کے مقابل......اِک حسن پرست کا فسانہ......ہاشم ندیم

Novel: PariZaad
Written by: Hashim Nadeem
Compiled by: Muhammad Bilal Ashraf

All Episodes: 1 - 28

Hashim Nadeem khan is a Baloch play writer whose literary services recently awarded by "Poona festival award" .The famous baloch writer Hashim Nadeem was born in Quetta and got his early education from there.He obtained his intermediate education from cadet college Pataro and entered in the field of medicine. After getting medicine education from Bolan medical college of Quetta he involveled himself in Blochistan civil service as assistant commissioner.

PariZaad was Published in Jang Sunday Magzine.

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ’’خدا اور محبت‘‘ اور ’’بچپن کا دسمبر‘‘ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ’’عبداللہ‘‘ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز فلم کے شعبے میں ’’عبداللہ‘‘ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

’’پری زاد‘‘ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ملاحظہ کیجیے، ہمارے ’’نئے ناولٹ‘‘ ناول کی پہلی قسط۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

نرجس ملک، ایڈیٹر، ’’سنڈے میگزین‘‘ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

ایک سرائیکی گیت ہے ’’میرے محبوب یہ تیری یک بارگی جدائی بڑی جان لیوا ہے...... مگر تجھے مجھ سے بچھڑنا ہی ہے، تو دھیرے دھیرے قسطوں میں بچھڑ......‘‘ اس بار کا موسمِ گرما بھی کچھ اسی سنگ دل محبوب جیسا روپ دھارے، دھیرے دھیرے قسطوں میں بچھڑنے کے جتن کر رہا تھا۔ تیز گرم تپتی دھوپ میں کول تار کی لمبی سنسان سڑک کسی سیاہ گلیشیئر سے پگھلی ہوئی جھیل جیسی چمک رہی تھی۔ میرے پرانے فلیٹ جوتوں کا تلوا نیچے سے کئی جگہ سے گُھل چکا تھا، لہٰذا ابلتا ہوا کول تار میرے پیروں میں انگارے بھر رہا تھا۔ اسکول کی چھٹی کے بعد گھر تک یہ راستے کا پُل صراط مجھے ہر روز ہی پار کرنا ہوتا تھا۔ کتنی بار دبے لفظوں میں اماں کو جتا چکا تھا کہ میرے پیروں کے چھالے اب شمار کی حد سے نکلتے جا رہے ہیں، مگر نو بہن بھائیوں میں سے فریاد کا میرٹ نکالا جاتا، تو میری عرضی کا نمبر چھٹا تھا اور ابا کی تنخواہ بس اتنی کہ وہ صرف اماں ہی کی سُن سکتے تھے۔ راستے سے گزرتے ہوئے حسبِ معمول چند لمحوں کے لیے جوتوں کی بڑی دکان کے چھجّے تلے سستانے کے لیے ٹھہرا اور ہمیشہ کی طرح حسرت بھرے تجسّس کے ساتھ دکان کی شیشے کی دیوار سے ہاتھوں کا کٹورا بنا کر جھانکنا شروع کر دیا۔ اندر ایک ملازم، ایک میم صاحب کو اس کی پسند کے سینڈل پہنا کر جانچ کروا رہا تھا۔ کتنی پیاری تھی، وہ گوری سی میم، دودھ میں ڈھلی، آبشار کی جلترنگ کی مانند نکھری نکھری سی...... مگر خیالات کا تسلسل جلد ہی ٹوٹ گیا، کیوں کہ شاید پہلے دکان کے مالک اور پھر ملازم نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ ملازم تیزی سے باہر آیا اور حقارت بھرے لہجے میں مجھے جھڑکنے لگا۔ ’’اوئے! کتنی بار تجھے کہا ہے کہ یہاں شیشے کے پاس کھڑا نہ ہوا کر، سارا شیشہ گندا کر دیا۔ چل بھاگ یہاں سے، ورنہ مار کھائے گا۔‘‘ میں جلدی سے گھبرا کر اپنا بستہ سنبھالے آگے بڑھ گیا۔ یہ نفرت و حقارت، یہ رویہ میرے لیے، کوئی نیا نہیں تھا۔ بچپن ہی سے مجھے ایسے تحقیر آمیز رویوں کا سامنا تھا، اور پھر لوگوں سے کیا گلہ، شکوہ، میری صورت، میرا حلیہ ایسے رویّے، ایسی ہی نفرت و حقارت کا متقاضی تھا۔ میں اپنے ماں باپ کا چھٹا بچہ تھا۔ ابا ایک شربت پیک کرنے والی کمپنی میں کام کرتے تھے۔ صبح سے شام تک بوتلوں کو گتّے کے ڈبوں میں بھر کے شام کو جب گھر آتے تو ان کے غصّے کا جن کُھل چکا ہوتا۔ اور پھر ہم سب کونوں کھدروں میں دبک کر باقی کا دن گزارا کرتے۔ قلیل تنخواہ، ضروریات، مہنگائی اوپر سے نو بچّوں کی فوج۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا کہ یہ جو غریب والدین ہوتے ہیں، یہ اپنی غربت بانٹنے کے لیے ہی اپنا آنگن بچوں سے بھر لیتے ہیں یا پھر شاید یہ ان کا غربت سے کوئی انتقام ہوتا ہے۔

وہ سردیوں کی ایک طویل اور کٹھن رات تھی، جب میرا جنم ہوا۔ نانی بتاتی تھیں کہ میری پیدائش کے وقت حسبِ معمول کم خوراکی کی وجہ سے اماں کی صحت اور طبیعت کافی بگڑی ہوئی تھی۔ نتیجتاً میری صورت میں ایک کم زور، لاغر اور گہرے سانولے رنگ کا بچہ اس دنیا میں وارد ہوا۔ باقی بہن بھائی پھر بھی کافی بہتر اور کھلی ہوئی گندمی رنگت لیے پیدا ہوئے تھے۔ یہ نہ جانے قدرت نے ساری سیاہی میرے مقدر کی دوات ہی میں کیوں انڈیل دی تھی۔ چھوٹی خالہ کی، اماں سے ہمیشہ ہی کچھ نہ کچھ کھٹ پٹ چلتی رہتی تھی، انہیں تو جیسے موقع ہی مل گیا۔ جھٹ بولیں۔ ’’آئے ہائے باجی! یہ اتنا کالا کلوٹا سا بچہ کس پر چلا گیا، لگتا ہے، جیسے آنگن میں اماوس کی رات اُتر آئی ہے۔‘‘ اماں جو پہلے ہی میرے رنگ کی وجہ سے جلی بُھنی پڑی تھیں، تلملا ہی تو گئیں ’’جیسا بھی ہے، ہے تو میری ہی اولاد۔ ویسے تمہاری اس جھینگی بیٹی سے تو زیادہ ہی پیارا ہے۔‘‘ اب جلنے کی باری خالہ کی تھی، وہ بھی تڑپ کر بولیں۔ ’’ہاں ہاں، بڑا کوہ قاف کا شہزادہ جَنا ہے تم نے۔‘‘ اماں بھلا کہاں پیچھے رہنے والی تھیں۔ ’’ہاں میرے لیے کوہ قاف کا شہزادہ ہی ہے، اور میں نے تو اس کا نام بھی شہزادوں جیسا سوچ رکھا ہے۔ ’’پری زاد‘‘ ہاں، بس یہی نام ہوگا، میرے بچّے کا۔‘‘ ’’پری زاد‘‘ آس پاس موجود سب ہی عورتیں زیرِلب بڑبڑائیں اور کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو اشارے کرتی باہر نکل گئیں۔ ’’پری پیکر تو سُنا تھا، یہ پری زاد بھلا کیا نام ہوا۔‘‘ بس وہی دن تھا، جب میری قسمت میں ہمیشہ کے لیے لوگوں کی نظر میں تمسخر، طنز اور حقارت لکھ دی گئی تھی۔ کاش! اُس روز اماں چھوٹی خالہ کے طنز کے جواب میں خاموش رہتیں تو میری زندگی اتنی تلخ نہ ہوتی۔ میری کالی سیاہ رنگت، لاغر جسم اور غیر دل کش نین نقش والی مسکین سی صورت کا تعارف جب پری زاد کے نام سے کروایا جاتا تو سُننے والا خود بخود قہقہہ لگانے پر مجبور ہو جاتا۔ مجھے یاد ہے، جب مجھے پہلی جماعت میں داخل کروایا گیا تو استاد نے سب بچّوں کو فرداً فرداً کھڑا کر کے ان کے نام پوچھے تھے۔ میری باری آئی، تو میں نے

کھڑے ہو کر معصومیت سے اپنا نام بتایا۔ "پری زاد" استاد چند لمحے حیرت سے میرے پرانے لباس اور حلیے کو دیکھتے رہے، پھر مجھے دیکھ کر زور سے ہنس پڑے۔ "واہ شہزادے...... نام تو بڑا کمال رکھا ہے، ماں باپ نے......" استاد کی بات پر باقی بچے بھی زور زور سے ہنسنے لگے۔ تب میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ آخر میرے نام میں ایسی کیا خامی ہے کہ جو بھی سنتا ہے، مذاق اُڑاتا ہے، مگر پھر دھیرے دھیرے مجھے احساس ہوتا چلا گیا کہ مسئلہ نام کا نہیں، صورت کا ہے۔ اور پھر اسکول ہی کیا، گلی، محلے اور بازار میں، جہاں بھی میرے نام کی شہرت پہنچتی، پہلے تو لوگ اچنبھے کا شکار ہوتے اور پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی ان کی حیرت ایک طنزیہ مسکراہٹ میں تبدیل ہو جاتی۔ مگر میں اُس وقت ایک ناسمجھ بچہ تھا، نہیں جانتا تھا کہ اس دوغلی دنیا میں انسان کا من چاہے، جتنا بھی میلا ہو، تَن ضرور اُجلا ہونا چاہیے۔ بندے کے دل میں چاہے کتنا ہی کھوٹ ہو، چہرے اور صورت میں کوئی کھوٹ نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ یہ دنیا ظاہر پرستوں کا ڈیرہ ہے۔ روح کا اُجلاپن اور خوب صورتی کو پرکھنے والی آنکھیں ان بے بصیرت لوگوں کے پاس کہاں......؟

میری بدنصیبی کی داستان یہیں ختم نہیں ہوتی تھی۔ میرے ساتھ یہ مذاق تب سنگین تر ہونے لگے، جب شاید ڈھائی یا تین سال کی عمر ہی سے میرے مَن میں چُھپی "خوب صورتی کی چاہ" کو آس پاس کے لوگوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا۔ اماں بتاتی تھیں کہ بھری پُری محفل میں جب کوئی مجھے پکارتا، تو میں درمیان میں بیٹھی درجن بھر عورتوں کو چھوڑ کر صرف اُسی کی گود میں جا بیٹھتا، جو اس محفل میں سب سے اُجلے چہرے والی ہوتی تھی۔ خوب صورتی کی یہ چاہ صرف خوب صورت چہروں تک ہی محدود نہیں تھی، مجھے قدرت کی بنائی ہر خوب صورت چیز سے پیار ہو جاتا تھا، چاہے وہ پھول ہوں، رنگ، خوشبو، آسمان یا بادل۔ کوئی دُھن ہو، بارش یا برف سے سجا کوئی نظارہ، کچھ بھی ہو۔ مجھے یاد ہے، میں اسکول کے رستے میں آنے والی ایک تصویروں کی دکان کے باہر گھنٹوں کھڑا خوب صورت نظاروں والی تصاویر کو دور ہی سے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہتا تھا، مگر مجھ جیسے غریب خاندان میں پیدا ہونے والے بچّے کے اندر پلتی یہ حُسن پرستی تو جیسے دُہرا عذاب بن گئی۔ شاید دنیا کی ہر خوب صورت چیز پر صرف حسین لوگوں ہی کا حق ہوتا ہے۔ بدصورت لوگوں کے لیے ہر طرف صرف بدصورتی ہی پہنچتی ہے۔ سو، میرے آس پاس بھی ہر لمحہ وہ بدصورتی ہی بھٹکتی رہتی، چھوٹا سا کچا گھر، کچرے سے اَٹی گلیاں، دھول اُڑاتا محلّہ اور سب سے بڑھ کر لوگوں کی کرخت اور بدصورت سوچ اور نظریں۔

اس پر طرفہ تماشا یہ کہ پانچویں جماعت میں، جس دن اسکول میں چیچک سے بچاؤ کے ٹیکے لگانے والی سرکاری ٹیم آئی تھی، اُس روز میں نہ جانے کس وجہ سے اسکول ہی نہیں جا پایا اور ٹھیک ایک ماہ بعد میرے چہرے پر عجیب سے سرخ سرخ دانے ابھرتے دیکھ کر اماں نے چلّا کر ابا سے کہا کہ "پری زاد کے باوا، یہ لڑکے کا چہرہ تو دیکھو، یہ کیسے دانے ہیں؟" ابا بھاگم بھاگ مجھے لیے سرکاری اسپتال ٹیکا لگوانے پہنچ تو گئے، مگر تب تک بیماری اپنا کام کر چکی تھی اور پھر جب چند ہفتوں بعد زخموں کا کھرنڈ اترا تو بیماری ساری عمر کے لیے چہرے پر چیچک کے بدنما داغوں کی نشان چھوڑ چکی تھی اور ان داغوں سے بھی کہیں زیادہ گہرے داغ اور زخم تو مجھے ان لوگوں کی باتوں نے لگائے، جو بظاہر تیمارداری کرنے اور اماں سے ہم دردی جتانے آتے تھے، مگر ہنسی مذاق کی تہہ میں، طنز کے ایسے نشتر اور تیر چلاتے کہ اس چھوٹی عمر میں بھی میرا دل چھلنی ہو کے رہ جاتا۔ کون کہتا ہے، انسان نے اس جدید دور میں میزائل، بم اور ڈرون ایجاد کر کے تباہی پھیلائی ہے۔ جتنا گہرا گھاؤ انسان کی زبان کسی انسان کے دل میں لگا سکتی ہے، اس کی کاٹ اور زخم کا مقابلہ، یہ نئے دور کے ہتھیار کسی صورت نہیں کر سکتے۔ کبھی کبھی میں سوچتا کہ ایٹم بم کے موجد کو شاید زبان کے زہر کا ٹھیک طرح سے ادراک نہیں ہوگا، ورنہ اسے دنیا برباد کرنے کے لیے اتنی محنت نہ کرنا پڑتی۔

شاید میرے والدین کا بھی اس معاملے میں اتنا قصور نہیں تھا۔ جب کسی غریب گھرانے میں یکے بعد دیگرے اوپر نیچے تو بچّے پیدا ہو جائیں، تو پھر ان میں سے کسی ایک بچّے کی حسّاسیت کا بھلا کسے خیال رہتا ہے۔ یہ میری اپنی بدقسمتی تھی کہ میں ایسی صورت کے باوجود بھی اندر سے بے حد حساس واقع ہوا تھا۔ کاش! انسان اس دنیا میں صرف غریب ہی پیدا ہوتا یا صرف نازک دل۔ مجھ جیسے لاکھوں کروڑوں بچّے اس ملک کی ان ہی گلی کوچوں کی دھول چاٹتے رل کھل کر بڑے ہو ہی جاتے ہوں گے، مگر میری حسّاسیت نے میری زندگی کا خارزار میرے لیے طویل تر کر ڈالا۔ میں جتنا لوگوں کی آنکھوں سے چُھپتا، اُتنا ہی ان کی نظر میں آ جاتا تھا۔ اور پھر میرے اندر پلتا وہ ایک حُسن پرست پری زاد، جسے ہر خوب صورت چہرہ اس قدر لبھاتا تھا کہ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔ مجھ سے بڑی تین بہنیں اور سب سے بڑے دو بھائی اور مجھ سے چھوٹی ایک بہن اور دو بھائی سب ہی کی زندگی مزے میں گزر رہی تھی، کیوں کہ انہیں نہ تو اپنی زندگی سے کوئی توقع تھی، اور نہ ہی جیون کا برتاؤ ان سے کچھ الگ تھا۔ شاید زندگی میں سب سے بڑی دشمن ہماری اپنی توقعات ہی ہوتی ہیں۔ کانٹوں میں الجھا کر رکھنے والی امیدیں، گرم تپتی ریت پر چلنے پر مجبور کر دینے والی توقعات۔ میں آٹھویں جماعت میں تھا، جب دو بڑے بھائیوں کی اکٹھی شادی کر دی گئی، گھر میں دو افراد کا اضافہ ہو گیا اور ہم سب بہن بھائی اپنی اپنی مخصوص جگہوں سے سرکتے باہر برآمدے اور صحن میں آ گئے۔ چھوٹے سے گھر کی تقسیم کتنی مشکل ہوتی ہے۔ جہاں باتیں تو در کنار، ایک دوسرے کی سوچ بھی سنائی دے جاتی ہے۔ لہٰذا دھیرے دھیرے، ہم بہن بھائیوں کی سوچ بھی سرگوشیانہ ہوتی چلی گئی۔ شاید مجبوری اور غلامی کی انتہا بھی یہی ہوتی ہوگی کہ انسان اپنی سوچ کی بولی بھی اونچی نہ ہونے دے، سوچنا بھی سرگوشیوں میں شروع کر دے۔

بھائیوں کی شادی کے بعد گھر کی مزید آبادی بڑھی تو ہم سب کو مزید سرکا دیا گیا۔ کمرے والے برآمدے میں، برآمدے والے صحن میں اور میں جو صحن میں سوتا تھا، میرے لیے فرمان صادر ہوا کہ باقی بھائی بہن چوں کہ چھوٹے ہیں، لہٰذا مجھے گھر کی چھت پر بنے ایک کچے گودام نما کمرے میں منتقل ہونا پڑے گا۔ چھت پر ٹین اور مٹی کا بنایہ چھوٹا سا کمرا گھر کا کاٹھ کباڑ جمع کرنے کے کام آتا تھا۔ غریبوں کی زندگی میں کوئی چیز فالتو نہیں ہوتی۔ ایک سال پہلے جس شے کو فالتو کچرا سمجھ کر اس گودام میں پھینک دیا جاتا تھا۔ اگلے سال اسی کی تلاش میں اماں اور بڑی بہنیں سارا گودام الٹ پلٹ رہی ہوتی تھیں۔ میرے لیے بھی یہی حکم تھا کہ میں گودام کی تمام ''قیمتی اشیاء'' ایک طرف سلیقے سے لگا کر اپنی پرانی چارپائی اس گودام میں ڈال لوں۔ آتے وقت میں اپنی کورس کی کتابیں بھی وہیں اٹھا لایا۔ اب اسکول سے واپسی پر کھانا کھانے کے بعد میں چپ چاپ اوپر بنے ٹین کی چھت والے کمرے میں چلا آتا۔ شروع شروع میں مجھے یہاں کچھ گھٹن سی محسوس ہوئی، مگر پھر دھیرے دھیرے اپنی اس تنہائی سے سکون ملنے لگا۔ یہ تنہائی میرے پورے وجود میں سرایت کرنے لگی اور پھر جیسے میری، اپنی اس تنہائی سے دوستی سی ہوگئی۔ تنہائی میں ہم خود اپنے ساتھ ہوتے ہیں اور مجھ جیسا لڑکا، جسے کسی ساتھی کا بھی ساتھ میسّر نہیں تھا۔ اس کے لیے اپنا یہ ساتھ کتنا غنیمت تھا۔ یہ میں ہی جانتا تھا، آہستہ آہستہ میری ہی تنہائی مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ وہ مجھے اوروں کی طرح بدصورت، لاغر اور کم تر نہیں سمجھتی تھی۔ بلکہ میں اس کے لیے حقیقت میں ایک پری زاد تھا، وہ میرے ساتھ مختلف دل چسپ کھیل کھیلا کرتی۔ میری تنہائی کبھی مجھے اسکول کا سب سے لائق ہونہار طالب علم بنا دیتی، جو ضلع بھر میں اول پوزیشن لینے کے بعد کھچا کھچ بھرے ہال میں ہیڈ ماسٹر سے ٹرافی وصول کر رہا ہوتا، تو کبھی اسکول کا سب سے بہترین کھلاڑی بن کر سارے مقابلے جیت رہا ہوتا اور میری ہر کامیابی پر سارا اسکول دیوانہ وار تالیاں بجاتا۔ غرض، میری تنہائی نے میرا ہر وہ خواب سچ کر دکھایا، جس کا میں عام زندگی میں کبھی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ کلاس میں، مَیں ایک درمیانے درجے کا شرمیلا طالب علم تھا، جس نے غیر نصابی سرگرمیاں تو دُور، کبھی نصاب میں بھی کوئی غیر معمولی کارکردگی نہیں دکھائی تھی۔ اگر غلطی سے استاد کبھی مجھ سے کوئی سوال پوچھ بھی لیتے تو میری ٹانگیں کانپنے لگتیں۔

مجھ سے بڑے بھائیوں نے تو جیسے تیسے دسویں کا امتحان پاس کر کے چھوٹی موٹی نوکریاں شروع کردی تھیں۔ اور اب اپنی دنیا میں مگن تھے اور ان ہی دنوں، جب میں دسویں جماعت میں تھا۔ میری بڑی بہن کی بات کہیں طے ہوگئی اور اس کے سُسرال والوں کی ضد کے آگے ہار کر ابا کو رخصتی کی ہامی بھرتے بنی۔ ہماری برسوں کی لگی بندھی زندگی کی روٹین میں ایک ذرا سی ہلچل پیدا ہوئی اور اماں نے آس پاس کی پڑوسنوں اور لڑکیوں بالیوں کو ڈھولکی کے لیے ہفتہ بھر پہلے ہی روزانہ شام کو گھر آنے کی دعوت دے دی، ایسے مواقع پر میں زیادہ تر چھت پر اپنے ڈربے نما کمرے ہی میں قید رہتا، حالاں کہ دل بہت چاہتا تھا کہ صحن میں جھانک کر محلے کی لڑکیوں کو شور و غل اور ہنگامہ کرتے دیکھوں۔ ان کی ہنسی اور قہقہوں کی آواز اوپر کمرے تک آتی، تو کئی بار چھت کی منڈیر تک بھی آتا، مگر پھر واپس لوٹ جاتا۔ اگر کسی کام سے گھر سے باہر بھی جانا ہوتا، تو چپ چاپ صحن کی پچھلی جانب سے نیچے اُترتا۔

اُن دنوں سرِ شام ہی محلے کے نوجوان لڑکے ہماری گلی کے اردگرد منڈلانے لگے تھے اور میری اماں یا ابا کے بلاوے پر بھاگ بھاگ کر گھر کے کام یوں کرتے، جیسے یہ ان کا فرض ہو۔ مجھ پر یہ بھید بہت دیر میں کھلا کہ ان میں سے ہر ایک محلے کی کسی نہ کسی لڑکی کی ایک جھلک دیکھنے کی آس میں یہ ''گلی یاترا'' کرتا ہے۔ کبھی کبھار ان کے قریب سے گزرتے ہوئے ان کی سرد آہیں اور عشقیہ جملے میرے کانوں میں بھی پڑ جاتے۔ ''یار! کیا ہوا، وہ آئی کہ نہیں؟'' ''کہاں یار! اس کا تو گھر سے نکلنا ہی عذاب ہوچلا ہے، تُو بتا تیری والی آئی کہ نہیں......؟'' ''ہاں، آئی تو ہے، پر اس کی اماں کی بڑی کڑی نگرانی ہے آج کل اُس پر، سوچتا ہوں، خط پکڑانے کی کوئی ترکیب کروں۔'' میں حیرت سے ان سب کی یہ باتیں سُنتا اور رشک سے ان سب کو دیکھا کرتا، میری نظر میں وہ سب لوفر بہت عظیم درجہ رکھتے تھے۔ بھلا اس دنیا میں کسی کا محبوب بننے سے بھی بڑا کوئی درجہ ہوسکتا ہے۔ عاشق تو لاکھ مل جائیں گے، محبوب کے درجے پر شاذ و نادر ہی کوئی فائز ہوتا ہے۔ یہ خود کو کتنا مکمل کر دینے والا احساس تھا کہ کوئی اس دنیا میں ایسا بھی ہے، جو اپنی تنہائی میں آپ کو سوچتا ہے، آپ کی فکر کرتا ہے، آپ کی یاد اس کے ہونٹوں پر ایک میٹھی سی مسکان بکھیر دیتی ہے۔ مجھ جیسے معمولی لڑکے کے لیے تو یہی زندگی کی معراج تھی کہ محلے کی کسی لڑکی نے میری طرف دیکھنا تو در کنار، کبھی ایک اچٹتی سی نگاہ بھی نہیں ڈالی۔ لڑکیاں تو لڑکیاں، مجھ سے تو محلے کے خوب رُو لڑکے بھی بات کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ گھنٹوں آپس میں اپنے معاشقوں کی باتیں کرتے رہتے اور میں ان کے قریب بیٹھے ہونے کے باوجود کبھی اتنی توجہ کا باعث بھی نہیں بن سکا تھا کہ ان میں سے کوئی مجھ سے اتنا ہی کہہ دے کہ ''بھائی جاؤ، جا کر اپنا کام کرو، کہاں ہمارے درمیان گھسے بیٹھے ہو؟'' ان میں سے اگر کبھی کسی کی کوئی اچٹتی نگاہ مجھ پر پڑ ہی جاتی تو وہ بڑی بے پروائی سے کہتا ''یار پری! جلدی سے جا کر ایک ڈبیا کیپسٹن کی تو پکڑ لا۔'' ہم سب عُمر کے اس دور میں تھے، جہاں گھر والوں سے چُھپ کر سگریٹ پینا بھی ایک کارنامہ سمجھا جاتا تھا اور ان کی نظر میں میری وقعت بس اتنی تھی کہ میں ان کی یہ ہلکی پھلکی خدمت کرتا رہوں۔ یا پھر یوں کہہ لیں کہ میں ان کی نظر میں قطعی بے ضرر تھا، عاشق کو خطرہ صرف اپنے رقیب سے ہوتا ہے اور میری اتنی اوقات ہی نہیں تھی کہ میں کسی ادنیٰ درجے کے رقیب کے عہدے پر ہی فائز ہوسکوں۔

ان دنوں محلے میں ناہید نامی لڑکی کا بہت چرچا تھا۔ محلے کے سبھی لڑکوں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں، اس پری چہرہ نے۔ اور ہماری گلی میں جمع ہونے والی اس بھیڑ کی بنیادی وجہ بھی ناہید ہی تھی۔ کیوں کہ وہ روزانہ اپنی ماں کے ساتھ مغرب کے بعد ہمارے گھر کی تقریب میں شامل ہونے آتی تھی۔ ہمیشہ نظریں جھکائے اور سر پہ اوڑھنی اوڑھے ناہید کو میں نے بھی ایک آدھ بار گلی میں آتے جاتے دیکھا تھا۔ سفید لباس میں وہ کتنی پاکیزہ اور کتنی معصوم دکھائی دیتی تھی۔ شادی کا دن قریب تھا اور گھر میں ہنگامہ بھی اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا، جب ایسی ہی ایک شام میں گھر کے صحن سے گزر کر کسی کام سے باہر جانے کے لیے نکلا تو صحن میں بیٹھی کسی لڑکی کی آواز سنائی دی۔ ''ذرا سُنیے......'' میں نے پلٹ کر دیکھا اور میری سانس تھم گئی، مجھے پکارنے والی کوئی اور نہیں، ناہید ہی تھی۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، مُلک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ’’خدا اور محبت‘‘ اور ’’بچپن کا دسمبر‘‘ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ’’عبداللہ‘‘ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز فلم کے شعبے میں ’’عبداللہ‘‘ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

’’پری زاد‘‘ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ’’سنڈے میگزین‘‘ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

تھوڑی دیر کے لیے تو مجھے اپنے کانوں پر یقین ہی نہ آیا۔ میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا، جیسے میرے پیچھے یا صحن میں آس پاس کوئی اور موجود ہے، جسے ناہید نے آواز دی ہوگی۔ مگر وہاں تو میرے سوا کوئی نہ تھا۔ میری نظر ایک پل کے لیے اس کی جانب اٹھی اور اس کی سیاہ گھنی پلکوں اور بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں سے ٹکرا کر دوسرے ہی پل زمین میں گڑ گئی۔ شاید دنیا کا سب سے بڑا لحاظ یا رعب، لحاظِ حُسن، یا رعبِ حُسن بھی ہوتا ہے۔ اور میرے لیے تو یہ ویسے بھی ایک ناقابلِ یقین اور ان ہونی تھی۔ میں نے اس لڑکی کے لیے محلے کے کڑیل جوانوں کو تپتی دوپہروں میں گھنٹوں اسکول کے رستے میں کھڑے جلتے دیکھا تھا، مگر وہ اسکول سے واپسی پر یا کبھی گلی محلے سے گزرتے ہوئے آنکھ اٹھا کر بھی کسی کی طرف نہیں دیکھتی تھی۔ مجال ہے، جو آج تک کسی نے اسے ننگے سَر دیکھا ہو۔ آج وہی محلے کی سب سے خوب صورت لڑکی مجھ سے براہِ راست مخاطب تھی۔ مجھ سے، جسے اس کے اپنے گھر والے بھی عموماً بھول جاتے تھے۔ میں تو اگر کھانے کے لیے کبھی دیر سے چھت سے نیچے آتا، تو عام طور پر چھوٹے بہن بھائی سب صفا چٹ کر چکے ہوتے اور اماں مجھے دیکھ کر سر پیٹ لیا کرتیں کہ ’’ارے...... تُو تو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔‘‘ پھر میں کیوں حیران نہ ہوتا، جب اس نے میرا نام لے کر دوبارہ پوچھا۔ ’’آپ خالہ صغراں کے بیٹے ہیں ناں...... پَری زاد......‘‘ میرا جی چاہا کہ اسے روک کر کہوں کہ پَری تو آپ ہیں، میں تو صرف زادہی زاد ہوں۔ مگر میرے حلق سے عجیب و غریب سی آواز نکلی۔ ’’جی......‘‘ ’’آپ ذرا اس شادی کے ہنگامے سے فارغ ہولیں، تو ایک بار ہمارے گھر کا چکر لگا لیجیے گا۔ میری امی آپ کو یاد کر رہی تھیں۔‘‘ وہ بات ختم کر کے نہ جانے کب کی جاچکی تھی، مگر میرے قدم تو جیسے وہیں صحن کی کچی زمین میں دھنس کر رہ گئے۔ میں جانے کتنی دیر وہیں کھڑا ان چند گھڑیوں کے خواب یا گمان ہونے کے بارے میں سوچتا رہا۔ میرا ذہن یہ تسلیم کرنے کو ہرگز تیار نہ تھا کہ وہ پل حقیقت بھی ہوسکتے ہیں، جب وہ مجھ سے ہم کلام تھی۔ واقعی کچھ لوگ ہمارا نام پکاریں، تو نام بھی معتبر لگنے لگتا ہے۔

مَیں جیسے کسی طلسم کے زیرِ اثر باہر گلی میں نکلا تو حسبِ معمول لفنگوں کی ایک ٹولی گلی کے نکڑ پر جمع تھی۔ وہ سب اس کی باتیں کر رہے تھے۔ ان میں ماجد بھی تھا۔ محلے کا سب سے کڑیل اور خوبرو جوان، میرے ہم عُمروں میں سب سے زیادہ زندہ دل اور ہر محفل کی جان، پڑھائی لکھائی میں بھی آگے اور شام کو جب محلے کے باقی لڑکے بڑے میدان میں کرکٹ کھیلا کرتے، تو ماجد کی تیز باؤلنگ اور ہوا میں اُڑتے لمبے بال دیکھنے کے لیے ہم بھی تماشائی گھنٹوں کھڑے رہا کرتے۔ میں چُپ چاپ نکڑ پر کھڑے لڑکوں کی ٹولی کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ وہ سب ناہید ہی کا ذکر کر رہے تھے۔ ان سب نے خود اپنے طور پر ہی، اپنی پسند کے مطابق محلے کی لڑکیاں اپنے اپنے ناموں سے منسوب کر رکھی تھیں۔ اور ماجد کے نام کا قرعہ اس کی جاذبِ نظر شخصیت اور ہر دل عزیزی کی وجہ سے ناہید کے نام نکلتا تھا۔ ماجد خود بہت عرصے سے ناہید کے گھر کے چکر کاٹ کاٹ کر تھک چکا تھا۔ مگر بقول اس کے، وہاں اس کی دال گلتی نظر نہیں آتی تھی۔ اس وقت بھی وہی ذکرِ جاناں جاری تھا۔ اکرم نے پوچھا ’’یار ابتا تو سہی، کچھ بات تو کی ہوگی اس نے تجھ سے......‘‘ ماجد نے ایک لمبی سی سرد آہ بھری۔ ’’کہاں یار...... اُس نے تو جیسے مجھ پر نظر نہ ڈالنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ جانے کب اپنے بھاگ کھلیں گے‘‘ پھر اچانک ماجد کی مجھ پر نظر پڑی۔ میں منہ کھولے محویت سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ماجد نے ایک دم ہی مجھ سے سوال کر ڈالا ’’ارے پَری زاد...... تُو نے کبھی کسی سے عشق کیا ہے......؟‘‘ سب لڑکوں نے ماجد کی بات سُن کر زوردار قہقہہ لگایا۔ میں شرمندہ سا ہوگیا۔ ’’میں نے...... نہیں تو......‘‘ ماجد سنجیدہ سی شکل بنا کر بولا۔ ’’ہر کسی کو زندگی میں ایک بار عشق ضرور کرنا چاہیے۔ عشق آدمی کو انسان بنا دیتا ہے۔‘‘ اکرم نے شرارت سے ماجد کی طرف دیکھا اور معنی خیز لہجے میں بولا ’’صرف ایک بار، ذرا پھر سوچ لے ماجد۔‘‘ سب لڑکے ایک بار پھر زور سے ہنس پڑے۔ سارا محلّہ جانتا تھا کہ نہ صرف ہمارے محلے، بلکہ آس پاس کی جانے کتنی گلیوں میں ماجد کے چکر چلتے تھے۔ ایک بار تو میرا جی چاہا کہ میں بھی ان سب کو آج یہ بتا کر حیران کردوں کہ جس ناہید کی ایک جھلک پانے کے لیے وہ سب یہاں گھنٹوں سے کھڑے ہیں، اُسی ناہید نے آج خود مجھ سے نہ صرف بات کی بلکہ اپنے گھر بھی بلایا ہے۔ مگر پھر یہ سوچ کر خاموش ہوگیا کہ بھلا کون میری بات پر اعتبار کرے گا۔ اُلٹا

مزید مذاق بنے گا۔

وہ میری زندگی کی پہلی رات تھی، جو مجھ سے گزارے نہیں گزر رہی تھی۔ پہلے تو میں اپنے کمرے ہی میں چارپائی پر کروٹیں بدلتا رہا، پھر تنگ آ کر اس جھلنگا سی چارپائی کو کمرے سے باہر کھینچ کر کھلے آسمان تلے تاروں کی چھت کے نیچے ڈال دیا اور پھر ساری رات تاروں سے پوچھتا رہا کہ آخر ایسی کیا بات ہوسکتی ہے، جس کے لیے اس "ستارہ جبیں" نے مجھے اپنے گھر آنے کو کہا ہے؟ کہتے ہیں، جادوگر اور بازی گر ہمیں کھلا دھوکا دیتے ہیں۔ یہ ہماری نظر بندی کر کے جانے کیسے کیسے کھیل تماشے دکھا جاتے ہیں۔ آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں، مگر اس رات مجھے یہ احساس ہوا کہ سب سے بڑا جادوگر اور ماہر ترین بازی گر تو خود ہمارے سینے کے اندر دھڑکتا یہ دل ہوتا ہے۔ جادوگروں اور بازی گر کی نظر بندی کا علاج تو شاید پھر بھی ممکن ہو، مگر اس کم بخت دل کی نظر بندی کا کوئی علاج نہیں۔ میرے دل نے بھی اس رات میری عقل پر پردے ڈال کر میری نظر بندی کردی تھی۔ اپنے سیاہ چیچک زدہ چہرے کو بھلا کر میں کسی شہزادے کی طرح ساری رات اپنے سپنوں میں ناہید کا ہاتھ تھامے انجان وادیوں میں بھٹکتا رہا۔ کبھی کبھی ہمارے خواب بھی کتنے خوب صورت ہو جاتے ہیں، شاید اسی لیے انہیں "خواب" کہا جاتا ہے۔

اس رات کے بعد نیند تو جیسے مجھ سے روٹھ سی گئی تھی۔ جیسے تیسے کر کے میں نے شادی کے دن گزارے اور پھر رخصتی کے ٹھیک دوسرے دن جھجکتے ہوئے ناہید کے گھر کے دروازے پر دستک دے دی۔ ناہید کے ابا نے دروازہ کھولا، جنہیں ہم سب مرزا چچا کہتے تھے۔ ان کا غصہ سارے محلے میں مشہور تھا۔ "ہاں بھئی، کیا بات ہے......؟" انہوں نے کڑک دار لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ میں پل بھر کے لیے تو بوکھلاہٹ میں سب بھول گیا۔ وہ دوبارہ گرجے۔ "اب کچھ بولو گے بھی یا یونہی منہ میں گھنگنیاں ڈالے کھڑے رہو گے......؟" میں گھگھیایا "جی......وہ...... میں...... مجھے بلایا تھا خالہ نے......" انہوں نے حیرت سے مجھے ایک بار پھر سر سے پیر تک غور سے دیکھا۔ "اندر آ جاؤ......" میں اس وقت کو کوس رہا تھا، جب میں نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا تھا، بہر حال اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کچھ دیر میں ناہید کی امی آگئیں اور عقدہ یہ کھلا کہ ناہید کے نویں جماعت کے پرچے ہونے والے تھے اور سالانہ امتحانات میں اسے اردو کے مضمون میں رہنمائی چاہیے تھی۔ جانے اس کی امی کو کس نے یہ کہہ دیا تھا کہ میری اردو بہت اچھی ہے۔ مجھے خود بھی یقین نہیں آ رہا تھا، کیوں کہ مجھے پوری زندگی میں آج تک اتنی اہمیت کبھی نہیں ملی تھی۔ طے یہ پایا کہ میں شام کو چار سے پانچ بجے تک ایک گھنٹہ ناہید کو اردو کی تیاری کروا جایا کروں گا۔ مرزا صاحب ٹیوشن کی فیس بھی مقرر کرنا چاہتے تھے، مگر میں نے انہیں ٹال دیا۔ ناہید کے گھر سے نکلنے کے بعد بہت دیر تک تو مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا کہ اس خوب صورت حادثے پر میرا ردِعمل کیا ہونا چاہیے۔ رات تک میں ایک صدمے کی سی کیفیت میں رہا۔ صدمے کا تعلق ہمیشہ غم ہی سے نہیں ہوتا، کبھی کبھی اچانک مل جانے والی بے پناہ خوشی بھی ہمارے عمومی رویے سے متصادم ہو جاتی ہے۔ شاید ساری بات ظرف کی ہے، خوشی ہو یا غم، ہمارے ظرف کے پیمانے سے بڑھ جائے تو ہم اپنی ظاہری شخصیت کا رکھ رکھاؤ کھو بیٹھتے ہیں، میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا اور اگلے دن، تین چار مرتبہ اماں اور بڑے بہن بھائیوں سے مختلف باتوں پر ڈانٹ پڑ گئی۔ مثلاً میں عام طور پر شاذ و نادر ہی آئینہ دیکھا کرتا تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مجھے آئینے سے ڈر لگتا تھا۔ مگر اُس روز، جب لگاتار تیسری مرتبہ برآمدے میں لگے آئینے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے شیشے میں جھانکا تو برآمدے میں کچھ کام کرتے بڑے بھائی نے مجھے گھورا "خیر تو ہے...... یہ کنگھی پٹی آج کس خوشی میں کی جا رہی ہے؟" میں سٹپٹا سا گیا۔ "تمہارے دسویں کے امتحانات سر پر ہیں، اپنی پڑھائی کی طرف دھیان دو، آئینہ دیکھنے کے لیے ساری زندگی پڑی ہے۔" میں جلدی سے سر ہلا کر وہاں سے ہٹ گیا۔ اس روز گھڑی کے ہندسوں کی مجھ سے جیسے کوئی جنگ سی جاری تھی۔ میں گھنٹہ بھر بعد بھی گھڑی کی طرف دیکھتا تو سوئی صرف چند منٹ ہی آگے کھسکی ہوتی۔ شاید گزرتے وقت کا تعلق کسی سوئی یا گھڑی سے نہیں ہوتا۔ وقت ہمیشہ ہماری لمحوں کے ساتھ ضد سے ناپا جاتا ہے۔ ہماری مرضی کے خلاف ہمیشہ ہماری خواہش کے برعکس گھڑیوں کے گزرنے کو وقت کا نام دے دیا گیا ہے۔ جب ہم اسے تیز تر چاہتے ہیں، یہ سُست تر ہو جاتا ہے، اور جب کبھی ہم اس کے آہستہ پن کی دعا اور التجا میں گڑگڑا رہے ہوتے ہیں، اسے پَر لگ جاتے ہیں، تو پھر ہم بھولے انسان وقت کو گھڑی یا سوئی کے پیمانے پر کیوں ناپتے ہیں۔ بس، اپنے دل میں جھانک کر اپنی خواہش ٹٹول لیا کریں، وقت ہمیشہ اس کی مخالف سمت ہی دوڑتا ملے گا۔

ٹھیک چار بجے شام، میں ناہید کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ گلی میں اکادکا لوگ آ جا رہے تھے، شکر ہے، اس وقت ماجد اور اس کے دوستوں کی ٹولی وہاں مورچہ جمائے نہیں بیٹھی تھی، ورنہ مجھے ہزار سوالوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ دروازہ ناہید کے چھوٹے بھائی نے کھولا۔ اور مجھے اندر لے جا کر صحن میں لگی انگوروں کی بیل کے نیچے بچھی کرسی پر بٹھا دیا۔ سامنے ایک چھوٹی سی میز اور دوسری کرسی بھی رکھی ہوئی تھی۔ میرا دم پُھول رہا تھا۔ دھڑکن بے قابو تھی، اور سانس رُک رُک کر آ رہی تھی۔ میں نے بچپن ہی سے اپنے لیے لوگوں کی نظر میں اس قدر تحقیر اور تمسخر دیکھا تھا کہ مجھے براہِ راست اوپر دیکھنے یا سامنے والے کی آنکھوں میں دیکھ کر بات کرنے کی عادت ہی نہیں رہی تھی، لہٰذا جب ناہید اپنا سیاہ دوپٹا سر پر جمائے ہوئے آ کر بیٹھی، تو تب بھی میری نظریں نیچے زمین ہی میں گڑی ہوئی تھیں۔ حتیٰ کہ جب اس کے گورے پاؤں سیاہ سینڈلز میں جکڑے میری نظر کے دائرے میں آئے تو میں نے گھبرا کر اپنی آنکھیں مزید جُھکا لیں اور خود اپنے جوتوں کو دیکھنے لگا۔ ناہید نے کتابیں میز پر رکھ دیں اور شاعری کا باب نکال کر بولی۔ "سب سے پہلے تو آپ مجھے یہ میر تقی میر اور درد کی شاعری کی تشریح کرنا سکھا دیں۔ ہمیشہ یہ سوال مجھ سے رہ جاتے ہیں۔" میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا، جیسے کوئی غائب دماغ مقرر حاضرین سے کھچا کھچ بھرے ہال کے سامنے اسٹیج پر آ کر یک دم اپنے دماغ سے مِٹ جانے والی تقریر کو یاد کرنے کی کوشش میں وقت ضائع کرتا ہے۔ پتا نہیں، میں نے شعر کی تشریح کیا کی اور نثر کا باب کہاں سے شروع کر کے کہاں ختم کیا۔ ناہید کے کومل ہاتھ صفحے پلٹتے گئے اور میں اس کے ہاتھوں کی لکیروں میں اپنا ڈوبا ہوا مقدر تلاش کرتا رہا۔ ٹھیک پانچ بجے ناہید کی امی چائے کا کپ لے کر آ گئیں اور میں نے حیرت سے برآمدے میں لگی بڑی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ایک گھنٹہ گزر بھی گیا۔ پھر وہی وقت کی ہماری خواہش سے جنگ......؟ میں چائے کا کپ ختم کر کے وہاں سے نکل آیا۔ میں نے زندگی میں کبھی نشہ نہیں کیا تھا، مگر کبھی کبھی سُرور کا تعلق صرف کسی نشہ آور شے سے نہیں ہوتا۔ کچھ پل ایسے ہوتے ہیں، جب فضا میں، ہوا میں، آس پاس کے ماحول ہی میں نشہ گُھل جاتا ہے۔ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ، جو بن پیے، بنا کسی گناہ کے بوجھ تلے دبے اس سُرور کا نشہ لیتے ہیں۔ اس روز میں بھی پورا دن بنا کسی نشے کے سرور میں رہا۔ مگر کہتے ہیں کہ دنیا کا ہر نشہ عارضی ہوتا ہے، عموماً رات بھر کے خمار کے بعد صبح اتر ہی جاتا ہے۔ میرا نشہ بھی صبح آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہی بھک سے اڑ گیا۔ میں بے خیالی میں کنگھی کرنے کے لیے اپنے کمرے میں لگے ٹوٹے اور میلے سے آئینے کے ایک ٹکڑے میں اپنا چہرہ دیکھ بیٹھا اور میرے سارے سپنے پل بھر میں کرچی کرچی ہو گئے۔ کاش یہ آئینہ ایجاد نہ ہوا ہوتا، تو ہم جیسوں کے لیے دنیا اتنی مشکل جگہ نہ ہوتی۔ اس پل میرا جی چاہا کہ دنیا کے سارے آئینے

توڑ ڈالوں یا کاش ایسا ہو جائے کہ دنیا کے سارے خُوب صورت اندھے ہو جائیں۔ یا پھر اوپر والے نے دنیا میں ہر صورت ایک سی ہی بنادی ہوتی، تو اس بصارت یا آئینے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔

اگلے روز ناہید کے گھر کے باہر ہی مجھے ماجد نے دھرلیا۔ ”ہاں، شہزادے! کیا چکر ہے، ہماری بجّی کے گھر، وہ بھی ہم سے چُھپ چُھپ کے......!“ میں نے ماجد کو ٹیوشن والی بات بتائی۔ ماجد نے ایک لمبی سی سرد آہ بھری۔ ”ہاں میاں! یہی تو فائدے ہوتے ہیں لکھ پڑھ جانے کے۔ چلو عیش کرو، میری قسمت میں تو ویسے بھی اُس ظالم کی نظر نہیں ہے۔ کبھی پلٹ کر دیکھتی تک نہیں“۔ پھر ماجد کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ ”ارے ہاں...... یاد آیا۔ یار ایک خط تو لکھ دے کسی کے نام، دراصل میری لکھائی اتنی اچھی نہیں ہے اور سُنا ہے، لڑکیوں پر اچھی لکھائی کا بڑا اثر ہوتا ہے“۔ ”کوئی اور وقت ہوتا، تو میں شاید ماجد کو ٹال دیتا، کیوں کہ ہر ہفتے کسی نہ کسی کے قدموں میں پھینکنے کے لیے ماجد کو ایسے خط اور رقعوں کی ضرورت پڑتی رہتی تھی، مگر اس وقت چوں کہ ٹیوشن کا وقت نکلا جا رہا تھا، اس لیے میں نے بادلِ نخواستہ چند سطور ایک سادے صفحے پر گھسیٹ کر ماجد کے حوالے کر دیں۔ وصول کرنے والی کا نام اس نے نہیں لکھوایا اور اپنے نام کی جگہ بھی خالی رہنے دی تاکہ وہ اپنے ”متاثر کن“ دستخط کر سکے۔ میں جیسے تیسے جان چُھڑوا کر ناہید کے گھر کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ آج مرزا صاحب بھی گھر میں موجود تھے اور صحن میں بیٹھے حقّہ گڑگڑا رہے تھے۔ ہماری پڑھائی کے دوران وہ بھی وقتاً فوقتاً لقمے دیتے رہے اور کچھ جگہ میری تصحیح بھی کی۔ اب انہیں کوئی بتاتا کہ تصحیح ہوش مندوں کے لیے ہوتی ہے۔ مدہوش بھلا یہ درست اور غلط کی تکرار کیا جانیں۔ ناہید کی باتوں سے اس دن میں نے اندازہ لگایا کہ اسے شعروشاعری سے کافی لگاؤ ہے اور اسے بہت سے اچھے شعر بھی زبانی یاد ہیں۔ مگر میرے ساتھ ایک بہت عجیب سا مسئلہ یہ تھا کہ میں دن بھر شام کے چار بجنے کا انتظار کرتا رہتا۔ پل پل کانٹوں پر کاٹ کر گزارا کرتا، مگر جیسے ناہید میرے سامنے آتی اور اس کے حُسن کے نُور کی پہلی کرن میری آنکھوں پر پڑتی، میری نظریں خود بخود جھک جاتیں۔ مجھے ناہید کے گھر ٹیوشن پڑھانے جاتے ہوئے سات آٹھ روز ہو چکے تھے اور ان دنوں میں، میں نے شاید سات پل کے لیے بھی اس کے چہرے کو براہِ راست نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ بس اس کے ہاتھ، کنگن، چوڑیوں کی کھنکھناہٹ، آواز کا زیر و بم، بالوں کی وہ ایک لمبی سی شریر لٹ، جو بار بار چہرے سے نیچے ڈھلک کر اُسے تنگ کرتی رہتی تھی، اس کی مخروطی انگلیاں اور اس کا وہ قلم پکڑنے کا ایک خاص انداز۔ بس یہی کچھ ان لمحوں کا سرمایہ تھا۔ ہاں البتہ ایک فائدہ مجھے یہ ضرور ہوا تھا کہ ناہید کو اردو پڑھانے کے چکر میں، مَیں خود دن بھر اردو کے رٹے لگا تا رہتا اور اپنے اردو کے استادوں سے اس روز کی ٹیوشن کے باب بھی خوب اچھی طرح سمجھ کر آتا تاکہ مجھ سے کوئی غلطی نہ ہو جائے، سو اس مشق سے میری اپنی دسویں کی اردو کی تیاری بہت اچھی ہو گئی۔

میرے میٹرک کے امتحانات قریب آ رہے تھے۔ اسکول کی طرف سے دسویں جماعت کو شہر کے مقامی سنیما میں اردو فلم دکھانے کے لیے لے جایا گیا۔ ہیرو پیانو پر بیٹھا ایک محفل میں ہیروئن کو اپنے دل کا حال سُنا رہا تھا۔ سفید لباس میں ملبوس وہ ہیرو، پیانو بجاتے ہوئے مجھے بہت اچھا لگا اور جانے کیوں اُسی لمحے میرے اندر بھی پیانو سیکھنے اور بجانے کی خواہش، ایک شدید کسک کی صورت میں جاگ اٹھی۔ اس رات میں نے خود کو خواب میں وہی سفید سوٹ پہنے پیانو بجاتے دیکھا اور ناہید اسی فلم کی ہیروئن کی طرح پیانو کے پہلو سے جُڑی میرے قریب کھڑی محویت سے میری دُھن سُن رہی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ خواب میں میرا چہرہ اور وجود کسی بھی قسم کے داغ دھبوں اور سیاہی سے بالکل پاک صاف تھا۔ صبح جب اچانک کسی کھٹکے سے میری آنکھ کُھل گئی تو بہت دیر تک میں نے صدمے کے مارے آنکھیں میچے رکھیں۔ کچھ خواب کتنے اثر انگیز اور روح تک میں سرایت کر جانے والے ہوتے ہیں کہ بہت دن تک ہمیں اُداس اور بے چین رکھتے ہیں۔ تب ہمارا جی چاہتا ہے کہ کاش ہماری موجودہ زندگی ایک خواب ہوتی اور وہ خواب ہماری زندگی سے بدل جاتے، مگر کچھ لوگوں کے خواب، سدا خواب ہی رہتے ہیں۔ میں بھی ان ہی میں سے ایک تھا۔

ناہید کو ٹیوشن پڑھاتے ہوئے مہینہ بھر ہونے کو آیا تھا۔ میرے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا کورس تقریباً ختم ہونے کو تھا، بلکہ مرزا صاحب نے تو اب ہفتے میں صرف تین دن ٹیوشن اور تین دن خود ناہید کی اپنی دُہرائی کے لیے مقرر کر دیے تھے۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، کیوں کہ میں جانتا تھا کہ چند دن بعد یہ تین دن کی ملاقات بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ اس تمام عرصے میں ناہید نے مجھ سے کبھی کورس کی کتابوں اور اپنی ٹیوشن کے ہوم ورک کے علاوہ کوئی بات نہیں کی تھی، مگر پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا تھا کہ ہم دونوں اُس ایک گھنٹے میں زمانے بھر کی باتیں کرتے ہیں۔ شاید حُسن کی اپنی کوئی گفتگو، کوئی بولی ہوتی ہے، جسے عام لفظوں یا زبان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یا شاید خوب صورتی کا احساس ہی اپنے اندر سارے جہاں کی گفتگو سموئے رکھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ناں، تخیلے کی باتوں میں، گفتگو اضافی ہے۔ میں ناہید کے گھر سے نکلنے کے بعد بھی اُسی تخیلے میں مقید رہتا۔

اُس رات بھی میں اپنے کمرے میں گود میں کتاب رکھے اپنے آپ سے اسی گفتگو میں مصروف تھا کہ اچانک باہر گلی میں ایک شور سا اٹھا، جیسے بہت سے لوگ کسی کا چیختے چلاتے پیچھا کر رہے ہیں۔ میں گھبرا کر کمرے سے باہر نکلا اور چھت سے نیچے گلی میں جھانکا، تو عجیب سا شور مچا ہوا تھا۔ جلدی سے نیچے اتر کر معلومات کیں، تو بھانت بھانت کی باتیں سُن کر میرے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ گلی میں چند بزرگ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ”نہ میاں...... کوئی کسی کی چھت پر یونہی نہیں ناچتا۔ ضرور لڑکی کی طرف سے کوئی اشارہ ہوگا“۔ دوسرے صاحب منمنائے۔ ”ہاں بھئی، یہ آج کل کی نئی نسل بھلا بڑوں کی عزت اور غیرت کیا جانے“۔ پتا چلا کہ مرزا صاحب کے گھر والے خاندان کی کسی تقریب سے واپسی پر لیٹ ہو گئے تھے۔ گھر میں صرف ناہید اور اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ کسی پڑوسی نے اُن کے چھت پر کسی کو کودتے دیکھا تو شور مچا دیا۔ سایہ شناخت ہوئے بنا فرار ہونے میں کام یاب ہو چکا تھا، مگر اپنے پیچھے افواہوں اور بدنامیوں کا ایک سیلاب چھوڑ گیا تھا۔ مجھے ان سب پر بہت غصّہ آیا کہ وہ ناہید جیسی شریف اور باکردار لڑکی پر ایسے الزامات لگا رہے تھے۔ اگلے دن بھی محلے میں یہی چرچا رہا۔ دن کے تقریباً دو بجے کے قریب کسی نے ہمارے گھر کا دروازہ بے تحاشا پیٹنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے ابا جی اور پھر ان کے پیچھے دونوں بڑے بھائی بھی گھر سے باہر نکلے، باہر سے مرزا صاحب کے شور شرابے کی آواز آ رہی تھی۔ میں بھی سن گن لینے کے لیے دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ باہر محلے داروں کی بھیڑ میں کھڑے مرزا صاحب غصّے اور نفرت سے چلائے۔ ”یہ رہا...... یہاں گھر میں چُھپا بیٹھا ہے۔ جیسی اس کی شکل مکروہ ہے، ویسے ہی گھناؤنے کرتوت ہیں اس کلوے کے“۔ میں نے حیرت سے گھبرا کر ان سب کی طرف دیکھا۔ ”جی......؟ مگر میں نے کیا کیا ہے؟“ ”کیا کیا ہے تم نے؟ خوب...... ابھی بتاتا ہوں“۔ انہوں نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر سب کے سامنے لہرایا۔ ”اب یہ نہ کہنا کہ یہ خط تم نے نہیں لکھا۔ تمہاری تحریر خوب پہچانتا ہوں میں لفنگے“۔ میں نے پہلی نظر ہی میں ماجد کے لیے لکھا اپنا خط پہچان لیا اور میری زبان سے حیرت میں بے ساختہ نکلا۔ ”ہاں...... مگر یہ خط تو میں نے“۔ مگر میری بات ادھوری ہی رہ گئی اور مرزا صاحب کا ہاتھ تیزی سے گھوما اور میرے گال پر ایک زنّاٹے دار چانٹا پڑ گیا۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حسّاس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

سناٹے میں اس زوردار تھپڑ کی آواز ایسے گونجی، جیسے بم دھماکا ہوا ہو، مگر آواز کے دھماکے سے کہیں زیادہ گونج میرے اندر بہت کچھ ٹوٹ جانے کی تھی۔ مرزا صاحب نے اس طمانچے کے بعد مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا اور چیخ چیخ کر مجھے کو بتانے لگے کہ گزشتہ رات ان کی چھت پر کوئی اور نہیں، میں کودا تھا اور اس بات کی خبر ناہید کی امی کو صبح سویرے اُس وقت ہوئی، جب وہ چھت پر کپڑے ڈالنے گئیں اور انہیں وہاں ایک کونے میں میرا لکھا ہوا یہ خط مڑا تڑا سا پڑا ہوا ملا۔ وہ سب گھر والے میری تحریر اچھی طرح پہچانتے تھے، کیوں کہ ناہید کا اردو کا رجسٹر میری تحریر سے بھرا پڑا تھا۔ سارے محلے دار مجھے لعنت ملامت کرنے لگے۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح زمین شق ہو اور میں اس میں سما جاؤں۔ مرزا صاحب کے بھاری تھپڑ کے نشان تو اگلے تین دن میں دھیرے دھیرے گال سے مدھم پڑنے لگے، مگر روح پر لگے تھپڑ کے داغ پھر عمر بھر مندمل نہ ہو پائے۔ بھیڑ کے چھٹتے ہی ابا اور بڑے بھائی مجھے گردن سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اندر صحن میں لے آئے اور پھر جس کے ہاتھ جو آیا، اس نے اسی سے میرے جسم پر سیاہ نیل ڈال دیے۔ بدن پر چوٹ کے نشان نیلگوں ہوں تو انہیں نیل کہا جاتا ہے، مگر جب گھائل کا پورا جسم سیاہ پڑ جائے تو اسے کیا کہا جائے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ انہیں بتا سکوں کہ وہ خط میری تحریر میں ضرور تھا، مگر میرا نہیں تھا، مگر کسی نے میری ایک نہ سنی۔ ”اچھا...... تو یہ تھی تمہاری ٹیوشن...... خوب عزت افزائی کروائی ہے آج ہماری، ڈوب مرو شرم سے...... عشق لڑانے سے پہلے اپنی شکل تو آئینے میں دیکھ لینی تھی۔“ جسم پر چوٹ کے ساتھ، روح پر بید کی طرح پڑنے والا اک اک طعنہ بھی کسی تازیانے کی طرح لگتا رہا۔

بہت روز تک تو میں شرم کے مارے چھت والے کمرے ہی سے باہر نہیں نکلا۔ سارے گھر والوں نے تقریباً میرا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ میں دن بھر کمرے میں بیٹھا سوچتا رہتا کہ آخر ماجد کو دیا گیا وہ رقعہ ناہید کی چھت سے کیسے برآمد ہوا۔ جانے ناہید میرے بارے میں کیا سوچتی ہوگی، اسے بھی تو باقی سب لوگوں کی طرح یہی لگا ہوگا کہ میں اسے یہ عشقیہ خط دینے کے لیے رات کو اس کی چھت ٹاپا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح ناہید تک اپنے دل کی بات پہنچاؤں کہ مجھے اپنی شکل اور اپنی اوقات کا اچھی طرح سے اندازہ ہے اور میں کبھی ایسی گستاخی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میرے دل میں اس کے لیے جو بھی تھا، وہ ہمیشہ کے لیے میرے دل کے کسی نازک گوشے میں پنہاں رہنے کے لیے تھا۔ پجاری کی پوجا کسی صلے کی تمنا کے لیے تو نہیں ہوتی۔ پروانے کو شمع سے موم کا دان کب چاہیے ہوتا ہے، اسے تو بس جل جانا ہوتا ہے، مجھے بھی صرف جلنے سے واسطہ تھا، روشنی کس کے حصے میں آئے، اس سے بھلا مجھے کیا غرض تھی۔ دسویں کے امتحانات میں نے بوجھل دل اور الجھے ہوئے دماغ کے ساتھ دیے اور بہ مشکل سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوا۔ بڑی مشکل سے ابا سے کالج میں داخلے کی اجازت ملی۔ وہ بھی اس شرط پر کہ اپنی کتابوں اور کالج کی فیس کا خرچہ میں خود برداشت کروں گا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ کالج کے بعد شام کو کوئی چھوٹی موٹی نوکری یا کسی دکان پر کام پکڑ لوں گا۔ اس لیے کالج میں داخلے کی کوشش کے ساتھ ساتھ، دن بھر شہر کے چھوٹے موٹے ہوٹلوں اور پیٹرول پمپس وغیرہ پر کام ڈھونڈنے کے لیے بھٹکتا رہتا۔

ایسے ہی ایک دن میں کام ڈھونڈنے شہر کے پارسی ہوٹلوں والی سڑک پر نکلا تو ایک لمحے کو یوں لگا، جیسے آنکھوں کو دھوکا ہوا ہے۔ میں نے آنکھیں مل کر غور سے دیکھا، تو وہ واقعی ناہید ہی تھی، شاید اسکول کی چھٹی کے بعد کسی کے ساتھ اس ریسٹورنٹ میں چائے پینے آئی تھی۔ ناہید اب دسویں جماعت کی طالبہ تھی، اور اس علاقے میں اسکول یا کالج کی طالبات کا گروپ کی شکل میں چائے پینے یا بریک میں سموسے چٹنی کی پلیٹ اڑانے کے لیے آنا معمول کی بات تھی۔ میرا دل زور سے دھڑکا، شاید آج ہی وہ موقع تھا، جب میں ناہید سے مل کر اس کی غلط فہمی دور کرسکتا تھا۔ مگر جانے اس کے ساتھ اور کون کون ہو، اور اگر ناہید نے برا منایا اور غصہ کیا تو پھر......؟؟ ایک اور تماشا نہ کھڑا ہو جائے۔ پھر تو میرے ابا کے ہاتھوں میرا خون ہونا لازمی تھا، مگر میرے پاس اور چارہ بھی کیا تھا۔ جانے پھر دوبارہ ناہید سے زندگی بھر اس طرح آمنا سامنا ہو پائے یا نہیں۔ مجھے ایک کوشش تو ضرور کرنی چاہیے، آخر ناہید نے خود بھی تو مہینہ بھر مجھ سے پڑھا ہے۔ میرے بارے میں کچھ اندازہ تو اس نے بھی لگایا ہوگا، میں نے تو کبھی نظر بھر کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ میں اپنے آپ ہی سے لڑتا، خود ہی فیصلے کر کے انہیں رد کرتا رہا اور پھر اپنے اندر کی جنگ سے گھبرا کر مزید کچھ سوچے بنا کیفے کی طرف قدم بڑھا ہی دیے۔ اندر بہت رش تھا، میں پریشان نگاہوں سے اُسے چاروں طرف کھوج رہا تھا، اور پھر...... وہ مجھے ایک کیبن کے پردے کی اوٹ میں بیٹھی دکھائی دے گئی۔ کچھ اطمینان ہوا کہ چلو اس کے ساتھ زیادہ بھیڑ نہیں ہے، بات کرنے میں آسانی ہوگی سو، دھڑکتے دل کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا کیبن کے پاس پہنچ گیا۔ بیرا کچھ دیر پہلے

ہی چائے کے کپ میز پر سجا کر واپس پلٹا تھا۔ ناہید کسی سے بات کر رہی تھی اور اس کے سر پر اس کی سیاہ چادر ہمیشہ کی طرح سلیقے سے ٹکی ہوئی تھی۔ میں نے دل کڑا کر کے زور سے کھنکار کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا اور دھیرے سے سلام کیا۔ اس کی سہیلی ابھی تک پردے کی اوٹ میں تھی۔ ناہید نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر، جیسے اس کے چہرے کا رنگ اُڑ سا گیا۔ میں نے قدم آگے بڑھایا کہ میرا مقصد اس کی بدنامی نہیں ہے۔ میں تو صرف اس کی غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں، مگر کیبن میں بیٹھے دوسرے شخص کو دیکھتے ہی خود میرے حواس یک دم مختل سے ہوگئے۔ ناہید کے سامنے کوئی اور نہیں، ماجد بیٹھا تھا۔ وہی ماجد، جس نے مجھ سے ناہید کے لیے رقعہ لکھوایا تھا۔ ماجد بھی پل بھر کے لیے گھبرا گیا۔ میں تیزی سے واپس پلٹا اور کیفے سے باہر آ گیا۔ ماجد میرے پیچھے دوڑتا ہوا باہر تک آیا اور زبردستی راستے میں حائل ہو کر معذرت کرنے لگا۔ ’’معاف کر دے یار پری...... میں خود تجھے بتانا چاہتا تھا، مگر ناہید نے منع کر دیا کہ فی الحال معاملہ گرم ہے۔ ذرا بات ٹھنڈی ہو جائے تو پھر...... مگر تو نے بھی بڑا مردوں والا کام کیا۔ تیرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، تو نے آخر تک زبان نہیں کھولی۔‘‘ میرا سر تیزی سے چکرا رہا تھا۔ ناہید جانتی تھی کہ اس کی چھت پر اُس رات ماجد کو دا تھا، پھر بھی اس نے اپنے گھر والوں سے یہ بات چھُپائے رکھی۔ مجھے میرے گھر، محلے والوں کے سامنے اتنا رسوا کیا، سارے زمانے میں میرا تماشا بنا دیا۔ میرا سر گھوم رہا تھا، میں نے بہ مشکل ماجد سے سوال کیا۔ ’’تو کیا وہ خط تم نے ناہید ہی کے لیے لکھوایا تھا؟‘‘ ’’ہاں یار! اُسی کو دینا تھا۔ ایک دن اس نے میرے سامنے تمہاری لکھائی کی تعریف کی، تو میں نے بھی اس سے شرط لگالی کہ تمہارے ہی ہاتھ سے خط لکھوا کر اُسے دوں گا۔‘‘ میں نے حیرت سے ماجد کو دیکھا۔ ’’مگر تم تو ہر وقت یہی کہتے تھے کہ وہ تمہیں کبھی گھاس تک نہیں ڈالتی......‘‘ ماجد نے کھسیا کر قہقہہ لگایا۔ ’’وہ سب بھی میں ناہید کے کہنے ہی پہ کہتا تھا، تُو نہیں جانتا یار۔ یہ لڑکیاں ہم بے وقوف لڑکوں سے کہیں زیادہ تیز ہوتی ہیں۔ بڑا دماغ چلتا ہے، ان کا ایسے معاملات میں، دراصل وہ کسی بھی طرح کی بدنامی مول نہیں لینا چاہتی تھی۔ آج بھی بڑی مشکل سے اسے چائے کے ایک کپ کے لیے راضی کیا تھا۔ پر تُو نے آ کر سارا معاملہ بگاڑ دیا۔‘‘ میرا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ماجد اپنی دھن میں نہ جانے کیا کچھ بولتا رہا۔ اتنے میں کیفے کا ایک بیرا باہر آیا اور ماجد سے بولا۔ ’’آپ کو اندر بلا رہی ہیں۔ کہتی ہیں، مہمان کو بھی ساتھ لے آئیں، ضروری بات کرنی ہے۔‘‘ میں نے لاکھ دامن چھڑانے کی کوشش کی، مگر ماجد مجھے تقریباً کھینچتا ہوا اندر کیفے میں لے گیا۔ ناہید سر جھکائے بیٹھی تھی۔ مجھے اندر آتے دیکھ کر دھیرے سے بولی۔ ’’امید ہے آپ نے ہم دونوں کو معاف کر دیا ہوگا۔ ہم دونوں کی وجہ سے آپ کو جو تکلیف پہنچی، ہم اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ میں خود آپ سے مل کر آپ کو ساری بات بتانا چاہتی تھی، مگر حالات ایسے بگڑے کہ میں کچھ نہ کر سکی۔‘‘ میں چپ چاپ بیٹھا اس کی بات سنتا رہا۔ اس سے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ کم از کم مجھے تو سچ بتا دیتی۔ ناہید نے اپنی بات جاری رکھی۔ ’’دراصل میں چاہتی تھی کہ جب تک ماجد کے گھر سے میرے لیے باقاعدہ رشتہ نہیں آ جاتا، تب تک کسی کو بھی ہمارے بارے میں ذرا سا بھی شک نہ ہو۔ آپ تو اباجی کے غصّے سے واقف ہیں ناں۔ اس رات بھی ماجد کی ایک ذرا سی غلطی سے یہ سارا ہنگامہ کھڑا ہو گیا اور ہمیں پتا ہی نہیں چلا کہ آپ کا لکھا وہ رقعہ کب اور کیسے گھبراہٹ میں وہیں گر گیا۔‘‘ ناہید کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ کچھ لوگ جب بولتے بولتے خاموش ہو جائیں تو ان کی خاموشی بولنے لگتی ہے۔ مگر مجھے آج اس کی یہ خاموشی بہت گراں گزر رہی تھی۔ ’’دراصل میں بہت ڈر گئی تھی، اسی لیے جب ابا نے آپ کی تحریر دیکھ کر آپ پر شک کیا، تو میں چپ رہی۔ کیوں کہ میں اگر ماجد یا کسی اور کا نام لیتی تو انہیں مجھ پر بھی شک ہو سکتا تھا کہ میں بھی اس کے ساتھ شامل ہوں، صرف ایک آپ ہی ایسے تھے، جن کے نام کے ساتھ میرا نام نہیں جوڑا جا سکتا تھا۔ مطلب کسی کو بھی مجھ پر شک نہیں ہو سکتا تھا کہ میں بھی آپ کو پسند کر سکتی ہوں۔‘‘ میں نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ میرے اندر بہ یک وقت کئی شیشے چکنا چُور ہو گئے اور میں ننگے پاؤں ان کرچیوں پر چلتا ہوا وہاں سے اٹھ آیا۔

پتا نہیں، میں نے اُس روز گھر تک کا راستہ کیسے طے کیا۔ میرے آس پاس تیز ٹریفک کا شور، گاڑیوں کے ہارن اور لوگوں کی آوازوں کی بھرمار تھی، مگر میں جیسے ساری دنیا سے لاتعلق اور بیگانہ سا ان راستوں پر چلتا رہا، شاید ہمارے قدم کچھ راستوں پر چل چل کر اتنے راستہ آشنا ہو چکے ہوتے ہیں کہ دل اور دماغ بند ہونے کی صورت میں بھی وہ ہر موڑ پہچان لیتے ہیں، ورنہ اس وقت میری جو حالت تھی مجھے ضرور کسی ویرانے میں بھٹک جانا چاہیے تھا، ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی وہ...... کوئی اندھا ہی ہوگا جو ناہید پر مجھ سے کوئی بھی تعلق جوڑنے کا شک کرے گا۔ کہاں وہ اور کہاں میں؟ اس نے کتنی آسانی سے یہ بات کہہ دی۔ بعض حقائق ہم پر پہلے دن ہی سے روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتے ہیں، مگر پھر بھی کسی کی زبان سے ان کی تشریح ہمیں کس قدر سوگوار کر دیتی ہے، ہم کم زور انسان اپنے اندر اتنی خود فریبیاں کیوں پالے رکھتے ہیں؟ شاید اسی لیے انسان اپنی پیدائش سے لے موت تک جانے کتنی بار ٹوٹتا ہے، مگر ناہید کی پسند ماجد بھی کیسے ہو سکتا ہے۔ محلّہ ماجد کے قصّوں سے واقف تھا، مگر پھر بھی ناہید......؟ میرا ذہن سُن ہو گیا تھا۔ مطلب یہ ہوا انسان کی ظاہری شخصیت ہی آخر کار فتح یاب ہوتی ہے۔ یہ اندر کی خوب صورتی، دل کی سچائی وغیرہ جیسی فضول کتابی باتیں ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر یکسر غلط ثابت ہو گئی تھیں۔ شاید یہ ساری کتابی تکرار مجھ جیسے پری زادوں کی تسلی کے لیے ہی تھی۔

میرا داخلہ ایک سرکاری کالج میں ہو چکا تھا، مگر دل کالج جانے پر آمادہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ دسویں جماعت تک ایک ہی اسکول میں پڑھتے پڑھتے سارے استاد اور طالب علم میرے نام اور صورت کے تضاد کے عادی ہو چکے تھے اور انہوں نے میری بدصورتی کو کسی حد تک قبول کر لیا تھا، مگر کالج جاتے ہی یہ ساری بحث ایک بار پھر سے تازہ ہو گئی۔ بہت دنوں تک کلاس میں، کینٹین میں اور کالج کی راہ داریوں میں مجھے پھر سے اسی تجربے سے گزرنا پڑا، وہی طنز بھری مسکراہٹ، جملے اور حقارت بھری مثالیں۔ میرا جواب ہمیشہ کی طرح خاموشی ہی تھا، کیوں کہ میں جانتا تھا کہ مجھے اس چھلنی سے بار بار چھننا ہوگا۔ ان ہی دنوں میری ملاقات فورتھ ایئر کے ناساز سے ہوئی۔ دراصل اس سے پہلا تعارف بھی اس کے اس عجیب و غریب تخلص کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس کا پورا نام جمیل احمد تھا، مگر وہ خود کو ناساز کہلوانا پسند کرتا تھا۔ ایک دن میں راہ داری سے گزر رہا تھا کہ کسی سینئر طالب علم نے زور سے اس کا نام پکارا۔ ’’ابے او

ناساز...... تیری پھر سے تین سہیلیاں آئی ہیں۔ مطلب تو اگلے سال بھی اسی کالج کے لنگر کی روٹیاں توڑے گا۔" ناساز کے باقی دوست بھی ہنس پڑے۔ ناساز نے ہاتھ میں پکڑے سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور ایک بھرپور کش لے کر دھواں فضا میں اڑا دیا۔ "وہ طفل کیا گریں گے جو گھٹنوں کے بل چلے......" پتا چلا کہ گزشتہ تین چار سال سے ناساز چوتھے سال ہی میں اٹکا ہوا ہے۔ نہ اسے پاس ہونے کی جلدی تھی، نہ ہی کالج والے اسے نکالنے پر آمادہ، کیوں کہ وہ کالج کی ادبی سوسائٹی کا صدر تھا اور اس کی صدارت میں کالج بہت سی ٹرافیاں اور کپ جیت چکا تھا۔ وہ ایک بہترین مقرر، شاعر اور افسانہ نگار تھا۔ اگلی صبح میں کالج کے گیٹ سے اندر داخل ہوا تو ناساز گیٹ کے قریب ہی بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ "بات سنو لڑکے......" میں جھجکتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ "سگریٹ پیتے ہو؟" میں نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ بے زاری سے بولا۔ "پھر کیا خاک جیتے ہو......" میری جیب میں اس وقت شام کی ٹیوشن سے ملنے والے چند روپے پڑے تھے۔ میں سیدھا وہاں سے کینٹین گیا اور سب سے بہتر برانڈ کی ایک ڈبیا اور ماچس لے کر دوبارہ ناساز کے پاس آیا اور سگریٹ اور ماچس اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ وہ سگریٹ دیکھ کر چونک سا گیا۔ اس نے جلدی سے سگریٹ سلگا کر دو چار بھرپور کش لگائے اور میں نے پہلی مرتبہ نکوٹین کو اپنے سامنے بیٹھے شخص کی رگوں میں پوری طرح سرایت ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ اس نے مزید چند کش لیے تو میں پلٹ کر جانے لگا۔ ناساز نے جلدی سے مجھے آواز دے کر روکا اور غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "پیسے تھے تمہارے پاس......؟" "ہاں! کرائے کے پیسے تھے، جو آج تمہارے کام آ گئے۔" وہ زور سے ہنسا اور ہاتھ بڑھا کر بولا۔ "مجھے ناساز کہتے ہیں۔ میں اپنا تخلص ناشاد رکھنا چاہتا تھا، مگر پتا چلا کہ میرے حق پر پہلے ہی کوئی موسیقار ڈاکا ڈال گیا ہے۔ تمہارا نام کیا ہے......؟" میں نے اٹکتے ہوئے اپنا نام بتایا۔ "پری زاد" ...... ناساز نے زور سے "واہ" کہا۔ "نام تو بڑا شاعرانہ رکھا ہے پیارے......" زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے کسی کے لہجے اور نظر میں اپنا نام سن کر طنز اور تمسخر کی جھلک نہیں دکھائی دی۔ یہ میری اور ناساز کی دوستی کی ابتدا تھی۔ میری زندگی کا پہلا دوست، جس سے بات کرتے ہوئے میری زبان لڑکھڑائی نہیں تھی، نہ ہی مجھے ٹھنڈے پسینے آئے تھے۔ سگریٹ اس کی زندگی کا ایک ایسا لازمی جزو تھا کہ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہونے لگتا جیسے ناساز سگریٹ کو نہیں، سگریٹ دھیرے دھیرے ناساز کو پی رہی ہو، نگل رہی ہو۔ وہ مجھ سے عمر میں پانچ چھ سال ہی بڑا تھا، مگر اپنی باتوں سے کوئی بوڑھی روح دکھائی دیتا تھا۔

چند ہفتوں بعد شہر کے تمام مردانہ اور زنانہ کالجوں کے درمیان تقریری مقابلے ہوئے تو ناساز کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔ میں ایسی تقریبات میں جانے سے حتی الامکان گریز کرتا تھا، مگر وہ فائنل مقابلے کی تقریب میں مجھے کسی طرح زبردستی پکڑ کر لے گیا۔ ہال میں ایک جانب ہمارے کالج کے لڑکوں کی نشستیں تھیں اور دوسری جانب لڑکیوں کے کالج کی طالبات بیٹھی اپنی کالج کی مقررات کی حوصلہ افزائی کے لیے شور مچا رہی تھیں۔ میں ایک کونے میں سکڑ کر بیٹھا رہا، ناساز نے اپنی دھواں دار تقریروں سے ماحول گرما دیا، مگر نہ جانے آخری مرحلے پر وہ پسپا کیوں ہو گیا اور لڑکی نے پہلا انعام جیت لیا۔ میں نے باہر نکلتے ہی اس سے براہ راست اپنے اس خدشے کا اظہار کر دیا کہ وہ جان بوجھ کر ہارا ہے۔ ناساز دھیرے سے مسکرایا۔ "تم اگر دھیان سے دیکھتے تو تمہیں پتا چلتا کہ میں جیت گیا ہوں۔ زندگی میں ہر بازی اول اور دوم نمبر سے نہیں ناپی جاتی۔" پھر اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ "تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے پری زاد......؟" پل بھر کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا کہ ناساز بھی باقی سب لوگوں کی طرح میرا مذاق اڑا رہا ہے، مگر مجھے اس کی آنکھوں میں اس کے سوال کی سچائی دکھائی دی۔ میں نے سر جھکا کر دھیرے سے جواب دیا۔ "مجھ سے بھلا کون محبت کرے گی......؟" "کیوں...... تم سے محبت کیوں نہیں کی جا سکتی......؟" میں چپ رہا۔ ناساز سمجھ گیا اور بات بدل کر بولا۔ "شاعری پڑھتے ہو......؟" "ہاں، مگر مجھے شعر یاد نہیں رہتے۔" ناساز نے نصیحت کی۔ "شعر یاد رکھا کرو، صنفِ نازک پر بڑا اچھا اثر پڑتا ہے اچھے شعروں کا......" پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "منیر نیازی کو پڑھا کرو...... اور اس کی ایک نظم تو زبانی یاد کر لو۔" "ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں...... ضروری بات کہنی ہو...... کوئی وعدہ نبھانا ہو، اسے آواز دینی ہو...... اسے واپس بلانا ہو...... ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں...... کسی کو موت سے پہلے...... کسی غم سے بچانا ہو...... حقیقت اور تھی کچھ، اس کو جا کر بتانا ہو...... ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں......" میں نے جلدی جلدی ساری نظم اپنی کاپی میں نوٹ کر لی اور اسی وقت اس کا رٹا بھی لگا لیا۔ "بس...... اب یاد رکھنا کہ تمہیں اپنی گفتگو کے دوران کسی نہ کسی بہانے یہ نظم دہرانی ہے۔ میں تمہیں چند اور اثر انگیز غزلیں اور نظمیں بھی یاد کروا دوں گا۔ کیا سمجھے......؟" میں نے جلدی سے کسی بچے کی طرح سر ہلایا۔ مجھے یاد آیا کہ ناہید کو بھی شعر و شاعری سے کافی گہرا لگاؤ تھا اور شاید ماجد کو بھی بہت سے شعر یاد تھے۔ ناہید کا خیال آتے ہی میرے گال پر شدید جلن کا ایک احساس ہوا۔

اگلے چند دنوں میں ناساز نے مجھے بہت سی نظمیں یاد کروا دیں اور پھر جس دن میں نے بزمِ ادب کے پیریڈ میں کھڑے ہو کر "محبت اب نہیں ہوگی...... یہ کچھ دن بعد میں ہوگی...... گزر جائیں گے جب یہ دن...... یہ ان کی یاد میں ہوگی" سنائی تو پہلی مرتبہ کلاس کے لڑکوں نے دل سے میرے لیے تالیاں بجائیں اور استاد نے بھی مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ شاباش دی۔ ناساز کی کہی بات سچ ثابت ہو رہی تھی۔ لوگ میری بات غور سے سننے لگے تھے۔ میرے دل میں ایک عجیب سی خواہش انگڑائیاں لینے لگی کہ کبھی کالج میں پہلے کی طرح لڑکے اور لڑکیوں کے اداروں کا مقابلہ ہو اور میں بھی اسٹیج پر جا کر ناساز کی طرح کچھ پڑھوں، میں نے سارے بڑے شعراء کو تقریباً حفظ کر لیا...... اور مجھے کالج کی بزم ادب کی ٹیم میں بھی شامل کر لیا گیا تھا۔ اس کوشش میں میرے اندر بھی چھوٹا سا ہی سہی، مگر ایک چھوٹا موٹا شاعر پلنے لگا تھا۔ میری باتوں میں شاعری کا رنگ جھلکنے لگا۔ ناساز کسی منجھے ہوئے استاد کی طرح میری "شاعرانہ تربیت" کر رہا تھا، وہ کہیں سے بھی اچانک نازل ہو جاتا۔ "یہ کیا غالب اور میر کے رٹے لگاتے رہتے ہو۔ آج کل کی لڑکیاں اتنی مشکل شاعری بھلا کب سمجھتی ہیں۔ احمد فراز کو پڑھا کرو، اور ہاں...... کبھی کبھی ساحر لدھیانوی کو دہرانے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ ساحر کو تو جانتے ہو ناں...... "میں پل دو پل کا شاعر ہوں...... پل دو پل میری کہانی ہے" والا...... اور ہاں...... کل سے تمہیں یہ دہراتے رہنا ہے۔" "میں اور میری تنہائی...... اکثر یہ باتیں کرتے ہیں...... تم ہوتیں تو کیسا ہوتا...... تم اس پر کتنا حیراں ہوتیں......" میں دبے لفظوں میں ناساز کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتا کہ جس کسی ایک کے لیے وہ مجھ سے یہ ساری مشق کرا رہا ہے، اس "ایک" کا تو میری زندگی میں کوئی وجود ہی نہیں۔ پھر یہ تیاری کس کام کی؟ مگر ناساز بھلا میری کب سنتا تھا۔ ایک دن کالج سے واپسی کے راستے پر وہ میری اسی تربیت میں مصروف تھا کہ میری نظر پرانے کباڑیے کی دکان کے مٹیالے شیشے سے اندر پڑی اور میرے قدم وہیں جم کر رہ گئے۔ اندر ایک پرانا پیانو پڑا تھا۔ کباڑیے نے میری دل چسپی محسوس کی تو جلدی سے بولا۔ "خالص شیشم کی لکڑی کا ہے۔ انگریز کے پرانے کلب سے خریدا ہے۔ خریدو گے۔ صرف تیرہ ہزار میں دے دوں گا۔" میں نے اپنی جیب دیکھی، دو سو اسی روپے پڑے تھے، میں نے دھیرے سے کباڑیے سے کہا۔ "ایک دن ضرور خریدوں گا......" ہم دونوں آگے بڑھ گئے۔ میں تھکے ہارے قدموں سے گھر واپس پہنچا تو صحن میں داخل ہوتے ہی ایک جھٹکے سے رک گیا۔ صحن میں ناہید کی امی کھڑی میری اماں سے کچھ بات کر رہی تھیں۔ ان دونوں نے قدموں کی آواز سن کر میری طرف دیکھا۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:
sundaymagazine@janggroup.com.pk

ناہید کی امی نے مجھے دیکھ کر بُرا سا منہ بنایا اور اماں کو تاکید کرتی ہوئی گھر سے نکل گئیں۔ ”اے بہن آنا ضرور...... ہم لوگ زیادہ عرصے تک ناراضیاں پالنے کے شوقین نہیں۔“ ان کے جانے کے بعد بُرا منہ بنانے کی باری اماں کی تھی۔ ناہید اور ماجد کی بات طے ہوگئی، انہی کی منگنی کا پیغام دینے آئی تھی یا شاید یہ جتانے کے لیے کہ تیری اس حرکت کے بعد بھی ان کی لاڈلی کے لیے محلّے کے سب سے بڑے گھر سے رشتہ آیا ہے۔ ”تُو نے تو ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا پری زاد......“ میں اماں کی بڑبڑاہٹ نظرانداز کرتا اوپر کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ ایک دن یہ ہونا ہے، مگر پھر بھی نہ جانے کیوں ناہید کے رشتے کی خبر سن کر دل بجھ سا گیا تھا۔ اگلے روز کالج میں ناساز نے میری یہ کیفیت بھانپ لی۔ ”کیا بات ہے پیارے! آج کچھ بُجھے بُجھے سے دکھائی دے رہے ہو؟“ میں نے قریب پڑا کنکر اٹھا کر دُور تالاب کی طرف پھینکا۔ ”تو اس سے پہلے تم نے مجھے کب جلتے یا جگمگاتے دیکھا ہے؟“ وہ میرے قریب آکر بیٹھ گیا۔ ”جل تو رہے ہو اور بڑی شدت سے جل رہے ہو، مگر یہ جلن اندر ہی اندر راکھ کردینے والی ہے۔ بتاؤ گے نہیں، کب سے سلگ رہے ہو؟“ میں نے اسے ناہید والی ساری بات بتادی۔ ناساز نے سُن کر ایک سرد سی آہ بھری، پھر کسی بزرگ کی طرح بیٹھ کر مجھ سے عہد لینے لگا۔ ”تم مجھ سے ایک وعدہ کرو، آج کے بعد اپنے اندر لگی اس آگ کو کبھی بجھنے نہیں دو گے کہ یہ جیون اس مَن کی مار کے بغیر صرف ایک سرد خانہ، ایک بوجھ ہوتا ہے۔ اس لیے بندے کے اندر یہ سلگن لگی رہنی چاہیے۔ انسان سے بھی بڑے بڑے کارنامے کروا جاتی ہے یہ تڑپ، یہ جلن...... عام طور پر، آدمی گیلی تیلی کی طرح ساری عُمر سیلن سے بھری نم زندگی گزار دیتا ہے، مگر جلنے کے لیے ماچس کی رگڑ میسّر نہیں آتی۔ اس لڑکی سے ناکام محبت نے تمہیں وہی رگڑ دے دی ہے، اب جَل گئے ہو، تو خود کو بُجھنے مت دینا۔“ اُس وقت مجھے ناساز کی بات ٹھیک طرح سمجھ نہیں آئی، مگر اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ جب مقدر میں آخرکار فنا ہونا ہی لکھا ہے، تو پھر یہ بُجھ بُجھ اور سلگ سلگ کر جینا کیسا؟ تیز بھڑکتے شعلے کی طرح جل کر راکھ ہوجانے ہی میں مزہ ہے۔ میں بھی اُس روز کے بعد کچھ ایسا جلا کہ اندر سب کچھ بھسم ہوگیا۔ بس میں، میری کتابیں، میری چھت اور آسمان پر رات کو چمکتے میرے دوست ستارے، یہی کچھ باقی رہ گیا تھا زندگی میں۔

اگلے سال کالج والوں نے رحم کھا کر ناساز کو سند دے ہی دی، تو وہ اپنے گاؤں واپس جانے سے پہلے مجھ سے لپٹ کر رو پڑا۔ ”اپنا خیال رکھنا اور مجھے بھول مت جانا۔“ میں بھیگی پلکوں کے ساتھ اسٹیشن پر اس کی گاڑی کو چھوٹتے دیکھتا رہا اور پھر، بوجھل قدموں کے ساتھ گھر واپس آگیا۔ کالج کے فائنل ایئر سے قبل ہی، پہلے ابا اور پھر اماں یکے بعد دیگرے چل بسے، پر مجھے پہلی بار یتیمی کا احساس اُس وقت ہوا، جب بھائی بھابھیوں نے گھر کے خرچے میں ہاتھ بٹانے کا حکم صادر کردیا۔ ان سب کی خواہش تھی کہ میں یونی ورسٹی میں داخلے کا ارادہ ترک کر کے کہیں کلرک یا چپڑاسی کی نوکری پکڑلوں تاکہ میرا بوجھ ان کے کاندھوں سے ہٹ جائے۔ مگر میں نے کسی نہ کسی طرح انہیں قائل کر ہی لیا کہ کسی سرکاری نوکری کے ملتے ہی میں تعلیم کا سلسلہ ترک کردوں گا۔ تب تک شام سے رات تک تین چار ٹیوشنز پڑھا کر گھر کا خرچہ بانٹ سکتا ہوں۔ مَیں اب وہ پہلے والا ناکام اور نالائق طالب علم نہیں تھا۔ ناساز کی لگائی آگ کی بھٹی میں تپ کر کندن ہوچکا تھا۔ کالج میں بھی فائنل میں، میری تیسری پوزیشن آئی تھی۔ تعلیمی ادارے مجھے فخر سے اپنے ادبی پروگراموں اور مشاعروں میں مدعو کرتے تھے۔ میرا نام ایک اُبھرتے ہوئے نوجوان شاعر کے طور پر شہر کے گلی کوچوں میں پھیل رہا تھا، لوگ میری سوچ اور لفظوں کی مدح سرائی کرتے تھے، ہاں اگر کچھ نہیں بدلا تھا تو میری صورت دیکھتے ہی لوگوں کا وہ بے اختیار تاثر، البتہ اب لوگوں کے رویّے میں اتنی منافقت ضرور آگئی تھی کہ بچپن میں وہ میرے منہ ہی پر ہنس دیتے تھے، مگر اب قہقہہ میرے پلٹ جانے کے بعد چُھوٹتا۔ اپنے ڈیپارٹمنٹ کی تعارفی کلاس میں بھی، جب مجھے لیکچر ہال کے ڈائس پر بلایا گیا، تو آس پاس سے ہلکی ہلکی سرگوشیاں بلند ہونے لگیں۔ ”ارے! تو یہ ہے پَری زاد......“ ”آئے ہائے...... سارا مزہ کرکرا کردیا“ ”شاعری تو غضب کی کرتا ہے، مگر شخصیت...... توبہ توبہ......“ ”نہیں نہیں، یہ پَری زاد نہیں ہوسکتا، یہ تو کسی فیکٹری کا فورمین لگتا ہے۔“ میں یہ ساری سرگوشیاں اور فقرے سُنتے ہوئے ان کے درمیان سے چلتا ڈائس پر آگیا۔ کلاس پر ایک سکوت طاری تھا۔ میں نے اپنا نام بتانے کے بعد کسی لمبی چوڑی تمہید کے بجائے صرف تین مصرعوں پر اکتفا کیا۔ ”قصّے میری الفت کے جو مرقوم ہیں سارے...... آ دیکھ تیرے نام سے موسوم ہیں سارے...... شاید یہ ظرف ہے، جو خاموش ہوں اب تک...... ورنہ تو تیرے عیب بھی معلوم ہیں سارے...... سب جُرم میری ذات سے منسوب ہیں محسن...... کیا میرے سوا اس شہر میں معصوم ہیں

سارے......؟ اور بس، میں اپنی بات ختم کر کے ڈائس سے اتر آیا، گزرتے دنوں کے ساتھ میری کلاس نے بھی میری بدصورتی سے سمجھوتا کرلیا، مگر، میں خود اپنے اس بے چین اور بے قرار دل کا کیا کرتا؟ کبھی کبھی تو مَن کرتا کہ کوئی تیز دھار خنجر لے کر اپنا سینہ چیر ڈالوں اور خود اپنے ہاتھوں سے یہ روگی دل نکال کر اس کے اتنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کروں کہ پھر کبھی کوئی ٹکڑا سینے میں جڑنے نہ پائے، مگر پھر میرا اسد کا نادان دل مجھ سے سوال کرتا کہ آخر اس کی خطا ہی کیا تھی۔ صرف اتنی کہ کوئی اسے بھی کبھی اک پیار بھری نظر سے دیکھ لے، صرف ایک نظر...... جو صرف میرے لیے ہو۔ میرا اس ایک نظر کے لیے ہر احساس، بالکل پاک تھا۔ مجھے تو بس ایک لمحہ ہی ساری زندگی کے بدلے درکار تھا۔ ایک پل، جب کوئی مجھے اپنا مان لے۔ کیا یہ خواہش، یہ تمنا اتنی ہی مشکل اور ناجائز تھی کہ میں اس کے اپنے اندر جاگ اٹھنے ہی پر ساری زندگی خود کو ملامت کرتا ہوں۔ آخر یہ دنیا ایسی ہر نظر، خوب روؤں کے لیے کیوں بچا رکھتی ہے، کیا مجھ جیسوں کے لیے کسی کے کشکول میں ایسی ایک نظر کی بھیک بھی نہیں۔

اُس روز بھی میں یونی ورسٹی کی ایک سنسان راہ داری سے گزرتے ہوئے کچھ ایسے ہی بے سروپا خیالات کی یلغار کا شکار تھا کہ اچانک اپنے عقب میں کسی لڑکے کی آواز سنائی دی۔ ''مسٹر پَری زاد......'' میں نے رُک کر دیکھا، انگریزی ڈیپارٹمنٹ کا ایک ہینڈسم سا لڑکا حسام اپنے دو، تین کلاس فیلوز کے ساتھ میری جانب بڑھ رہا تھا، جن میں شعلۂ جوالا قسم کی ایک لڑکی بھی تھی۔ ''آپ اردو ڈیپارٹمنٹ کے پَری زاد ہیں ناں، میرا نام حسام ہے، یہ باسط اور یہ ہماری دوست لبنٰی۔ ہم تینوں انگلش ڈیپارٹمنٹ سے ہیں۔'' ''جی فرمایئے......'' میں نے کہا تو حسام کے بجائے لبنٰی بولی۔ ''دراصل ہمیں آپ کی مدد چاہیے۔ ہم شیکسپیئر کا پلے، پرفارم کرنا چاہتے ہیں، مگر ہمیں اجازت اسی صورت ملی ہے کہ ڈرامے کا ایک شو اردو ترجمے کے ساتھ بھی پیش کیا جائے۔ کیا آپ ہمارے لیے ڈرامے کا ترجمہ کردیں گے......؟'' میں نے ان تینوں کے متجسّس چہروں پر نظر ڈالی۔ ''کوشش کروں گا کہ کر پاؤں۔ ویسے کس ڈرامے کا ترجمہ کرنا ہے۔'' وہ تینوں خوش ہوگئے اور باسط جلدی سے بولا۔ ''اوتھیلو (OTHELO)''۔ ''ٹھیک ہے، آپ لوگ تین چار دن کی مہلت دیں۔ میں ترجمہ کر کے آپ لوگوں کو بتادوں گا۔'' ان تینوں نے خوش ہوکر نعرہ لگایا۔ ''گریٹ'' اور جاتے وقت بڑے پُرجوش انداز سے ہاتھ ملایا۔ لبنٰی سے ہاتھ ملاتے ہوئے میں نے بڑی مشکل سے اپنے ہاتھ کی لرزش پر قابو پایا۔ تیسرے دن میں ترجمے کا پہلا ڈرافٹ لے کر انگلش ڈیپارٹمنٹ میں حسام گروپ کی تلاش میں نکلا تو پتا چلا کہ سارا گروپ آڈیٹوریم میں ڈرامے کی ریہرسل میں مصروف ہے، میں چپ چاپ ہال میں داخل ہوکر آخری نشستوں پر بیٹھ گیا۔ ہال میں ملگجی سی نامکمل روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ صرف سامنے ہال کے اسٹیج پر تیز لائٹس تھیں۔ سب ہی اداکاری کے بہترین جوہر دکھا رہے تھے، مگر لبنٰی کی اداکاری الگ ہی تھی۔ وہ بہت ڈوب کر مکالمے ادا کر رہی تھی اور سارا گروپ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے خوب جم کر داد بھی دے رہا تھا۔ لبنٰی ایک منجھی ہوئی اداکارہ کی طرح آخری سین میں ہیروئن کی موت کا منظر پیش کر رہی تھی۔ میں خود اس کی اداکاری میں اس قدر کھو چکا تھا کہ جب اس نے آخری سانس لے کر سر ڈھلکایا تو بے اختیار ہی اپنی جگہ پر کھڑے ہوکر تالیاں بجانے پر مجبور ہوگیا۔ سب نے چونک کر مجھے دیکھا اور زور سے چلّائے۔ ''ارے...... تم ہو پَری زاد...... آؤ، اسٹیج پر آجاؤ......'' حسام نے باقی لوگوں سے میرا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ میں اس ڈرامے کا اردو ترجمہ کرنے والا ہوں۔ میں نے لبنٰی کو اس کی اداکاری کی داد دی تو وہ سَر جھٹک کر بولی۔ ''نہیں، ابھی میں پوری طرح سے خود کو کردار میں ڈھال نہیں پارہی۔ میرا خیال ہے کہ جب ہیروئن کی موت ہو تو اُس وقت کچھ اشعار یا کوئی غم گین نظم ضرور او ور لیپ ہونی چاہیے...... تب ہم یقیناً پورے ہال کو رونے پر مجبور کردیں گے۔'' انگریزی ڈیپارٹمنٹ کے باقی کچھ طلب، جو اس ڈرامے میں حصّہ لے رہے تھے، مجھے اس طرح دیکھ رہے تھے، جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں۔ وہ سب کے سب اونچے گھرانوں کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے قیمتی لباس، کلون اور پرفیوم کی مہک، ہاتھوں میں پہنی قیمتی گھڑیاں، بریسلٹس اور ایک جانب بے پروائی سے پھینکے گئے مہنگے بیگز اور جینز جیکٹس، میری سادہ سفید شرٹ اور پانچ سال پرانی گھسی ہوئی پتلون سے بالکل بھی میل نہیں کھا رہے تھے۔ دراصل امارت کی بھی اپنی ایک خاص چکا چوند ہوتی ہے، جسے کسی تشریح کی ضرورت نہیں پڑتی اور غربت...... سات پردوں میں بھی چُھپی ہو تو، شناخت چُھپائے نہیں چھپتی۔ لبنٰی کی کچھ انگریزی میڈیم سہیلیوں نے اسے کُہنی مار کر کچھ کہا اور سب زور سے ہنس پڑیں۔ لبنٰی نے مجھ سے نظر بچا کر ان سب کو انگریزی میں ڈانٹا اور اپنے رویے پر قابو پانے کی ہدایت کی۔ میں نے لبنٰی کو بتایا کہ میں نے اوتھیلو کا ترجمہ کرلیا ہے اور اگر وہ لوگ چاہیں تو کل ہی سے اردو ڈرامے کی بھی ریہرسل شروع کرسکتے ہیں۔ حسام نے مجھے بھی ریہرسل دیکھنے کے لیے آنے کی درخواست کی تاکہ میں ان کے تلفظ کی جانچ بھی کرسکوں۔ ہاں، زندگی کی دوڑ میں ہم اردو میڈیم والوں کے پاس آخر میں صرف یہی ایک تلفظ ہی تو باقی رہ جاتا ہے۔

رات کو جب میں کُھلی چھت پر تاروں کی اوڑھنی کے نیچے لیٹا، ڈرامے کے بارے میں سوچ رہا تھا، تو مجھے لبنٰی کی بات یاد آگئی کہ اگر لڑکی کی موت کے پس منظر میں کوئی درد انگیز سی نظم ہو تو تاثر دوبالا ہوجائے گا۔ ''اوتھیلو'' کے اختتام پر ہیرو کسی رقیب کی لگائی ہوئی شک کی آگ میں جھلس کر خود اپنے ہاتھوں سے ہیروئن کو گلا دبا کر مار دیتا ہے اور پل بھر کی نفرت کا غلبہ ساری عمر کی محبت کو نگل جاتا ہے۔ مجھے یہ بات کبھی سمجھ نہیں آتی تھی کہ انسان کی برسوں کی محبت کا امرت گھڑی بھر میں نفرت کے کڑوے زہر میں کیسے تبدیل ہوجاتا ہے؟ یا پھر شاید محبت اور نفرت دراصل ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں۔ جذبات کے بازار میں دونوں کا مول یک ساں رہتا ہے، مگر جب کسی انسان کو دوسرے سے نفرت ہوجاتی ہے، تو وہ اس سے وابستہ چیزوں، جگہوں، یادوں اور ایک دوسرے سے جُڑے معمولات سے بھی کیوں نفرت کرنے لگتا ہے۔ جس راستے پر کبھی دو پیار والے ایک ساتھ چلے تھے، وہ راستہ کیوں علاقہ ممنوعہ ہوجاتا ہے۔ وہ ایک بینچ، جہاں کبھی وہ ساتھ بیٹھے تھے، بارش میں گیلی سڑک کے کنارے کھڑا وہ چائے والا، جس کے ایک کپ میں دونوں نے ساتھ چائے پی تھی۔ وہ کتابوں کی پرانی دکان، پہلی ٹوٹی ہوئی چوڑی کا ٹکڑا، صفحوں میں رکھا وہ سوکھا گلاب، پرفیوم کی خالی شیشی، بچی ہوئی وہ آدھی لپ اسٹک، ایک کھویا ہوا کف لنک، ایک ساتھ دیکھی ہوئی فلم کا ٹکٹ، وہ فٹ پاتھ پر بچھے پتے، وہ پرانا بس اسٹاپ، 23 نمبر کی کھٹارا سی بس، درخت کے نیچے کھڑا وہ لیموں پانی والا...... بھلا ان سب چیزوں کا ان کی بدلتی محبت اور نفرت میں ڈھلتی اس کڑواہٹ سے کیا تعلق......؟؟ ہم اس ایک شخص کی نفرت میں ان سب یادوں، باتوں اور جگہوں کو کیوں شامل کرلیتے ہیں۔ انسان کتنا ظالم ہے کہ معصوم یادوں سے بھی انتقام لینے سے باز نہیں آتا۔

ڈرامے والے دن ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔ ساری یونی ورسٹی اوتھیلو کو اردو میں جملے بولتے دیکھنے کے لیے جمع تھی اور...... ہیروئن کی آخری سانس نکلنے سے پہلے پس منظر میں میری نظم کے بول گونج اٹھتے ہیں۔ سنو تمہاری وفا پر...... گرچہ پورا یقیں ہے، مگر...... بدلتی رُتوں کے وار کا، کچھ بھروسا نہیں...... سو، گر کبھی ایسا ہو کہ...... تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے...... اور میری روح کی کومل پنکھڑیاں...... تمہیں کسی ببول کے مانند چُبھنے لگیں، تو...... بیتے دنوں کو یاد نہ کرنا...... کہ یادوں کا زہر، زخم کو بھرنے نہیں دیتا...... ہاں مگر دیکھو، کبھی ان باتوں سے نفرت نہ کرنا...... جو ہم نے گھنٹوں ایک ساتھ بیٹھ کر کی تھیں...... کہ باتیں تو معصوم رابطہ ہوتی ہیں...... اور کسی کم نصیب کی بے ربطی سے...... ان باتوں کا کیا لینا دینا......؟ ڈرامے کے منظر میں اوتھیلو ہیروئن کے پاس پہنچتا ہے۔ رات ڈھل رہی ہے اور ہیروئن (ڈیسڈی مونا) سو رہی ہے۔ اوتھیلو اپنی محبوبہ کو جگاتا ہے اور سرد لہجے میں اس سے کہتا ہے کہ وہ اپنی آخری دعا کر لے۔ اوتھیلو کی محبوبہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں، وہ اپنے محبوب سے التجا کرتی ہے کہ وہ اسے آج کی رات جینے دے، پھر چاہے تو صبح مار ڈالے، مگر اوتھیلو کی آنکھوں پر شک کے کالے ناگ کس کر پٹی باندھ چکے ہیں، وہ کہتا ہے ''اب بہت دیر ہو چکی......''

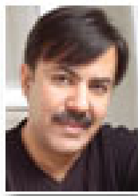
پس منظر میں نظم کے بول اوور لیپ ہو رہے تھے۔ اور سُنو، میرے محبوب...... کبھی ان رنگوں سے نفرت نہ کرنا...... جو مجھے بہت اچھے لگتے تھے...... کہ رنگ تو روح کو اُجالتے ہیں...... اور کسی کے مقدر کے اندھیروں سے...... ان رنگوں کا کیا لینا دینا......؟ ڈیسڈی مونا آخری مرتبہ اپنے محبوب، اوتھیلو کو بھیگی پلکوں سے نظر بھر کر دیکھتی ہے۔ اوتھیلو کے بھاری ہاتھوں کی انگلیاں اس کی نازک شہ رگ کو دبانا شروع کر دیتی ہیں۔ لڑکی سانس گھٹنے کی وجہ سے تڑپتی ہے اور بستر کی چادر نیچے گر جاتی ہے۔ اے میری وفا کے مالک...... کبھی ان نظاروں سے نفرت نہ کرنا...... جو ہم نے ایک ساتھ دیکھے تھے...... کہ نظارے تو قدرت کا حُسن ہوتے ہیں...... اور کسی حرماں نصیب کی بدصورت یادوں سے...... ان نظاروں کا کیا لینا دینا......؟ اوتھیلو کی مضبوط گرفت میں اس کی محبوبہ کا دم گھٹ رہا ہے اور وہ بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ تڑپ کر جان دے رہی ہے۔ اوتھیلو کی آنکھیں وحشت سے باہر کو اُبل رہی ہیں، مگر وہ پوری قوت سے اپنی جان سے پیاری ڈیسڈی مونا کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ تکلیف کی شدت سے اس کی محبوبہ کی انگلیوں کے ناخن اوتھیلو کے بازوؤں کی رگوں میں پیوست ہوئے جا رہے ہیں۔ لڑکی کا نازک بدن آخری مرتبہ زور سے کانپتا ہے۔ میرے ہم نفس...... میری جان...... بس مجھ سے، اور صرف مجھ سے نفرت کرنا...... کہ میری روح کی سیاہی سے ہی...... یہ چارسُو اندھیرا ہے۔ اوتھیلو کی محبوبہ اپنے محبوب کی گرفت میں تڑپ کر آخری ہچکی لیتی ہے اور اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جاتی ہے، مگر مرتے مرتے بھی اس کی بے جان کُھلی آنکھیں اپنے پیارے اوتھیلو ہی کو دیکھ رہی ہیں، لڑکی کا محبوب، اس کا قاتل، اوتھیلو اپنی محبوبہ کا سر گود میں لیے بیٹھا رو رہا ہے اور اسٹیج کا پردہ گر جاتا ہے۔

ڈراما ختم ہونے کے بعد چند لمحے تو سارے ہال میں سناٹا سا چھایا رہا اور پھر تالیوں کی گونج میں وہ شور مچا کہ بس۔ لبنیٰ راتوں رات سارے شہر کی یونی ورسٹیز میں مقبول ہو چکی تھی۔ ڈرامے کی کام یابی کی خوشی میں اس نے اپنے گھر ایک پارٹی رکھی اور ہم سب کو تاکید کے ساتھ دعوت دی۔ میں نہیں جانا چاہتا تھا، مگر اس نے میری ایک نہیں سُنی اور مجبوراً مجھے اُس شام وہاں جانا ہی پڑا۔ گھر کیا تھا، اک محل تھا۔ مغربی طرز کا ایک وسیع و عریض پھولوں بھرا باغیچہ، جس کے درمیان پریوں کے گھر جیسی ایک شان دار عمارت کھڑی تھی۔ پچھلی جانب سوئمنگ پول تھا اور پارٹی کا بندوبست وہیں کیا گیا تھا۔ موسیقی کا اہتمام بھی تھا۔ لبنیٰ کہیں سے اپنی ماں کو کھینچتی ہوئی لے آئی اور ان سے میرا تعارف کروایا۔ قیمتی ساڑی میں ملبوس، ہیرے جواہرات سے لدی پھندی اس عورت نے مجھے غور سے دیکھا اور ہونٹ سکیڑ کر کہا۔ ''خوب...... تو یہ ہے پَری زاد......؟ انٹرسٹنگ۔'' میرا جی چاہا لبنیٰ کے کان میں دھیرے سے کہوں کہ ایسے جانے کتنے مناظر میں اردو فلموں میں دیکھ چکا ہوں، جہاں امیروں کی محفل میں غریب کو اس کی حیثیت یاد دلائی جاتی ہے، پھر مجھے خود اپنی سوچ پر ہنسی آ گئی۔ اتنے میں میرے عقب سے ایک بہکی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ ''اخاہ...... تو یہ ہیں مسٹر پَری زاد...... جن کی شاعری ڈرامے میں ڈَب کی گئی تھی، بھئی واہ لبنیٰ، کیا اداکاری کی تھی تم نے......'' میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک پکی عمر کا موٹا سا شخص آہستہ آہستہ ڈگمگاتے قدموں سے ہماری جانب چلا آ رہا تھا۔ لبنیٰ نے تعارف کروایا کہ ''یہ سیٹھ عابد ہیں، ان کے خاندانی دوست۔'' وہ شخص لبنیٰ سے بہت بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر یہ نشے کا کمال تھا۔ میں ایک جانب ہٹ کر کھڑا ہو گیا تاکہ لبنیٰ کو فرصت ملے تو میں اس سے اجازت لے کر وہاں سے نکل جاؤں۔ سیٹھ عابد کھانا لے کر پلٹا تو اس کی نظر پھر مجھ پر پڑ گئی اور وہ میری طرف چلا آیا۔ ''اور جناب! کیا مصروفیات ہیں آج کل، دراصل میں خود بھی چھوٹا موٹا شاعر ہوں، اور چاہتا ہوں کہ جلد ہی میری کتاب بھی میرے مداحوں کی پیاس بجھانے کے لیے شائع ہو جائے، مگر کیا کروں۔ یہ کاروبار اور دھندا ہی جان نہیں چھوڑتا۔'' سیٹھ عابد نے وہیں کھڑے کھڑے اپنی دو چار غزلیں بھی مجھے سنائیں، جنھیں سن کر میں نے شُکر کیا کہ اس کی کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ سیٹھ عابد اپنی دھن میں مگن بولے جا رہا تھا۔ ''لبنیٰ! تمہاری شاعری کی بڑی تعریف کرتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میری شاعری کی نوک پلک سنوار کر اسے بھی ایسا بنا دو کہ وہ لبنیٰ کے معیار پر پوری اتر جائے۔'' میں نے حیرت سے سیٹھ عابد کی طرف دیکھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ چاہتا تھا کہ میں اپنی شاعری اس کے نام کر دوں۔ سیٹھ عابد نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ''اور اس کام کے لیے میں ایک خطیر رقم دینے کو بھی تیار ہوں۔ لبنیٰ بتا رہی تھی کہ تم ٹیوشنز پڑھا کر اپنی پڑھائی کا خرچہ پورا کرتے ہو۔'' میں اپنے غصے پر قابو نہیں رکھ سکا۔ ''معاف کیجیے گا عابد صاحب، زندگی میں ہر چیز بکاؤ نہیں ہوتی۔'' عابد طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ''غلط...... آج کل سب بکاؤ ہے اور جس محفل میں آج تم کھڑے ہو، ان اُمراء کے لیے تو یہ شاعری، یہ خوب صورت الفاظ محض ایک شام بہلانے کے کام آتے ہیں۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچ لینا۔ میں نے بڑے بڑے قلم کاروں کے مسودے ردّی کے بھاؤ بکتے دیکھے ہیں۔'' میں لبنیٰ سے اجازت لے کر واپس چلا آیا۔ جب انسان کے پاس دولت کی بہتات ہو تو اس کے اندر کا کباڑیا کیوں جاگ جاتا ہے؟ کیا یہ سبھی امیر ایک جیسے ہوتے ہیں؟ مگر لبنیٰ تو ان جیسی نہیں۔ میں نے ہمیشہ اس کی آنکھوں میں اپنے لفظوں کے لیے ایک خاص احترام دیکھا تھا۔ میرا بھولا دل ایک بار پھر راہ بھٹکنے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔

اگلے دن لبنیٰ نے مجھے یونی ورسٹی میں چپ اور اُداس دیکھا تو اُسے لگا کہ میں گزشتہ شام کے اُس کی ماں کے سلوک سے دل برداشتہ ہوں۔ اس نے مجھ سے معذرت کی، مگر میں نے اسے تسلی دے دی کہ میں اس سلوک کا عادی ہوں، میری بات سُن کر اُس کی سیاہ جھیل سی آنکھوں میں اُداسی اتر آئی۔ مجبوراً اس کا دل بہلانے کے لیے مجھے اردو فلموں والی مثال دہرانی پڑی کہ اس کی پارٹی میں آنے سے پہلے میں نے درجن بھر ایسی فلمیں دیکھ کر خود کو پہلے ہی ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا، البتہ بس ایک کمی رہ گئی کہ وہاں کوئی بڑا سا پیانو نہیں تھا، جس پر بیٹھ کر ایسی سچویشن میں غریب لڑکا ہیروئن کے لیے گانا گاتا ہے۔ میری بات سن کر وہ زور سے ہنس پڑی۔ اور یوں لگا جیسے تیز بارش میں دھوپ نکل آئی ہو۔

اور پھر چند دن بعد لبنیٰ نے اچانک یونی ورسٹی آنا بند کر دیا۔ میں نے اس کے سب دوستوں سے پوچھا، مگر کسی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ آخر پانچویں دن میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے بنگلے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ چوکیدار نے لبنیٰ کے نام پر مجھے گھر کے لان تک پہنچا دیا۔ لان میں لگے سنگِ مرمر کے بڑے فوارے کے پاس لبنیٰ کی ماں کو بیٹھے دیکھ کر میرے قدم اٹکنے لگے۔ دوسرا جھٹکا مجھے لبنیٰ کی ماں کی انگلیوں میں پکڑے سگریٹ کو دیکھ کر لگا۔ اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر بولی۔ ''لبنیٰ سے ملنے آئے ہو؟'' میں نے ٹھٹکا کر جواب دیا۔ ''جی۔'' لبنیٰ کی ماں نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ''محبت کرتے ہو، میری بیٹی سے......؟'' مجھے لگا، جیسے کسی نے میرے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لی ہو۔ لبنیٰ کی ماں کی آنکھیں مجھے اپنے جسم کے پار ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔

(جاری ہے)



......ہاشم ندیم

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ’’خدا اور محبت‘‘ اور ’’بچپن کا دسمبر‘‘ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ’’عبداللہ‘‘ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز فلم کے شعبے میں ’’عبداللہ‘‘ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

’’پری زاد‘‘ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ’’سنڈے میگزین‘‘ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

لبنیٰ کی ماں کی بات سُن کر چند لمحوں کو تو میں گنگ سا رہ گیا۔ وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ’’جواب دو، کیا میں غلط کہہ رہی ہوں، تمہارے چہرے پر صاف لکھا ہے کہ تم لبنیٰ سے محبت کرتے ہو۔‘‘ میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ پھر شاید ان کو خود ہی میری حالت پر ترس آ گیا۔ ’’اندر چلے جاؤ، وہ ڈرائنگ روم میں ہوگی۔‘‘ میں تیز تیز قدم اُٹھاتا اندر کی جانب بڑھ گیا۔ لبنیٰ ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے قریب اُداس سی کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ ’’پری زاد کیسے ہو؟‘‘ میں نے چھُوٹتے ہی سوال کیا؟ ’’آپ اتنے دن سے یونی ورسٹی کیوں نہیں آئیں۔ سب ٹھیک تو ہے ناں۔‘‘ لبنیٰ نے میری طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ ’’ہاں...... میں نے یونی ورسٹی چھوڑ دی ہے۔ ممّا نے میری شادی طے کردی ہے۔‘‘ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ’’شادی یوں اچانک، مگر کس کے ساتھ؟‘‘ ’’سیٹھ عابد کے ساتھ۔ میری شادی عابد سے ہو رہی ہے۔‘‘ یہ میرے لیے دوسرا جھٹکا تھا۔ ’’سیٹھ عابد سے مگر، آپ اور وہ، میرا مطلب ہے، آپ کے لیے اس شخص سے کہیں بہتر لوگ موجود تھے۔‘‘ لبنیٰ کی پلکیں نم ہونے لگیں۔ ’’بات میرے انتخاب کی نہیں ہے پری زاد۔ اونچی بولی کی ہے، جو بھی میرے لیے اونچی بولی لگائے گا، میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھما دیا جائے گا۔ عابد کی بولی پندرہ کروڑ تھی۔ میری نیلامی میں اس سے اونچی بولی کسی اور نے نہیں دی۔ لہٰذا مجھے عابد کے نام کردیا گیا۔‘‘ مجھ سے برداشت نہیں ہوا اور میں بول پڑا۔ ’’بولی شریف لڑکیوں کی نہیں لگتی ہے لبنیٰ جی، شریف گھرانوں کی لڑکیاں تو رُخصت ہوتی ہیں، عزت کے ساتھ۔‘‘ لبنیٰ کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا۔ ’’تو پھر یہی سمجھ لو کہ میں بھی وہیں سے تعلق رکھتی ہوں، جہاں لڑکیوں کی بولیاں لگتی ہیں۔ رُخصتی نہیں ہوتی۔‘‘ مجھے سب کچھ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ ’’یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟‘‘ ’’ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ اب میں یونی ورسٹی نہیں آؤں گی پری زاد۔ پندرہ دن کے بعد میری دُنیا دکھاوے کے لیے وہ رسم بھی ادا ہو جائے گی، جسے یہاں رُخصتی کہتے ہیں۔‘‘ لبنیٰ کی آنکھیں اب باقاعدہ برسنے لگی تھیں۔ تم سوچ رہے ہو گے کہ یہ عالی شان گھر، یہ رہن سہن اور میری یہ اعلیٰ تعلیم...... یہ سب دکھاوا ہے پری زاد۔ ہماری یہ شان و شوکت ان ہی سیٹھ عابد جیسے لوگوں کے دم سے ہے۔ جسے لوگ کبھی بازارِ حُسن کہا کرتے تھے، اب وہ بازار کسی خاص علاقے تک محدود نہیں رہا۔ پھیل کر شہروں کی ان اونچی اور اعلیٰ بستیوں تک پہنچ گیا ہے، اور جسے میں اپنی ماں کہتی ہوں، پتا نہیں، وہ میری سگی ماں ہے بھی یا نہیں۔ یہ بھی اس کا احسان ہے کہ اس نے مجھے اپنی تعلیم کا شوق پورا کرنے دیا یا شاید یہ بھی بازار میں بولی بڑھانے کا ایک کارآمد نسخہ ہوگا۔‘‘ لبنیٰ بولتے بولتے خاموش ہوگئی۔ میرے پاس بھی اب کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا، سو، واپسی کے لیے قدم اٹھا دیے کہ عقب سے لبنیٰ کی آواز آئی۔ ’’میں نے یہ سب کچھ تمہیں اس لیے بتایا ہے پری زاد کہ تم ایک سچے دوست ہو۔‘‘ میں نے پلٹ کر سر جھُکائے سیاہ لباس میں ملبوس، ڈھلتی سُرمئی شام جیسی لبنیٰ کے وجود کو آخری بار اپنی دُکھتی آنکھوں کے آئینے میں سمویا۔ اس کے گلابی عارض آنسوؤں سے دُھل سے گئے تھے۔ ’’لبنیٰ جی...... کاش! میرے پاس پندرہ کروڑ روپے ہوتے تو میں آپ کو خرید کر آزاد کردیتا۔ مگر آپ تو جانتی ہیں کہ زندگی کی اصل فلم میں لڑکے کے پاس لڑکی کے ماں باپ کو ادا کرنے کے لیے کبھی پیسے نہیں ہوتے۔ وہ تو بس کسی اور کے خریدے گئے پیانو پر بیٹھ کر جدائی کا گانا ہی گا سکتا ہے۔‘‘ لبنیٰ کے ہونٹوں پر میری بات سُن کر ذرا دیر کے لیے ایک ہلکی سی مُسکان اُبھری اور میں اس کا، وہی آخری مدھر مسکان بھرا چہرہ، آنکھوں میں لیے پلٹ آیا۔ لان میں فوارے کے قریب کرسی ڈالے لبنیٰ کی ماں ابھی تک بیٹھی فون پر کسی سے بات کر رہی تھیں۔ مجھے واپس جاتا دیکھ کر فون کاٹ دیا اور پھر ان کی کاروباری آواز نے جیسے میرے قدم جکڑ لیے۔ ’’سنو لڑکے! میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، زندگی میں کچھ حاصل کرنا چاہو، تو اپنی جیب میں اس کے دام ضرور رکھو۔ شاید اس وقت میں تمہاری نظر میں ایک بہت بُری عورت ہوں، مگر تمہیں ایک پتے کی بات بتا رہی ہوں۔ مرد کی شکل اور شخصیت کوئی نہیں دیکھتا۔ سب اس کا رُتبہ اور عہدہ پرکھتے ہیں۔ دولت مرد کے ہر عیب، ہر خامی پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ آئندہ زندگی میں کچھ پانا چاہو تو میری نصیحت ہمیشہ یاد رکھنا۔‘‘

پندرہ دن بعد شہر کے تمام بڑے اخباروں میں ملک کے معروف صنعت کار، سیٹھ عابد کی دوسری شادی کی خبریں نمایاں طور پر شائع ہوئیں۔ میں نے بےزاری سے اخبارات یونی ورسٹی کی لائبریری کی میز پر پٹخ دیئے۔ ٹھیک ہی کہا تھا لبنیٰ کی ماں نے، سارا کھیل پیسے کا ہے، جیب میں دھیلا نہ ہو تو یہ سوچ، الفاظ، اعلیٰ خیالات اور ادب و فن، سب کسی کام کے نہیں۔ دمڑی پاس ہو تو پھر سارا میلہ ہی اپنا ہے۔ میں ان ہی خیالات میں گھرا گھر آیا تو دونوں بڑے بھائی اور بھابیاں استقبال کے لیے تیار کھڑے تھے ’’ہاں میاں...... اور کتنی چلے گی تمہاری یہ پڑھائی، گھر کے خرچوں کا کچھ اندازہ بھی ہے تمہیں۔ اب تمہاری ان شام کی دو ٹیوشنوں میں گزارہ نہیں ہوتا۔‘‘ دوسرے بھائی بولے۔ ’’میں تو کہتا ہوں کہ پڑھ لکھ کر بھی تمہیں کون سا کہیں کلکٹر لگ جانا ہے۔ وہی کلرکی ہوگی اور وہی مہینے بھر کے پانچ سات ہزار۔‘‘ بھابھی نے مشورہ دیا ’’میری مانو تو کوئی کل وقتی ملازمت پکڑ لو۔ بھئی، سچ تو یہ ہے کہ اب ہمارے اپنے بچّوں کے خرچے اتنے بڑھ چکے ہیں کہ ہمیں خود اپنے منہ سے کہتے شرم آتی ہے۔ تمہاری عُمر کے محلّے کے سب لڑکے نوکریوں پر لگ کر اپنا گھر چلا رہے

ہیں۔‘‘میرے لیے ان کے یہ جملے کچھ نئے نہیں تھے، ہفتے میں ایک آدھ بار یہ قسط وار سیریل ضرور چلتا تھا، مگر آج نہ جانے کیوں میرا دل پہلے ہی اتنا بھرا ہوا تھا کہ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ لہجے میں ان سب سے کہہ دیا کہ اگر اس گھر کا کاروبار میری کمائی کی وجہ ہی سے رُکا ہوا ہے تو میں کوشش کروں گا کہ اسی ماہ کوئی نوکری یا مزدوری پکڑ کر ان سب کے منہ بند کر دوں۔ گھر والے ٹھیک ہی کہتے تھے، ڈگری مل جانے کے بعد بھی مجھ جیسے جانے کتنے، نوکری کے لیے برسوں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ اور پھر انٹرویو، جو کسی بھی نوکری کا لازمی جزو ہوتا ہے، اس کے لیے اچھی شخصیت کا ہونا کبھی کبھی شرطِ اول بن جاتا ہے اور میری شخصیت...... مجھے تو شاید کوئی بڑی فرم یا دفتر انٹرویو کے لیے طلب ہی نہ کرے۔ مگر نوکری یا کام ملنے کے لیے میرے پاس کوئی ہنر بھی تو نہیں تھا۔ مجھے یاد آیا کہ محلے کا ایک لڑکا، شوکی بچپن ہی سے کسی ویلڈنگ گیراج پر مزدوری پر لگ گیا تھا اور اس کی ماں کے بقول ہر ماہ ایک معقول رقم گھر والوں کے ہاتھ پر لا کر رکھتا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ فائنل امتحانات، جو اگلے ماہ شروع ہو رہے تھے، ان کی تیاری میں مزید وقت ضائع نہیں کروں گا اور آج گھر جانے سے پہلے کوئی نہ کوئی کام ضرور ڈھونڈ کر پلٹوں گا۔ شوکی کے گیراج کا پتا مجھے معلوم تھا۔ میں نے گیراج کے گیٹ پر پہنچ کر سامنے کام کرتے لڑکے سے شوکی کے بارے میں پوچھا، تو لڑکا شوکی کو بلانے اندر چلا گیا۔ میں نے آس پاس نظر دوڑائی۔ گیراج کے گیٹ کے اُوپر ایک بورڈ پر بڑا بڑا ’’استاد مستانہ ویلڈنگ گیراج‘‘ لکھا تھا۔ کچھ ہی دیر میں شوکی نمودار ہوا اور مجھے گیٹ پر کھڑے دیکھ کر گرم جوشی سے آگے بڑھ کر ملا۔ ’’ارے...... پَری زاد بھائی آپ، یہاں...... سب خیر تو ہے؟‘‘ میں نے ایک لمبی سانس بھری۔ ’’ہاں، سب خیر ہے۔ مجھے تمہارے گیراج میں کوئی کام مل سکتا ہے کیا، مجھے کام کی تلاش ہے۔‘‘ شوکی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ’’آپ، یہاں کام کریں گے، مگر آپ تو پڑھے لکھے ہو پَری بھائی۔‘‘ میں نے شوکی کو ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں سمجھانے کی کوشش کی کہ نوکری اب میری ضرورت سے بڑھ کر مجبوری بن چکی ہے۔ اتنے میں کُرتے شلوار میں ملبوس اُوپر سیاہ واسکٹ پہنے، کانوں میں موتیے کا پھول سجائے ایک شخص باہر سے اندر داخل ہوا، جس کے تیل میں چپڑے بال ایک جانب سلیقے سے کڑھے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر پان کی لالی اور پتلی طرح دار مونچھیں، دونوں جانب سے اُوپر اُٹھی تھیں۔ اس نے شوکی کے سلام کے جواب میں مجھے غور سے دیکھا اور دھیرے سے گنگناتے ہوئے بولا ’’وہ آئے ہمارے گھر میں، خدا کی قدرت ہے...... میاں شوکی! یہ حضرت کون ہیں؟‘‘ شوکی نے جلدی سے میرا تعارف کروایا۔ ’’یہ پَری زاد بھائی ہیں استاد جی، میرے محلے میں رہتے ہیں اور کسی کام کی تلاش میں ہیں۔‘‘ استاد مستانے پر بھی میرے نام کا وہی اثر ہوا، جس کا میں ہمیشہ سے عادی تھا۔ میں نے درپیش آنے والی بحث کو مختصر کرنے کی غرض سے بولنے میں پہل کی۔ ’’اگر میری صورت اور تعلیم آپ کی راہ میں حائل نہ ہو تو کیا آپ مجھے کوئی کام دے سکتے ہیں۔ میں بہت محنت کروں گا اور جلد ہی سیکھ جاؤں گا۔‘‘ استاد مستانہ میری بات سُن کر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ’’معاف کرنا میاں...... شاید تم بُرا مان گئے۔ میرا مقصد تمہارا دل دُکھانا ہرگز نہیں تھا، تم کرتے کیا ہو......؟‘‘ میرے بولنے سے پہلے شوکی بول اُٹھا ’’پَری زاد بھائی یونی ورسٹی میں پڑھتے ہیں استاد۔‘‘ استاد نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ’’لگتا ہے کوئی بہت بڑی مجبوری ہے؟‘‘ ’’ہاں، ایسا ہی سمجھ لیجیے۔‘‘ مستانے استاد نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی، ’’ٹھیک ہے میاں...... کب سے کام پر آنا چاہتے ہو؟ فی الحال تمہیں دیہاڑی پر رکھ سکتا ہوں۔‘‘ میں نے آستینیں چڑھا لیں۔ ’’آج سے استاد۔‘‘ رات دیر گئے، میں گھر واپس پہنچا تو حسبِ معمول میرا انتظار کیے بنا سب سوچکے تھا۔ میں نے اپنی زندگی کی پہلی مزدوری کی دیہاڑی کے روپے برآمدے میں پڑی چوکی پر رکھ دیئے اور صبح سویرے مُنہ اندھیرے پھر سے اُٹھ کر گیراج چلا گیا۔ استاد مستانہ اپنے مزاج کا ایک الگ ہی بندہ تھا۔ فلموں میں کام کرنے کا شوق، اسے لڑکپن ہی میں اس کے گاؤں سے شہر تو کھینچ لایا تھا، لیکن قسمت نے اداکار کے بجائے مستری بنا ڈالا۔ مگر اس کے اندر کا فن کار ابھی تک زندہ تھا اور مستانہ ابھی تک ہر نئی فلم کا پہلا شو، پہلے دن دیکھنے کا قائل تھا اور پھر فلم شو سے واپسی پر گھنٹوں اس کے تبصرے جاری رہتے۔ ’’کیا خاک ایکٹنگ کی ہیرو نے، ہاں ولن نے پھر بھی کچھ رنگ جمایا...... نہ میاں! موسیقی کا تو بیڑہ غرق ہی کر دیا ہے، ان نئے لڑکوں نے، اور شاعری بھی کیا بے ہودہ اور بکواس ہو گئی ہے، تُو فلانے کا باپ، میں فلانے کا بیٹا، بھلا یہ بھی کوئی شاعری ہے؟ شاعری تو تب ہوا کرتی تھی۔ جایئے آپ کہاں جائیں گے، یہ نظر لوٹ کے پھر آئے گی...... تیرے میرے سپنے اب ایک رنگ ہیں...... عجیب داستاں ہے یہ، کہاں شروع، کہاں ختم...... واہ واہ کیا بات تھی اس شاعری کی۔‘‘ استاد مستانہ گھنٹوں بولتا رہتا اور ہم سارے شاگرد چپ چاپ اس کے تبصرے سُنتے رہتے۔ مجھے استاد نے ویلڈنگ پلانٹ پر بیٹھنے سے پہلے ایک طویل لیکچر دیا۔ ’’دیکھ میاں! یہ جو آگ کی چنگاریاں ہیں، یہ آج سے تمہارے لیے پھول کلیاں اور پھلجھڑیاں ہیں۔ یہ ایک آدھ دن ہی میں تمہارے لباس میں ہزاروں ننھے منے شگاف ڈال دیں گی۔ تمہارے ہاتھوں اور جسم کے کُھلے حصّوں پر انگاروں کی طرح برس کر تمہارے سارے جسم کو داغ دار کر دیں گی۔ شروع شروع میں کافی جلن بھی ہوگی، مگر پھر دھیرے دھیرے یہ آگ تمہاری دوست بن جائے گی اور تمہیں ان چنگاریوں کی عادت پڑ جائے گی۔ آگ کے ان جگنوؤں سے جتنی جلدی آشنائی ہو جائے، اُتنا ہی بہتر ہے۔ ان سے بچنے کی کوشش کرو گے تو کام نہیں سیکھ سکو گے۔‘‘ اب میں استاد کو کیا بتاتا کہ جو پہلے سے جل کر راکھ ہو چکے ہوں، ان کا بھلا یہ بھڑکتی آگ کیا بگاڑے گی؟ اور پھر جلن کے لیے احساس زندہ ہونے کی ضرورت ہوتی ہے، مجھ جیسے بے حسوں کے لیے کیا چنگاری اور کیا پھلجھڑی۔

یونی ورسٹی کا فائنل امتحان بھی میں نے جیسے تیسے کر کے دے ہی ڈالا۔ حالاں کہ اب مجھے ڈگری لینے میں کوئی خاص دل چسپی نہیں تھی۔ ان ہی دنوں میرے ہم جماعتوں نے مجھے بتایا کہ یونی ورسٹی کے سالانہ رسالے میں میری بہت سی شاعری کو اکٹھا کر کے ایک خاص نمبر بھی نکالا گیا ہے۔ میں نے کسی کے ہاتھ وہ رسالہ منگوا لیا اور ایک دن گیراج میں بیٹھا اسی رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ استاد نے مجھے دیکھ لیا اور میرے ہاتھ سے رسالہ جھپٹ کر اس پر ایک طائرانہ سی نظر ڈالتے ہی اُس کی آنکھیں کُھل گئیں۔ ’’ارے واہ میاں! تو تم شاعر بھی ہو۔ بھئی کمال ہے، بتایا کیوں نہیں پہلے؟‘‘ میں نظریں چرا گیا۔ ’’اس میں بتانے لائق کیا تھا بھلا؟‘‘ ’’کیا مطلب، تم شاعری کو معمولی بات سمجھتے ہو۔ مجھ جیسوں سے اس کی قدر پوچھو میاں! کیا رچاؤ ہے تمہارے لفظوں میں، ہر ایک مصرع، دوسرے سے بڑھ کر۔ استاد نے وہیں باہر سردیوں کی ڈھلتی دھوپ میں کرسی ڈلوالی اور سورج ڈوبنے سے قبل وہ سب کچھ حفظ کر ڈالا۔

میں بہت دیر سے لوہے کے ایک بڑے پتری نما ٹکڑے کو کاٹنے کی تگ ودو میں الجھا تھا، مگر اس دن ایسا لگ رہا تھا، جیسے شعلے کو بھی مجھ سے کوئی بیر ہو گیا ہے۔ جب انسان کا وقت بُرا ہو تو ہر چیز اپنا تاثر کھو دیتی ہے۔ شبنم آگ اگلنے لگتی ہے اور شعلے سرد پڑ جاتے ہیں۔ استاد مجھے بہت دیر تک اس سرد چنگاری میں فولاد کاٹنے کی لاحاصل سعی کرتے دیکھتا رہا اور پھر اٹھ کر میرے قریب آ گیا۔ ’’کبھی کبھی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس بھڑکتی ہوئی آگ سے کہیں زیادہ تپش تمہارے اپنے اندر ہے، جو ہر پل تمہیں جھلساتی رہتی ہے۔ پُری زاد میاں، کیوں اپنی جوانی ان شعلوں میں راکھ کر رہے ہو، آخر ایسی کیا مجبوری ہے تمہاری۔‘‘ میں نے مستانہ استاد کی آنکھوں میں جھانکا۔ ’’پیسا...... مجھے لگتا ہے میری ہر کم زوری، ہر عیب اور ہر خامی کا علاج صرف پیسا ہے استاد اور مجھے زندگی میں بہت سارا پیسا کمانا ہے۔‘‘ استاد نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا۔ ’’پر، اس روزانہ کی مزدوری سے تم کتنا کما سکو گے۔ دن رات محنت کرو، تب بھی مہینے کے آخر میں تمہارے ہاتھ میں پندرہ بیس ہزار سے زیادہ کچھ نہیں آئے گا۔ البتہ چند سالوں کے اندر تمہاری جوانی ضرور گھل چکی ہو گی اور تمہاری نظر الگ جواب دے جائے گی۔‘‘ میں بے بسی سے ہار کر بولا۔ ’’تو پھر میں کیا کروں...... مجھے بہت پیسا کمانا ہے استاد۔ بہت زیادہ۔ اتنا زیادہ کہ اس کی چمک سے میرے وجود کا ہر داغ، ہر عیب چُھپ جائے۔‘‘ ’’اگر تم پیسا کمانا چاہتے ہو تو دبئی چلے جاؤ، وہاں اس ہنر کی بہت مانگ ہے، اگر قسمت نے ساتھ دیا تو چند سالوں میں کافی کما لوگے۔ کم از کم اپنا گیراج تو کھول ہی سکو گے۔‘‘ میں استاد سے یہ نہیں کہہ پایا کہ میں صرف ایک گیراج نہیں، یہ پورا شہر خریدنا چاہتا ہوں۔ ’’استاد! کیا تم مجھے دبئی بھجوا سکتے ہو کسی طرح؟‘‘ ’’دبئی جانا اتنا آسان نہیں ہے میاں۔ ویزا، ٹکٹ اور قدم جمانے کے لیے تین چار ماہ کے قیام پر چار پانچ لاکھ روپیا تو لگ ہی جائے گا۔ اور پھر آگے تمہاری قسمت کہ تمہیں لمبے عرصے کے لیے کوئی کفیل ملتا ہے کہ نہیں۔‘‘ اگلا پورا ہفتہ میں یہی سوچتا رہا کہ آخر، ہمارے مقدر کا ہر فیصلہ کاغذ کے ان چند ٹکڑوں ہی سے کیوں جُڑا رہتا ہے۔ لوہے کے پرانے صندوق سے سردیوں کے کپڑے ڈھونڈتے ہوئے میں ایسی ہی کسی سوچ میں گم تھا کہ اچانک میری نظر کالج اور یونی ورسٹی کے دور میں لکھی گئی اپنی شاعری کے رجسٹر پر پڑی۔ کبھی میرا خواب تھا کہ میری شاعری کا مجموعہ بھی بازار میں آئے اور میری کتاب کی پزیرائی میں شہر کے دانش ور شام منعقد کریں اور مجھے بھی لوگوں کے جھگمٹے میں سراہا جائے۔ رجسٹر کے ورق پلٹتے ہوئے میری پلکیں بھیگنے لگیں۔ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے ہمارے سینے میں دھڑکتے دل کا رشتہ باقی جسم سے کسی سوتیلے جیسا ہوتا ہے۔ سارا جسم اور اعضاء جب ایک دوسرے کے ساتھ تال میل میں جڑے رہتے ہیں، تب یہ سوتیلا تنہا اور اداس کسی روٹھے بچّے کی طرح دُور بیٹھا کسی اور ہی دنیا میں گم ہوتا ہے۔ رجسٹر میں لکھی میری شاعری بھی کسی ایسے ہی سوتیلے اور روٹھے بچّے کی باتوں جیسی تھی۔ اگلے روز میں عابد گروپ آف کمپنیز کے گیٹ پر کھڑا تھا۔ پہلے تو چوکیدار نے میرا حلیہ دیکھتے ہی مجھے صاف منع کر دیا، مگر جب میں نے اپنے نام کی پرچی انگریزی میں لکھ کر اس کے حوالے کی کہ وہ ایک بار استقبالیے پر جا کر اسے اندر بھجوا دے، اگر انکار ہوا تو میں گیٹ ہی سے واپس لوٹ جاؤں گا، تو چند لمحے سوچنے کے بعد وہ اندر چلا گیا۔ مجھے اندر بلا لیا گیا اور گھنٹہ بھر انتظار کے بعد میں سیٹھ عابد کے دفتر میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ سیٹھ عابد نے سگار کا ایک لمبا سا کش لیا اور طنزیہ انداز میں بولا۔ ’’کیوں، میں نے کہا تھا ناں، اس دنیا میں ہر چیز بکاؤ ہے، بس ٹھیک قیمت لگانے والا ہونا چاہیے، تو بولو، کتنی قیمت رکھی ہے تم نے اپنی شاعری کی۔‘‘ میں نے اپنا رجسٹر اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ ’’مجھے دبئی کا ٹکٹ اور ویزے کا خرچہ چاہیے۔ اگر آپ دے سکیں تو......‘‘ سیٹھ عابد نے رجسٹر اٹھا کر کسی دکان دار کی طرح اسے پہلے تولا اور پھر ورق گردانی کی۔ ’’ٹھیک ہے، شاعری میری کم زوری ہے، مگر پھر بھی دو سو صفحات کی یہ قیمت بہت زیادہ ہے۔‘‘ میں نے اس کباڑیے کو غور سے دیکھا۔ ’’آپ چاہیں تو بطور قرض مجھے یہ رقم دے دیں اور اسٹامپ لکھوا لیں کہ میں کسی خاص مدت کے بعد آپ کو یہ پیسے واپس لوٹا دوں گا۔ شاعری البتہ ہمیشہ کے لیے آپ ہی کی رہے گی۔‘‘ سیٹھ عابد کے ہونٹوں پر جمی طنزیہ مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔ ’’واپس لوٹا بھی سکو گے یا دبئی جا کر غائب ہو جاؤ گے......؟ چلو ٹھیک ہے۔ میرا سیکریٹری تم سے شاعری کے حقوق کے بارے میں کچھ دستاویزات دستخط کروا لے گا۔ تمہارا دبئی کا ٹکٹ اور ویزا میرے ذمّے رہا۔‘‘ میں واپسی کے لیے پلٹ کر دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ اس کی آواز دوبارہ سُنائی دی۔ ’’لیلیٰ اب بھی کبھی کبھی تمہاری شاعری کی تعریف کرتی ہے۔ مجھے امید ہے، تم نے اس رجسٹر میں لکھی شاعری اسے نہیں سنائی ہو گی۔‘‘ میں نے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ ’’آپ بے فکر رہیں، یہ نظمیں اور غزلیں کسی کے کانوں تک نہیں پہنچیں اور آج کے بعد یہ میرے حافظے سے بھی ہمیشہ کے لیے مٹ جائیں گی۔‘‘ اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

مستانہ استاد حسبِ معمول اپنا چھوٹا سا ریڈیو کانوں سے لگائے کھڑا تھا اور عالم گیر کی آواز کے ساتھ سر دھن رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا ’’آؤ میاں آؤ! کہیں تمہارا دل بھی تو اپنے استاد سے بَھر نہیں گیا۔ آج کل گیراج میں بھی دل نہیں لگ رہا تمہارا۔ ناغہ پر ناغے کرنے لگے ہو۔‘‘ میں نے استاد کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھا لیا۔ ’’استاد! میرے دبئی جانے کا بندوبست کر دو ٹکٹ اور ویزا الگوا لیا ہے میں نے۔ وہاں تمہاری کوئی جان پہچان ہے تو بتاؤ۔‘‘ استاد کے ہاتھ سے ریڈیو نیچے گر گیا، اس نے لپک کر مجھے سینے سے لگا لیا۔ ’’واہ! خوش کر دیا پیارے، میں جانتا تھا کہ تم ایک دن ضرور کچھ کر دکھاؤ گے...... کب جانا ہے؟ میرا اُوور کا ایک برخوردار رہتا ہے وہاں۔ میں آج ہی اسے فون کر دیتا ہوں، تم اسی کے ساتھ رہو گے۔ وہ بھی وہاں اکیلا ہے، کئی سال سے...... رفیق نام ہے اس کا۔‘‘

اگلے تین چار ہفتے یوں گزرے، جیسے چار پَل گزرے ہوں۔ بھائی بھابھیاں اور گھر والے آخری وقت تک یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں رہے اور پھر وہ دن بھی آ پہنچا، جس دن میں اپنا مختصر سا سامان باندھے ائرپورٹ پر کھڑا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی جہاز سے تو کیا، ٹرین سے بھی کوئی لمبا سفر نہیں کیا تھا۔ اس لیے مجھ سے وہ تمام حماقتیں سرزد ہوتی رہیں، جو مجھ جیسے کسی بھی فرد سے پہلی بار ہوائی سفر میں ہو سکتی تھیں۔ جہاز نے دبئی ائرپورٹ پر لینڈ کیا اور میں گھنٹہ بھر بعد باہر نکلا، تو بہت دیر انتظار کے باوجود مجھے رفیق کہیں نظر نہیں آیا۔ ائرپورٹ سے باہر جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں چونک کر پلٹا، آنے والا شخص مجھے کڑی نظروں سے گھور رہا تھا۔ ’’جعلی ویزے پر دبئی آئے ہو، جانتے ہو، اس کی سزا کیا ہے......؟‘‘

(جاری ہے)



ہاشم ندیم

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ’’خدا اور محبت‘‘ اور ’’بچپن کا دسمبر‘‘ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ’’عبداللہ‘‘ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ’’عبداللہ‘‘ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

’’پری زاد‘‘ ایک اچھوتے، حسّاس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ’’سنڈے میگزین‘‘ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

e@janggroup.com.pksundaymagazin

اس شخص کی بات سن کر چند لمحوں کے لیے تو میں گُنگ ہی رہ گیا۔ دیارِ غیر میں گرفتار ہونے والے پھر مشکل ہی سے سلاخوں کے پار آ پاتے ہیں۔ سیٹھ عابد جیسے شخص سے کچھ بھی توقع کی جاسکتی تھی۔ ہوسکتا ہے، اس نے ہمیشہ کے لیے میرا بندوبست کرنے کی غرض سے مجھے جعلی ویزا ہی لگوا کر دیا ہو؟ میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے ایک عجیب سی نفرت دیکھی تھی۔ یہ ویسی نفرت نہیں تھی، جو باقی سب لوگ میری بدصورتی کی وجہ سے مجھ سے محسوس کرتے تھے، یہ عداوت کچھ الگ ہی تھی۔ مجھے یاد ہے، جب میں اپنا ویزا لگا پاسپورٹ سیٹھ عابد کے دفتر سے اٹھانے کے لیے گیا، تو اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ’’لبنیٰ تمہاری شاعری کی عاشق ہے۔ سچ پوچھو، تو اگر میں نے تمہیں دیکھ نہ رکھا ہوتا تو ضرور تمہیں اپنے رقیبوں میں شمار کرلیتا......‘‘ اب میں اسے کیا بتاتا کہ رقیب ہونا میرا نصیب ہوتا تو پھر بات ہی کیا تھی، مگر بہرحال سیٹھ عابد میرے الفاظ کا رقیب تو تھا اور اس کے لیے اتنی رقابت بھی کافی تھی شاید......؟ میں چپ چاپ کھڑا اپنی گرفتاری کا انتظار کررہا تھا کہ اچانک وہ شخص زور سے ہنس پڑا۔ ’’او یار! تم تو سنجیدہ ہی ہوگئے۔ مجھے پہچانا نہیں۔ رفیق ہوں میں۔ استاد مستانے کا بھانجا۔‘‘ میں نے چونک کر غور سے اسے دوبارہ دیکھا۔ استاد کے بتائے ہوئے حلیے سے تو یکسر مختلف تھا وہ۔ رفیق میری اُلجھن سمجھ گیا۔ ’’ارے یار...... استاد نے مجھے پندرہ سال پہلے دیکھا تھا، جب میں فیکا ہوا کرتا تھا۔ ایک کم زور، لاغر اور ناکارہ سامنہ بسورتا لڑکا۔ مگر یہ دبئی ہے پیارے۔ اچھے اچھوں کی کایا پلٹ دیتا ہے۔ اب مجھ ہی کو دیکھ لو۔‘‘ رفیق نے جیب سے اپنی اور استاد کی ایک ساتھ کھنچی ہوئی پرانی بلیک اینڈ وائٹ تصویر نکالی۔ وہ واقعی بہت بدل گیا تھا۔ عربی لباس، اونچا قد، بھرا ہوا جسم اور کِھلتی رنگت، کون کہہ سکتا تھا، یہ وہی پرانا فیکا ہے، جو چند سال پہلے پاکستان سے دبئی کے اس صحرا میں قسمت آزمائی کے لیے اُترا ہوگا۔ میں نے شکایت کی۔ ’’بہت اچھا استقبال کیا تم نے، جان ہی نکال کر رکھ دی میری۔‘‘ وہ زور سے ہنسا۔ ’’معاف کرنا یار! مذاق اپنی پرانی عادت ہے۔ ویسے تم ائرپورٹ کے اس کونے میں جس طرح سہمے، ڈرے ہوئے کھڑے تھے، تمہیں دیکھ کر کوئی بھی یہ سوچ سکتا تھا کہ تم غیر قانونی طریقے سے دبئی آئے ہو۔‘‘ ہم دونوں گیٹ نمبر 17 کے سامنے والے بڑے ستون کے پاس کھڑے تھے۔ دبئی آنے سے پہلے فون پر رفیق کے ساتھ یہی جگہ ملنے کے لیے طے ہوئی تھی۔ ائرپورٹ پر ایک نہ ختم ہونے والی بِھیڑ تھی، بھانت بھانت کے لوگ، مرد و زن کا ایک سیلاب، جہاں کسی کو کسی کی طرف دیکھنے یا اس پر دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ ہر کوئی اپنے آپ میں گم کسی ان جانی منزل کی طرف رواں تھا، مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا، خود کو گم کردینے کے لیے ہمیشہ کسی جنگل یا ویرانے کی ضرورت نہیں ہوتی، انسانوں کا ہجوم بھی خود کو کھو دینے کے لیے بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ رفیق میرے منع کرنے کے باوجود میرا سامان اٹھا کر ائرپورٹ سے باہر نکل آیا۔ وہ مجھ سے عمر میں تین چار سال ہی بڑا ہوگا، مگر اس وقت میرے لیے ایک مکمل بزرگ کا روپ دھارے مجھے مختلف نصیحتیں کررہا تھا۔ ’’یہاں کے عرب بڑے مغرور اور اجڈ ہیں۔ انہیں خود کو دوسروں سے برتر سمجھنے کا خبط ہے۔ اس لیے ان کے منہ لگنے سے پرہیز کرنا، ورنہ یہ اپنے بندے کا قصور ہوتے ہوئے بھی تمہی کو خطاوار سمجھیں گے اور اگلے جہاز میں بٹھا کر واپس پاکستان روانہ کردیں گے۔ مجھے بھی ایک عُمر ہوگئی، ان کے نازنخرے اٹھاتے اور ان کا خبط برداشت کرتے۔ گالی ان کی زبان پر آتے دیر نہیں لگتی اور اپنے علاوہ دوسری سبھی اقوام کو یہ اپنا خادم تصور کرتے ہیں۔ خاص طور پر ہم مزدور طبقہ لوگوں کو تو ہر پل ان کا غلام بن کر ہی گزارا کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا دماغ ہمیشہ ٹھنڈا رکھنا......‘‘

رفیق نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا اور میں حیرت سے صحرا میں سجے اس شہر کو دیکھتا رہا، جسے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے پہلی ہی نظر میں یہ احساس ہوا تھا کہ جیسے چند بدوؤں نے صحرا میں چلتے چلتے کچھ دیر کھیل تماشے کے لیے اونچی عمارتوں اور کشادہ سڑکوں کا یہ میلہ سجایا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں شام ہوجائے گی تو وہ اپنے خیموں سمیت یہ نقلی شہر بھی اکھاڑ کر چلتے بنیں گے، جیسے ساحل پر کھیلنے والے بچے دن بھر گیلی ریت سے گھروندے بنا کر انہیں خشک کرتے ہیں اور پھر شام کو جب ان کی مائیں واپسی کے لیے آواز لگاتی ہیں، تو جاتے جاتے پیروں سے اپنا ہی بنایا شہر مسمار کرکے چلے جاتے ہیں۔ مجھے دبئی بھی ایسے چند شرارتی بچّوں کا بنایا ہوا عارضی بسا شہر لگ رہا تھا۔ رفیق مجھے جس عالی شان اور لمبی سی گاڑی میں لیے چوڑی سڑکوں پر تیزی سے دوڑے جارہا تھا، میں نے اس گاڑی کے ڈیش بورڈ پر ہاتھ پھیر کر رفیق سے کہا۔ ’’گاڑی تو بڑی کمال ہے، اپنی ہے کیا؟‘‘ رفیق نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ’’فی الحال نہیں، مگر ایک دن اپنی بھی ہوجائے گی۔ میرے مالک کی گاڑی ہے یہ۔ ہم تو صرف ڈرائیور ہیں۔ مالک کی ڈرائیوری کرکے روزی روٹی کماتے ہیں۔‘‘ گاڑی مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی کسی رہائشی علاقے میں داخل ہوگئی، جہاں اونچی اونچی عمارتوں میں بہت سے چھوٹے فلیٹس بھی بنے تھے۔ رفیق اسی علاقے میں رہتا تھا، ہم اس کے چھوٹے سے، مگر صاف ستھرے فلیٹ میں داخل ہوئے، تو اس نے فوراً چائے کا پانی چولہے پر چڑھا دیا۔ ’’فریج میں کھانے پینے کا سارا سامان پڑا ہے۔ کھانا گرم کرکے کھا لینا۔ مجھے کچھ دیر میں واپس جانا ہوگا۔ مالک سے صرف دو گھنٹے کی چھٹی لے کر آیا ہوں۔ رات کو باقی باتیں ہوں گی۔‘‘

رفیق لپک جھپک چائے کی پوری پیالی دو گھونٹ میں حلق سے اتار کر وہاں سے چلتا بنا۔ بہت کھلے دل کا تھا رفیق! بالکل استاد مستانہ کی طرح...... مجھے وہ سب یاد آئے، تو میں ایک دم اُداس ہو گیا۔ میں نے زندگی میں کبھی گھر سے باہر اور اتنی دُور وقت نہیں گزارا تھا۔ ہم انسان بھی کتنے زود فراموش ہوتے ہیں، ذرا سی دُوری ہمیں ماضی کا ہر عذاب بھلا کر پھر اُسی ماضی کو یاد کر کے آہیں بھرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ جب میں اپنے گھر میں تھا، تب بھی وہاں میں نے کون سے اچھے دن دیکھے تھے، مگر آج چند ہزار میل کا فاصلہ طے کرتے ہی مجھے اسی گھر اور اپنی گلیوں کی یاد ستانے لگی تھی، جہاں مجھے ہر پل کسی نئی ذلت کا سامنا رہتا تھا۔ جب ایک دن ہمیں یہ سب کچھ چھوڑ ہی جانا ہوتا ہے، تو پھر ہم ان در و دیوار، رشتوں، درختوں اور آس پاس کے ماحول سے اتنا جُڑ کیوں جاتے ہیں کہ ذرا سی دوری خود ہمیں توڑ کے رکھ دیتی ہے۔ یہ دنیا اگر عارضی پڑاؤ ہے، تو اپنے ساتھ عارضی پن کا احساس لے کر کیوں نہیں آتی۔

اگلے ایک ڈیڑھ ہفتے میں رفیق نے بھاگ دوڑ کر کے مجھے ایک تعمیراتی کمپنی کے ذریعے کام پر لگوا دیا۔ فی الحال میرے پاس تین ماہ کا کام کرنے کا ویزا تھا، مگر رفیق نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے مالک سے میری سفارش کروا کر اسے سال بھر کے ویزے میں تبدیل کروا دے گا اور اگر میں نے محنت اور ایمان داری سے اپنا کام جاری رکھا، تو اس مدت میں سال بہ سال توسیع بھی ہوتی رہے گی۔ مجھے ایک زیرِ تعمیر عمارت کی پندرھویں منزل میں ویلڈنگ پلانٹ پر کام کرنے کی مزدوری ملی تھی۔ میں اور رفیق صبح سویرے اپنے اپنے کاموں پر نکل جاتے اور رات گئے واپسی ہوتی تو عام طور پر دونوں ہی تھکن سے اس قدر چُور ہوتے کہ بات کرنا بھی کسی بھاری بوجھ اٹھانے کے مانند لگتا۔ مہینے بھر بعد جب مجھے میری پہلی تن خواہ ملی تو آنکھوں سے آنسو نکل آئے، اپنے ملک کی سال بھر کی کمائی سے بھی کچھ زیادہ روپے میرے مُٹھی میں بند تھے۔ مگر سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں ان پیسوں کا کروں گا کیا۔ اُس روز رفیق کو بھی تن خواہ ملی تھی، لہٰذا شام کو اسی خوشی میں وہ مجھے دبئی دکھانے کے لیے اپنے مالک کی گاڑی مانگ لایا۔ دبئی کی ڈھلتی شام میں تبدیل ہوتی رات، رنگ اور نور کی برسات، ہر چہرہ دُھلا ہوا، ہر عمارت جگمگاتی سی، چمکتے رستے اور خوشیوں سے سرشار جوڑے، بانہوں میں بانہیں ڈالے، اس دل رُبا شہر کی ایک اور شام سے زندگی کے جام کشید کرتے خوش نصیب لوگ۔ زندگی صرف سانس لینے کا نام نہیں، اس بات کا احساس مجھے اُس شام ہوا، ہر سانس سے زندگی نچوڑ لینے کو جینا کہتے ہیں، اور ”ہم جیسے مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں۔“ رفیق نے مجھے یوں گم صم بیٹھے دیکھا، تو چپ نہ رہ سکا۔ ”کیا بات ہے شہزادے...... کہاں کھو گئے ہو؟ شہر کی رونقیں دیکھو۔“ میں نے فوراً چڑ کر کہا۔ ”ایک تو تم

مجھے شہزادہ نہ کہا کرو، مجھے لگتا ہے، باقی سب کی طرح تم بھی میرا مذاق اڑا رہے ہو۔“ رفیق نے مجھے غور سے دیکھا۔ ”تم تو واقعی بُرا مان گئے۔ اچھا چلو، میں تمہارا دل بہلانے کے لیے دبئی کے سب سے بڑے کلب لیے چلتا ہوں۔ ویسے تو وہاں کا داخلہ ٹکٹ ہی ہم دونوں کی سال بھر کی کمائی سے زیادہ کا ہے، مگر میرے مالک کی وجہ سے ہم سے کوئی ٹکٹ کا نہیں پوچھے گا۔“ میں نے حیرت سے رفیق کو دیکھا۔ ”کیوں، تمہارے مالک کی جان پہچان ہے کلب والوں سے؟“ رفیق زور سے ہنس پڑا۔ ”ارے نہیں، وہ کلب بھی میرے مالک ہی کا ہے۔ نہ صرف یہ کلب بلکہ ایسے نہ جانے کتنے کلب اور ہوٹلز ہیں میرے مالک کی کمپنی کے پاس۔ کوئی حساب نہیں ہے، اس کی دولت کا۔ کہتے ہیں کہ آج اگر وہ اپنا ہر کام اور کاروبار بند کر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بھی بیٹھ جائے اور آئندہ ساری زندگی روزانہ لاکھوں درہم اُڑاتا رہے، تب بھی اس کی نسلیں تاقیامت عیش کرتی رہیں گی۔“ رفیق اپنے مالک کے بارے میں بتاتا رہا اور گاڑی ساحل کے کنارے دوڑتی ایک عظیم الشان کلب میں داخل ہو گئی۔ میرے لیے یہ سب کچھ ایک طلسم جیسا تھا، کئی منزلہ عمارت کے لیے ہر منزل پر کار پارکنگ بنائی گئی تھی اور ہر منزل کسی الگ کھیل یا تفریح کے لیے مخصوص تھی۔ عمارت کی لابی اور اندرونی حصّوں کو جدید اور خود کار لفٹس کے ذریعے آپس میں جوڑا گیا تھا، عمارت کے اندر ہی ہوٹل، ریستوران، سوئمنگ پول، گالف اور اسنوکر کلبز، شاپنگ پلازا، سنیما، تھیٹرز، جوئے خانے، بار، رقص گاہیں، کیفے اور نہ جانے کیا کیا کچھ آباد تھا۔ کلب کیا تھا، پورا ایک شہر تھا، جسے پچاس منزلہ عمارت میں سمو دیا گیا تھا۔ چھت پر فلکی نظام اور مختلف سیاروں اور ستاروں کو دیکھنے والا ایک پورا ہال بنایا گیا تھا، جہاں بڑی بڑی دیوہیکل دُوربینوں کے ذریعے چاند ستاروں کا معائنہ کیا جا سکتا تھا، کلب میں نوجوان جوڑوں کی بہتات تھی، پب اور بار اتنے پُر ہجوم کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی، جوئے خانوں اور بڑے کیسینو کے باہر انتظار کرنے والوں کی لمبی قطاریں ہاتھ میں ٹوکن لیے کھڑی تھیں۔ میں نے رفیق سے جب اپنی اس حیرت کا اظہار کیا کہ یہ کلب تو کسی طور ایک اسلامی ملک کا حصّہ نہیں لگ رہا تو رفیق نے حسبِ معمول ایک جان دار قہقہہ لگایا اور سر جھٹک کر بولا۔ ”اسلامی ملکوں میں کلب نہیں ہوا کرتے۔ دبئی ایک الگ ہی شہر ہے۔ یہاں تمہیں ہر مذہب کا پیروکار ملے گا۔ اب یہ اُس پیروکار کی مرضی ہے کہ وہ اپنے مذہب کو کس حد تک برتتا ہے۔ عابدوں اور زاہدوں کے لیے مسجدیں کُھلی ہیں اور رندوں کے لیے شراب خانے، وہ کہتے ہیں ناں۔ ”رند کے رند رہے، ہاتھ سے جنّت نہ گئی۔“ تو بس وہی معاملہ یہاں بھی ہے۔“ کلب کی ہر منزل پر حُسن کے جلوے اس کثرت سے بکھرے تھے کہ انہیں اپنی محدود بصارت میں سمیٹنا کسی بھی انسان کے لیے ناممکن تھا۔ رفیق مجھے کیسینو کے اندر لے گیا اور میں وہاں پیسے کی ریل پیل دیکھ کر چکرا ہی تو گیا۔ مذہب انسان کو جس چیز سے منع کرتا ہے، جانے اُسی عمل میں انسان کو اتنی کشش کیوں محسوس ہوتی ہے؟ شاید گناہ اور ثواب کا بنیادی فلسفہ ہی یہی ہے اور اسی جبر پر سزا و جزا کا دار و مدار۔ مگر فی الحال تو اس کلب میں لوگ پانسے پھینک رہے تھے اور قمار بازی کے نشے میں مسحور سزا اور جزا کا ہر فلسفہ بُھلا کر بس ان لمحوں کو جی رہے تھے، جو انہیں میسّر تھے۔ مسئلہ تو مجھ جیسوں کا تھا، جو گناہ کرتے وقت ثواب کی طرح کنجوسی کر جاتے ہیں اور کارِ ثواب بھی ڈر ڈر کر کسی گناہ کی طرح کرتے ہیں۔

ہم کیسینو سے باہر نکل رہے تھے کہ اچانک کلب میں ایک ہل چل سی مچ گئی۔ سارا عملہ ایک دم چاق چوبند ہو گیا اور محافظوں کی دوڑیں لگ گئیں، پتا چلا کہ کلب کا مالک اور رفیق کا آقا بہروز کریم وہاں آ چکا ہے۔ میں بھی رفیق اور باقی سارے نوکروں کے ساتھ ایک جانب قطار میں کھڑا ہو گیا۔ بہروز ہال میں داخل ہوا تو چاروں طرف سناٹا سا چھا گیا۔ وہ ڈھلتی عمر کا ایک نفیس سا شخص تھا۔ مغربی لباس میں ملبوس، ہاتھ میں ہوانا کا قیمتی سگار، ہیرے سے جڑی ٹائی پن اور کف لنکس، امریکی ڈیزائنر سوٹ اور میچنگ جوتے، آنکھوں میں ایک عجیب سی وحشت اور اُداسی، کھویا کھویا سا وہ شخص واقعی کسی عظیم سلطنت کا

سلطان ہی لگ رہا تھا۔ جیسے دولت ہر کسی کو راس نہیں آتی، ویسے ہی امیری بھی ہر کسی کے ساتھ نہیں جچتی، میں نے بہت سے امیروں کو فقیروں سے بدتر شخصیت لیے پھرتے دیکھا تھا، مگر بہروز کریم پر امارت ٹوٹ کر برستی محسوس ہو رہی تھی، اس کے ارد گرد اسٹاف، منیجرز اور محافظوں کا ایک ہجوم تھا، مگر پھر بھی وہ کلب کے نوکروں کے سلام کا جواب خندہ پیشانی سے دیتے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ رفیق نے مجھے بتایا کہ جس رات بہروز اپنے کسی ہوٹل یا کلب کا دورہ کرتا ہے، وہ رات وہاں کے عملے کے لیے شب برأت بن جاتی ہے، کیوں کہ اس رات ان سب کو ایک ماہ کی تن خواہ کے برابر بونس ملتا ہے اور اس مخصوص کلب کی ہر منزل پر موجود بھی افراد بہروز کے مہمانوں کے طور پر برتے جاتے ہیں، ان کا ہر بل، ہر خرچہ بہروز کی طرف سے ادا کیا جاتا ہے۔ گویا بھی کے لیے دعوتِ عام ہوتی ہے۔ میں حیرت سے رفیق کی یہ ساری رام کہانی منہ کھولے سُن رہا تھا کہ اچانک بہروز ہمارے قریب سے گزرا تو رفیق نے جلدی سے اسے سلام کیا۔ بہروز نے مسکرا کر جواب دیا تو رفیق نے موقع غنیمت جان کر تیزی سے میرا ہاتھ پکڑ کے، کھینچ کر قطار میں آگے کر دیا۔ ''یہ میرا دوست پُری زاد ہے مالک...... کچھ دن پہلے ہی پاکستان سے آیا ہے یہاں مزدوری کے لیے۔ اس کا سلام بھی قبول کیجیے۔'' بہروز نے مُسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ''کیا نام بتایا تم نے......؟'' میں چپ رہا، رفیق نے جلدی سے میرا نام دہرایا۔ ''پُری زاد مالک۔'' بہروز کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ ''خوب، اسے کام نہ ملے تو فیکٹری کے منیجر مصطفیٰ کے پاس بھیج دینا۔'' بہروز مختصر سی بات کر کے آگے بڑھ گیا اور میں حیرت سے رفیق کو دیکھتا رہا۔ ''تمہارا مالک تو اردو بول لیتا ہے۔'' رفیق نے ہنس کر جواب دیا۔ ''دبئی میں سبھی عربی نہیں بولتے۔ میرے مالک ہندوستانی مسلمان ہیں۔ تقسیم کے بعد ان کے والدین یہاں دبئی آ کر بس گئے تھے، ہم پاکستانی اور ہندوستانی نوکروں سے وہ اردو میں بات کرتے ہیں۔''

کلب سے واپسی پر رفیق مجھے بہروز کریم کی کام یابیوں کی داستانیں سُناتا رہا کہ کیسے کام یابی کی سیڑھیاں طے کرتے کرتے آج وہ دبئی کے بزنس ورلڈ کے آسمان کا تارہ بن چکا ہے۔ بہروز کریم کی اس افسانوی کام یابی سے متعلق بہت سی پُراسرار کہانیاں بھی مشہور تھیں، مثلاً یہ کہ وہ اپنے دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتا اور اس کے اس وجیہہ چہرے کے پیچھے ایک سفاک شخص چُھپا ہوا ہے، جو اپنی کام یابی کی راہ میں آنے والی ہر شے کو تہس نہس کر دیتا ہے۔ رفیق، بہروز کے بارے میں بولتے بولتے اچانک اسٹیئرنگ پر ہاتھ مار کر زور سے ہنس پڑا۔ ''دیکھ لو پُری زادے پیارے...... تمہیں جس نام سے اتنی چڑ ہے، آج وہی نام میرے مالک سے تمہارے تعارف کا سبب بن گیا۔ ورنہ بہروز صاحب نے آج تک کسی کا نام پلٹ کر دوبارہ نہیں پوچھا۔ وہ کہتے ہیں ناں...... خدا نے دنیا میں ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کا بھی کوئی مقصد ضرور رکھا ہے، تو بھائی مجھے تو تمہارے نام کا مقصد آج صاف نظر آ رہا ہے۔'' گھر پہنچنے کے بعد بھی ساری رات میں بہروز کریم کے بارے میں سوچتا رہا۔ کوئی انسان آخر اتنی بے تحاشا دولت کا کیا کرتا ہوگا۔ دولت مندوں کے دن بھی تو ہم غریبوں کی طرح چوبیس گھنٹے ہی کے ہوتے ہیں۔ وہ بھی ہماری طرح سوتے جاگتے ہیں، تو پھر باقی بچے ہوئے چند گھنٹوں کے لیے کسی کے پاس قارون کا خزانہ اور کسی کے ہاتھ خالی کشکول کیوں ہوتا ہے۔

اگلے دن رفیق مجھے فیکٹری ایریا میں لے گیا۔ منیجر مصطفیٰ ایک سخت گیر اور اکھڑ مزاج مصری تھا۔ جو سوائے کام کی بات کے، دوسری کوئی بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے رفیق کو سر سے پیر تک گھورا اور عربی میں کچھ کہا۔ اتنے سالوں میں یہاں رہتے رہتے رفیق کی عربی بھی کافی رواں ہو چکی تھی۔ رفیق نے عربی ہی میں میری طرف اشارہ کر کے کچھ کہا۔ مصطفیٰ نے میرے کاغذات طلب کیے اور پانچ منٹ بعد ہی ہم اس کے کمرے کے باہر کھڑے تھے۔ رفیق نے میرے کاندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ''چل پیارے...... تیرا کام تو بن گیا۔ یہ منیجر تھوڑا سا ٹیڑھا آدمی ہے، مگر ہے مالک کا خاص بندہ۔ اب یہ تمہارے سارے انتظامات یوں چٹکی بجاتے میں کر دے گا۔ میں نے اسے مالک کا حکم پہنچا دیا ہے۔'' اس دن مجھے ایک اور بات پتا چلی کہ بہروز کریم کی سلطنت میں تو سیکڑوں ایسی گاڑیاں ہیں، جیسی ایک رفیق چلاتا ہے۔ خوش قسمتی سے رفیق کچھ عرصے تک بہروز کریم کے ذاتی دفتر کی گاڑی چلاتا رہا تھا، اس لیے بہروز کو رفیق کا چہرہ یاد رہ گیا ہوگا۔ پانچ روز بعد، رفیق نے مصطفیٰ کا دستخط شدہ، فیکٹری کا ایک حکم نامہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ مجھے خاصی معقول تن خواہ پر فیکٹری کی رات کی شفٹ میں کام پر لگا دیا گیا تھا۔ کام کچھ مشکل نہیں تھا۔ بس لوہے اور دیگر خام مال کا کمپیوٹر میں اندراج کرنا اور سپلائی کے وقت چارٹ بنانا تھا۔ میں رات بھر فیکٹری میں ڈیوٹی دے کر صبح گھر واپس پہنچتا تو رفیق جانے کی تیاری میں ہوتا۔ ہم ایک ساتھ چائے کا ایک ایک کپ حلق سے نیچے انڈیلتے اور مَیں سونے کے لیے اپنے کمرے کی جانب بڑھ جاتا۔ میری راتیں جاگنے اور دن سونے لگے تھے، اُن دنوں مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا کہ رات کو انسان کی شخصیت یک سر بدل جاتی ہے، دن کا اُجالا ہماری بہت سی ان دیکھی صلاحیتوں کو خوابیدہ کر دیتا ہے، جب کہ شام ڈھلنے کے بعد ہم زیادہ رومان پرور، شفاف اور کسی حد تک نڈر بھی ہو جاتے ہیں یا شاید مختلف شخصیات پر اس دن اور رات کے بھید کا کچھ مختلف اثر ہوتا ہوگا۔

مَیں فیکٹری میں اپنا کام رات کے پہلے پہر ہی میں مکمل کر لیتا تھا۔ پھر میں ہوتا اور صحرا کا تاروں بھرا آسمان، جو رات بھر مجھ سے باتیں کرتا۔ میں گھر سے آئے خطوں کا جواب نہیں دیتا تھا، البتہ ہر ماہ ایک معقول رقم انہیں ضرور بھیج دیتا تھا۔ اس رات بھی میں گھر سے آیا ایک خط دیکھ رہا تھا کہ فیکٹری کے پچھلے حصّے میں کچھ کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں۔ مَیں تیزی سے پیچھے کی جانب لپکا۔ چند پرانے مزدور کچھ لوہے کی پٹیاں ایک گودام میں سنبھال کر رکھ رہے تھے۔ میں نے ان سے تفصیل پوچھنا چاہی تو فورمین نے مجھے جھڑک دیا۔ مگر مَیں خاموش بیٹھنے والا نہیں تھا۔ میں نے تنبیہ کی کہ اگر انہوں نے مجھے تفصیل نہ بتائی، تو مَیں صبح ہوتے ہی منیجر مصطفیٰ کو اطلاع دے دوں گا۔ اتنے میں پیچھے سے مصطفیٰ کی آواز آئی۔ ''مَیں یہیں ہوں...... تمہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں، اور آج تو تمہارا آف تھا۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' سچ تو یہ ہے کہ مصطفیٰ کو وہاں دیکھ کر میں پریشان ہو گیا تھا۔ آج واقعی میری چھٹی تھی۔ مگر ایک ساتھی کے بیمار ہونے کی وجہ سے مجھے اچانک ڈیوٹی پر آنا پڑا۔ میں نے مصطفیٰ کو بتایا کہ شفٹ انچارج کے طور پر یہ میری ڈیوٹی ہے کہ میں ہر چیز کا باقاعدہ اندراج کروں۔ مصطفیٰ نے میری بات لاپروائی سے ٹال دی۔ ''ٹھیک ہے، تم نے اپنا فرض پورا کیا۔ اب تمہارے انچارج کی حیثیت سے میں تمہیں حکم دے رہا ہوں کہ تم واپس اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ جاؤ اور خاموشی سے اپنی شفٹ ختم کر کے چُپ چاپ واپس گھر چلے جاؤ۔'' مصطفیٰ کی آواز کھردری اور لہجہ بہت سخت تھا۔ میں نے اُس وقت ان سب سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مگر میں نے سوچ لیا تھا کہ کسی بھی طرح بہروز کریم تک یہ اطلاع ضرور پہنچاؤں گا۔ چاہے اس کا انجام کچھ بھی ہو۔ بہروز ہفتے میں ایک آدھ بار اس فیکٹری کا دورہ بھی کرتا تھا اور پھر چھٹی رات جب میں نے احاطے کے باہر بہروز کریم کے اسکواڈ کی گاڑیوں کو رکتے دیکھا، تو تیزی سے ہال کے گیٹ پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ مصطفیٰ بھی بہروز کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اسے کام کے بارے میں کچھ تفصیلات بتا رہا تھا۔ مجھے راستے میں کھڑے دیکھ کر مصطفیٰ کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔ جب وہ لوگ راہ داری میں میرے قریب سے گزرے تو میں نے اچانک آگے بڑھ کر بہروز کریم کو براہِ راست مخاطب کر کے کہا۔ ''مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے سر!......'' بہروز نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔

(جاری ہے)



ہاشم ندیم.......

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، مُلک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ’’خدا اور محبت‘‘ اور ’’بچپن کا دسمبر‘‘ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ’’عبداللہ‘‘ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ’’عبداللہ‘‘ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

’’پری زاد‘‘ ایک اچھوتے، حسّاس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ’’سنڈے میگزین‘‘ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

مصطفیٰ نے مجھے بُری طرح جھاڑ دیا۔ ’’تمہیں کسی نے بتایا نہیں کہ مالک بہروز کو آج تک کسی نے یوں بیچ راستے میں نہیں روکا، میں تمہیں اسی وقت نوکری سے فارغ کرتا ہوں۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے، کل آکر مہینے بھر کی تنخواہ لے جانا۔‘‘ میں نے اطمینان سے مصطفیٰ کی بات سُنی۔ ’’ٹھیک ہے، میں چلا جاؤں گا۔ مگر مجھے ایک بار مالک سے بات کرنی ہے، یہ بہت ضروری ہے۔‘‘ آس پاس کا عملہ وحشت زدہ سا مجھے یوں گھور رہا تھا، جیسے مجھ سے بڑا احمق انہوں نے اس روئے زمین پر پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ بہروز نے اطمینان سے اپنا سگار سلگایا۔ ’’ہاں بولو لڑکے...... اگر تمہیں پیسے وغیرہ چاہئیں، تو تم نے واقعی میرا بہت وقت ضائع کیا، اکاؤنٹس والوں سے لے لو۔‘‘ میں نے جلدی سے واضح کیا۔ ’’نہیں جناب...... مجھے پیسے نہیں چاہئیں، میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ یہاں اس فیکٹری سے کچھ ایسی ترسیلات بھی ہوتی ہیں، جن کا ریکارڈ نہیں رکھا جاتا۔ میں نے کوشش کی تو مجھے بھی منع کر دیا گیا۔‘‘ میری بات سُن کر مصطفیٰ نے ڈانٹ کر کچھ کہنے کی کوشش کی، مگر بہروز نے ہاتھ اٹھا کر اسے منع کر دیا اور اپنے خاص محافظ فیروز سے کہا۔ ’’فیروز خان کچھ دیر بعد اس لڑکے کو میرے دفتر لے آؤ۔‘‘ بہروز حسبِ معمول مختصر سی بات کر کے وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ فیروز نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اسے بہروز کے بہت قریب سمجھا جاتا تھا اور وہی بہروز کا محافظِ خاص بھی تھا۔ اس کے علاوہ بہروز کسی دوسرے باڈی گارڈ پر اتنا بھروسا نہیں کرتا تھا۔ فیروز خان ہی اس کی خواب گاہ کے باہر بھی پہرہ دیتا تھا۔ یہ سب کچھ مجھے رفیق پہلے ہی بتا چکا تھا۔ میں نے جب بھی فیروز کو دیکھا، اسے خاموش ہی پایا، شاید اسے بھی اپنے مالک بہروز کریم کی طرح زیادہ بات کرنے کی عادت نہیں تھی۔ رات کی شفٹ کے تمام ملازم فیروز کے ایک اشارے پر دوبارہ اپنے اپنے کام میں جُت گئے۔ کچھ دیر بعد چپڑاسی نے آکر فیروز کو بتایا کہ مالک مجھے طلب کر رہے ہیں۔ فیروز نے مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور ہم دونوں بہروز کے جہازی سائز، عالی شان دفتر میں داخل ہوگئے۔ مصطفیٰ بھی کمرے میں موجود تھا، جانے اس نے میرے بارے میں مالک کو کیا بتایا ہوگا۔ بہروز کریم کے چہرے پر حسبِ معمول سپاٹ سا تاثر تھا، اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ’’تم تو وہی ہو ناں، جسے رفیق نے بھرتی کروایا تھا؟ ہاں کہو، کیا کہنا چاہتے ہو......؟‘‘ میں نے اس رات کا پورا قصّہ بہروز کو سُنا دیا۔ وہ اطمینان سے بیٹھا سگار کے کش لیتا میری بات سُنتا رہا۔ میری بات ختم ہوئی، تو اس نے ایک گہرا کش لے کر میری طرف غور سے دیکھا۔ ’’تم جانتے ہو کہ اگر تمہارا لگایا ہوا یہ الزام غلط ثابت ہوا تو نہ صرف تمہاری نوکری جائے گی بلکہ تمہیں غلط بیانی کے الزام میں پولیس کے حوالے بھی کیا جا سکتا ہے۔‘‘ ’’جی...... میں جانتا ہوں، آپ اپنے طور پر تصدیق بھی کروا سکتے ہیں۔‘‘ بہروز کریم نے پلٹ کر اپنے عقب میں مؤدب کھڑے مصطفیٰ سے براہ راست پوچھا۔ ’’کیوں مصطفیٰ! کیا یہ لڑکا سچ کہہ رہا ہے؟‘‘ مصطفیٰ نے ایک لمحہ توقف کر کے میری طرف دیکھا اور پھر دھیرے سے بولا۔ ’’جی مالک...... یہ سچ کہہ رہا ہے۔‘‘ میں نے چونک کر مصطفیٰ کی طرف دیکھا، اس کا جواب میری توقع کے بالکل برعکس تھا اور اس سے بھی زیادہ حیرت بہروز کریم کا ردِعمل دیکھ کر ہوئی۔ اس نے اطمینان سے سگار کا ایک اور لمبا کش لیا اور مصطفیٰ سے کہا۔ ’’ٹھیک ہے مصطفیٰ جاتے ہوئے میرے لیے ایک کپ بلیک کافی کا کہتے جانا۔‘‘ بہروز کو میرا خیال آیا ’’لڑکے، تم کافی پیو گے......؟‘‘ میں نے جلدی سے انکار میں سر ہلایا۔ مصطفیٰ کمرے سے جا چکا تھا۔ میں نے بھی واپسی کے لیے دروازے کا رخ کیا کہ بہروز نے مجھے آواز دے کر روک لیا۔ ’’مصطفیٰ میرا خاص آدمی ہے۔ میرے وفاداروں میں سے ایک قریبی وفادار، لیکن مجھے اچھا لگا کہ ابھی وفاداری کی یہ نایاب صنف دنیا سے بالکل ہی ناپید نہیں ہوئی۔ تم نے اپنی نوکری کی پروا کیے بنا اپنی وفاداری نبھائی۔ میرے ذہن سے تمہارا نام نکل گیا۔ بڑا منفرد سا نام تھا......؟‘‘ بہروز نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ میں نے دھیرے سے اپنا نام دہرا دیا۔ ’’پَری زاد‘‘ بہروز مسکرایا ’’ہاں...... پَری زاد! میں نے اس دن بھی محسوس کیا تھا کہ تمہیں اپنا نام کچھ خاص پسند نہیں، تو پھر تم یہ نام بدل کیوں نہیں لیتے......؟‘‘ میں نے بہروز کی طرف دیکھا۔ ’’نام بدلنے سے قسمت تو نہیں بدل جائے گی مالک...... ویسے بھی یہ نام مجھے میری اوقات یاد دلاتا رہتا ہے۔‘‘ بہروز نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ’’مرد کو اتنا حسّاس نہیں ہونا چاہیے۔ دبئی کس لیے آئے ہو؟‘‘ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ’’بہت سا پیسا کمانے...... آپ کی طرح بہت بڑا آدمی بننے۔‘‘ بہروز کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ لمحے بھر کو جھلک دکھا کر غائب ہوگئی۔ ’’بڑا آدمی......؟ جانتے ہو لڑکے، یہ میری طرح کے جو بڑے لوگ تمہیں دولت اور ترقی کے آسمان پر چمکتے نظر آتے ہیں، ان سب کو بھی زندگی میں ایک نہ ایک بار تمہاری طرح ایک رات کسی غیر قانونی ترسیل کا پتا چلا ہوتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ وہ اس کی خبر دینے کے بجائے، اس آلودہ نظام کا حصّہ بننے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔‘‘ بہروز کریم اپنی بات ختم کر کے کھڑا ہو گیا اور

باہر جاتے ہوئے لمحے بھر کے لیے میرے پاس رُکا۔ ''گھر جانے سے پہلے اکاؤنٹنٹ سے ملتے جانا......'' میں اپنی جگہ گم صم سا کھڑا رہ گیا اور بہروز کمرے سے نکل گیا۔ صبح چُھٹی سے پہلے فیکٹری کا اکاؤنٹنٹ میرے پاس آیا اور ایک نوٹوں سے بھرا لفافہ میرے ہاتھ میں تھما گیا۔ اُس روز مجھے پہلی بار پتا چلا کہ بہروز کریم کی اس سلطنت کا اصل دارومدار کچھ ایسے ہی غیر قانونی دھندوں پر ہے، جن کی خبر باہر والوں کو نہیں۔

رفیق کو جب اس سارے معاملے کا پتا چلا تو وہ مجھ پر بُری طرح برس پڑا کہ آخر مجھے ان کے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے مجھے خبردار کیا کہ ایک بار تو بہروز نے مجھے معاف کردیا، مگر دوبارہ اگر کبھی ایسا کچھ ہوا، تو وہ میرے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتے گا۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے دوسرے عملے کے برعکس بہروز کریم سے بالکل بھی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اگلے ہفتے میری ڈیوٹی رات کے بجائے دن کی شفٹ سے تبدیل کردی گئی۔ مصطفیٰ سے اب بھی میرا گاہے بگاہے سامنا ہوتا رہتا، مگر اب اس کے لہجے اور تیور میں وہ پہلے جیسی سختی نہیں رہی تھی۔ اور پھر کچھ دن گزرنے کے بعد ایک شام جب میں فیکٹری سے باہر نکلنے سے پہلے اپنے برقی کارڈ کے ذریعے واپسی کا وقت نوٹ کروا رہا تھا، تب اچانک رات کی شفٹ والے کارکن نے مجھے مصطفیٰ کا پیغام دیا کہ اس نے مجھے مل کر جانے کو کہا ہے۔ میں وہیں گیٹ کے قریب ایک شیڈ کے نیچے مصطفیٰ کا انتظار کرنے لگا۔ مغرب کے بعد مصطفیٰ اپنے محافظوں کے ساتھ وہاں پہنچا اور گاڑی سے اترتے ہی مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ اندر کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس نے مجھے کنڈی لگانے کا اشارہ کیا اور اپنے مخصوص کرخت لہجے میں بولا۔ ''جتنا کما رہے ہو، اس پر اکتفا کرنا چاہتے ہو یا پھر کم وقت میں کچھ زیادہ بنانے کی ہمت رکھتے ہو......؟'' میرا جواب بہت سیدھا تھا۔ ''میرے پاس کھونے کے لیے کچھ خاص نہیں اور میں اپنی ہمت آزمانا چاہتا ہوں۔'' مصطفیٰ نے لمبی بات نہیں کی۔ بس اتنا کہا کہ رات کو ساحل پر کچھ لانچوں پر سامان آئے گا۔ مجھے وہ سامان وصول کرکے بہروز کی ایک دوسری فیکٹری کے گودام تک پہنچانا ہوگا۔ اس کام میں میرے ساتھ چند دوسرے معاون مع چار گاڑیوں اور ڈرائیورز موجود ہوں گے۔ میں نے زیادہ تفصیل میں جائے بنا ہامی بھرلی۔ مصطفیٰ نے میرا کاندھا تھپتھپایا۔ ''کام مشکل ہے، مگر یاد رکھو، کام یابی ہمیشہ بہادر کا ساتھ دیتی ہے۔ تمہیں یہ سب کچھ قانون کی نظر سے بچ کر کرنا ہوگا اور گرفتاری کی صورت میں تمہارا مالک سے کوئی تعلق ظاہر نہیں ہونا چاہیے۔ امید ہے تم سمجھ گئے ہوگے۔'' میں نے سرہلایا ''آپ بےفکر رہیں، میری زبان ہمیشہ بند رہے گی۔''

رات ڈھلتے ہی ہم آٹھ لوگ چار بڑی جیپوں میں سوار دُور دراز کے ایک ویران ساحل پر پہنچ گئے۔ سمندر خاموش اور آسمان تاریک تھا۔ ہم سب اندھیرے میں ایک بڑی چٹان کی اوٹ میں گاڑیاں کھڑی کرکے لانچوں کا انتظار کرنے لگے۔ میرے لیے وہ سات کارندے بالکل اجنبی تھے اور ہم میں سے کوئی بھی آپس میں بات نہیں کر رہا تھا۔ دُور کہیں سمندر میں لنگر انداز جہاز سے موسیقی اور نوجوان جوڑوں کے گانے بجانے کی آوازیں ہوا کے دوش پر چند لمحوں کے لیے فضا میں بکھر جاتیں اور پھر وہی طویل سناٹا ہمیں گھیر لیتا۔ آج 14 فروری کا دن تھا، جسے ساری دنیا میں محبت کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ جب میں فلیٹ سے نکل کر ڈیوٹی کے لیے فیکٹری کی طرف آرہا تھا تو میں نے دبئی کے در و دیوار، بازار اور سڑکوں کو سرخ اور سفید رنگ کے غباروں اور پھولوں سے اٹے دیکھا تھا، نوجوان لڑکیاں سُرخ لباس میں اِدھر اُدھر رنگ برنگی تتلیوں کی طرح اڑتی پھر رہی تھیں اور نوجوان سیاہ لباس کے ساتھ گلے میں سرخ اسکارف یا ٹائی پہنے محبت کا دن منانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ شاید سمندر میں لنگر انداز جہاز میں بھی ویلنٹائن کی پارٹی جاری تھی۔ کاش! دنیا میں بدصورت لوگوں کا بھی کوئی ویلنٹائن ڈے منایا جاتا۔ یہ ہر تقریب اور تہوار جو محبت سے منسوب ہے، اس پر صرف خُوب صورت لوگوں ہی کا قبضہ کیوں جما رہتا ہے۔ اگر خوب صورت لوگ محبت کا دن مناتے ہیں، تو ہم جیسوں کو بھی کوئی نفرت کا دن منانے کی اجازت ہونی چاہیے، کچھ تو ایسا ہو، جو ہم سے بھی منسوب ہو۔ میں جانے کن الٹی سیدھی سوچوں کے بھنور میں گھرا تھا کہ اچانک دور سے چند لانچوں کی مخصوص جلتی بجھتی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ شاید یہ کوئی سگنل یا خاص اشارہ تھا، جو پہلے سے ساحل والوں کے لیے طے شدہ تھا۔ ہم سب ہوشیار ہوگئے۔ میری گاڑی کے ڈرائیور نے ڈیش بورڈ کھول کر اس میں سے پسٹل نکال کر میرے حوالے کردیا۔ میں اسے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ مجھے اس کا استعمال نہیں آتا۔ کچھ دیر میں لانچیں ساحل کے قریب آگئیں اور ہم سب گاڑیوں سے اتر کر لانچوں کی طرف بڑھے۔ لانچیں ساحل سے لگ چکی تھیں اور ہم ابھی چند قدم کے فاصلے پر تھے کہ اچانک ساحل کا وہ ویران حصّہ بڑی بڑی دیوہیکل سرچ لائٹس کی روشنیوں میں جگمگا سا گیا اور ہم سب پَل بھر میں اس تیز روشنی میں نہا گئے۔ کوئی لاؤڈ اسپیکر پر زور سے انگریزی میں چلّایا۔ ''کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش نہ کرے، تم سب کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔'' مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ یہ سب ہو کیا رہا ہے، پھر ہمارے ساتھیوں میں سے کوئی چلّایا۔ ''بھاگو'' اور اس کے ساتھ ہی ہماری طرف سے تین چار فائر ہوئے اور سرچ لائٹس چھناکے سے ٹوٹ گئیں۔ ایک بھگدڑ سی مچ گئی، تیز روشنی کے بعد ایک دم چھا جانے والا اندھیرا عام اندھیرے سے زیادہ سیاہ اور گہرا ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم سب اندھیرے میں گرتے پڑتے اپنی گاڑیوں کی طرف بھاگے، مگر مجھے راستے میں ایک ٹھوکر لگی اور اگلے ہی لمحے میں گیلی ریت پر اوندھے منہ گرا ہوا تھا۔ لوہے کی ایک سرد نال میری کنپٹی سے ٹکرائی اور کسی نے پوری قوت سے میرے سر پر پستول کا دستہ مارا۔ اندھیرے کا طوفان میری آنکھوں کی پُتلیوں سے ہوتا دماغ کی رگوں میں اتر گیا اور میرے وجود پر موت جیسا سکوت طاری ہوگیا۔ بے ہوشی، شاید نیند کی انتہا ہے اور نیند موت کا ایک چھوٹا وقفہ ہوتی ہے۔

میں بھی کسی ایسے ہی وقفے کے درمیان موت کی صلیب پر لٹک رہا تھا، جب شدید ٹھنڈے پانی کی ایک بوچھاڑ نے مجھے کھینچ کر اس صلیب سے نیچے اتار پھینکا۔ پانی کے دوسرے ریلے کے ساتھ ہی میں ایک جھٹکے سے واپس ہوش کی دنیا میں لوٹ آیا۔ میرے ہاتھ پاؤں کسی کھردری رسّی کے ساتھ اس قدر مضبوطی سے ایک کرسی کے ساتھ باندھے گئے تھے کہ مجھے وہ خاردار تار جیسی رسّی اپنے ہاتھوں کی کلائیوں اور پاؤں کے ٹخنوں میں کھبتی محسوس ہو رہی تھی۔

مجھے کرسی پر بٹھا کر میری گردن بھی رسّی سے لپیٹ کر کرسی کی پشت سے اس طرح کس کر باندھی گئی تھی کہ میری ذرا سی جنبش سے وہ رسّی گردن کے گوشت میں پیوست ہوتی جارہی تھی۔ وہ ایک اندھیرا سا کمرا شاید تہہ خانہ تھا۔ میں نے کچھ بولنے کی کوشش کی، مگر میری آواز میرے گلے ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔ کچھ دیر میں، میرے عقب میں چند لوگوں کے قدموں کی آہٹ ہوئی اور کسی نے سامنے آکر میرے چہرے پر ایک زوردار طمانچہ رسید کیا اور عربی میں چلّا کر کچھ پوچھا۔ پھر میرے جواب دینے سے پہلے ہی دوسرا طمانچہ گال پر اپنے نشان ثبت کر گیا۔ میں نے چلّا کر کہا کہ میں عربی نہیں بول سکتا، لہٰذا وہ جو کوئی بھی ہیں، مجھ سے انگریزی میں بات کریں۔ اس بار وہ تینوں اندھیرے سے نکل کر سامنے آگئے۔ وہ شاید پولیس یا کوئی دوسرے قانون نافذ کرنے والے ادارے کے اہل کار تھے۔ اس بار انہوں نے رابطے کے لیے انگریزی کا سہارا لیا۔ ان کے سوال انتہائی مختصر اور انداز بڑا سفّا کانہ تھا۔ وہ چیخ چیخ کر مجھ سے پوچھتے رہے کہ میں کون ہوں، دبئی میں کب سے قیام پذیر ہوں اور میرا ان اسمگلرز سے کیا تعلق ہے اور یہ کہ میں کس کے لیے کام کرتا ہوں......؟ میرے پاس جواب میں سوائے خاموشی کے اور کچھ نہیں تھا اور پھر کوئی چارہ نہ پا کر انہوں نے دھیرے دھیرے اپنے ستم کا دائرۂ کار بڑھانا شروع کر دیا۔ میرے بدن کے ہر جوڑ کو لوہے کی ایک چھوٹی سی مخصوص ہتھوڑی سے اس طرح ٹھوکا گیا کہ ہر ضرب روح میں چھید کرتی محسوس ہورہی تھی۔ جسم کو جلتے سگریٹوں سے وقفے وقفے سے داغا جاتا رہا اور اس تمام عرصے میں مجھے پنجوں کے بل کھڑا کر کے میرے ہاتھ اسی کھردری رسّی سے چھت پر ایک کنڈے کے ساتھ باندھے رکھے گئے، اس طرح کہ میرے بازوؤں پر میرے جسم کا سارا بوجھ یوں پڑ تا رہے کہ میرے شانوں اور کہنیوں کے جوڑ کھل جائیں۔ وہ ہر بار تشدد کے وقفے میں دوبارہ اپنا سوال دہراتے کہ میں کس کے لیے کام کرتا ہوں؟ میں ہر دفعہ تکلیف اور اذیت کے سمندر سے گزرتے ہوئے ڈوب کر جب ہوش کی حد پار کر کے بے سدھ ہو جاتا تو مجھے یہی لگتا تھا کہ میری روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی ہے اور اب میں دوبارہ کبھی ہوش میں نہیں آؤں گا۔ مگر میرے ستم گر بہت تجربہ کار اور اپنے فن میں ماہر تھے۔ انہیں مجھے زندہ رکھنا آتا تھا اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان میں سے ایک نے تھک کر دوسرے دو جلّادوں سے کہا کہ اسے ڈر ہے کہ کہیں مَیں مر ہی نہ جاؤں، لہٰذا ہمیں اسے سلطانی گواہ بنا لینا چاہیے اور مجھ سے عدالتی اسٹامپ پیپر پر ایک معاہدہ کرلیا جائے کہ اگر میں انہیں اپنے گروہ یا مالک میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی اقبالی بیان دے دوں، تو وہ مجھے اگلے جہاز سے میرے ملک بنا کسی الزام کے ڈی پورٹ کردیں گے۔ مجھے وہاں قید ہونے کے بعد دو یا تین دن کا حساب تو یاد رہا تھا، مگر پھر اس کے بعد اذیت کی شدت سے میری بے ہوشی کے وقفے اتنے طویل ہونے لگے کہ مجھے دن اور رات کی ہر تمیز اور گنتی بھول چکی تھی۔ جانے میرے اندر درد برداشت کرنے کی اتنی سکت کب اور کیسے پیدا ہوگئی تھی۔ شاید ساری عُمر زبان کے گھاؤ سہتے سہتے، روح کو بھی اذیت سہنے کی اس قدر عادت ہوگئی تھی کہ جسم پر ہر لمحہ لگتے یہ گھاؤ اور داغ ان روح کے زخموں کے مقابلے میں مجھے بہت کم تر محسوس ہوتے تھے۔ وہ مجھے ہر طرح سے آزما چکے تو آخری حربے کے طور پر انہوں نے میرے ہاتھ اور پاؤں کے ناخن میری کھال سے نوچنے کے لیے خصوصی طور پر تیار کردہ اوزار منگوا لیے۔ ان میں سے ایک میرے ہاتھ کھولنے نیچے جھکا تو دوسرے نے بے زاری سے ایک لمبی انگڑائی لی کہ آدھی رات تو بیت ہی چکی ہے تو کیوں نا اس ''نیک کام'' کو اگلے روز صبح تک موٴخر کر دیا جائے۔ ویسے بھی میری حالت اس وقت تک اتنی ابتر ہو چکی تھی کہ شاید مجھے اپنے ماس سے ناخنوں کے علیحدہ ہونے کا پتا بھی نہ چلتا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ درد اور اذیت محسوس کرنے کے لیے بھی انسان کا اپنے حواس میں رہنا ضروری ہے۔ مجھے اُس روز دنیا کے ہر دیوانے اور خرد سے بیگانے شخص کی تقدیر پر ٹوٹ کر رشک آیا۔ نہ دنیا میں کسی درد کا جھمیلا اور نہ آخرت میں کسی عذاب کا ڈر۔ کاش! اس دیوانے پن کو اختیار کرنا بھی ہمارے اپنے بس میں ہوتا......

وہ لوگ جانے کس وقت تہہ خانے سے جا چکے تھے، مگر میرا ذہن ابھی تک کسی آزاد جنگلی اور وحشی گھوڑے کی طرح بے لگام دوڑ رہا تھا۔ دفعتاً مجھے یوں محسوس ہوا کہ میری پشت پر بندھے ہاتھوں کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑ رہی ہے، شاید کوئی ایک آدھ گرہ کھلی رہ گئی تھی۔ میں نے کرسی کو دو چار زوردار جھٹکے دینے کی کوشش کی تو منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ اذیت، درد اور تکلیف سے دریاؤں کے بند کھل سے گئے اور میرے جسم کے تمام مساموں سے درد یوں قطرہ قطرہ کرکے پھوٹ نکلا، جیسے شدید گرمی کی کڑی دوپہر میں پسینہ پھوٹتا ہے۔ کرسی ایک جانب لڑھک گئی اور میں اس کے ساتھ ہی بندھے ہاتھوں پیروں سمیت زمین پر اوندھے منہ گر گیا۔ کچھ دیر کے لیے تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا، جانے کتنی دیر بعد دوبارہ ہوش آیا تو محسوس ہوا کہ کرسی کی ہتھی ٹوٹ چکی

ہے اور ہاتھ پشت سے تقریباً کھل چکے ہیں۔ میں نے پوری قوت لگا کر ایک جھٹکے سے اپنے ہاتھ آزاد کروائے اور کانپتی، زخمی، خون سے سَنی انگلیوں کے ساتھ اپنے پیروں کی بندشیں بھی کھول ڈالیں۔ خود کو کسی نہ کسی طرح گھسیٹتے ہوئے سیڑھیوں تک جا پہنچا اور پھر، چاروں ہاتھوں پیروں کی مدد سے جانے کتنی صدیوں میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر تہہ خانے کے دروازے تک اپنے گھائل اور پور پور زخمی بدن کو پہنچایا۔ خوش قسمتی سے دروازہ ایک ہلکی سی کنڈی کی مدد سے باہر کی جانب سے بند تھا اور جب میں نے اپنے پورے جسم کے وزن کو دروازے پر دو چار مرتبہ دے مارا تو چٹخنی کھل گئی اور میں اپنے ہی زور پر، باہر کھلے ہال میں جا گرا۔ میری توقع کے برعکس وہ کوئی جیل یا دفتر کے بجائے ایک ویران سی نامکمل عمارت تھی، جس کے تہہ خانے میں مجھے قید رکھا گیا تھا۔ میں پوری قوت لگا کر لڑکھڑاتا ہوا کھڑا ہوگیا اور اس کوشش میں جانے کتنی بار زمین پر گرا۔ میرے قدم یوں جھولتے ہوئے زمین پر پڑ رہے تھے، جیسے ٹانگوں میں موجود ہر ہڈی کو پیس کر چکنا چُور کر دیا گیا ہو۔ کسی نہ کسی طرح میں زیرِ تعمیر ہال کے ڈھانچے سے باہر نکلا اور دُور صحن میں نظر آنے والے لوہے کے بڑے گیٹ کی طرف بڑھا۔ مَیں احاطے کی دیوار کا سہارا لے کر دھیرے دھیرے گیٹ کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اچانک صحن اور عمارت کا پورا احاطہ تیز روشنی سے جگمگا اٹھا۔ صرف اندھیرا ہی انسان کی بصارت نہیں چھینتا، کبھی کبھی روشنی کی چکا چوند بھی اندھا کر دیتی ہے۔ مَیں بھی چند لمحوں کے لیے نابینا سا ہوگیا اور پھر مجھے بہت سے سائے اپنی جانب دوڑتے نظر آئے، میں نے دیوانہ وار گیٹ سے باہر نکلنے کے لیے چھلانگ لگائی، مگر مجھے راستے ہی میں کسی نے دبوچ لیا اور میں اس طرح بے سدھ سا زمین پر گر گیا، جیسے سیکڑوں میل صحرا اور جنگل میں لگاتار دوڑنے والا کوئی گھوڑا شدید تھکن سے چُور ہو کر ہانپتے ہوئے آخری بار کبھی نہ اٹھنے کے لیے زمین پر گر جاتا ہے۔ میری پلکیں بوجھل ہو کر دھیرے دھیرے بند ہوتی گئیں۔ شاید میری موت آخر کار مجھے اپنی مہربان آغوش میں لینے کے لیے، پلکوں کے در پر اپنے سفید پنکھ پھیلائے آکھڑی ہوئی تھی۔ مجھے اس موت کی دیوی کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ ''پری زاد...... اٹھو...... چلو بہت دیر ہوگئی......'' میں نے غور سے آواز سُننے کی کوشش کی۔ ہاں، کوئی میرا نام پکار تو رہا تھا، مگر یہ آواز......؟ ہاں، میں اس آواز کو پہچانتا تھا۔ کوئی کسی سے کہہ رہا تھا ''اسے اب ہوش میں لاؤ...... یہ مجھے زندہ چاہیے......'' میرے ڈوبتے ذہن نے آواز پہچان لی...... یہ بہروز کریم کی آواز تھی۔ تو کیا مجھے بہروز کریم نے خود اغوا کروایا تھا؟

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ’’خدا اور محبت‘‘ اور ’’بچپن کا دسمبر‘‘ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ’’عبداللہ‘‘ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ’’عبداللہ‘‘ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

’’پری زاد‘‘ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ’’سنڈے میگزین‘‘ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

بہروز کریم کی آواز سُنتے ہی میرے خوابیدہ حواس کو ایک جھٹکا سا لگا، مگر پھر میں ہوش کی سفاک سرحدوں کو پار کر گیا۔ میں آج تک یہ نہیں سمجھ پایا تھا کہ یہ سرحدیں کیوں بنائی جاتی ہیں۔ جاوید اختر نے ٹھیک ہی کہا تھا، ’’سرحدیں انسانوں کے لیے ہوتی ہیں...... سوچو تم نے اور میں نے، کیا پایا انسان ہو کے......؟‘‘ میں بھی ایک ایسا ہی بدنصیب انسان تھا۔ پنچھی، ندیا یا پَون کا جھونکا ہوتا، تو جانے کب کا اس سفاک دنیا سے پرواز کر چکا ہوتا، مگر میرے پَر تو بندھے ہوئے تھے، جتنی بار ہوش آیا، میں نے خود کو سفید پٹیوں میں بندھے پایا، پھر نہ جانے کتنے دن بعد مجھے تھوڑی دیر کے لیے مکمل ہوش آیا، تو میں ایک آرام دہ کمرے میں ایک نرم بستر پر پڑا تھا۔ ایک نرس میرے قریب بیٹھی مستعدی سے میری دواؤں کا چارٹ بنا رہی تھی، میں نے گھبرا کر اس سے پوچھا۔ ’’میں کہاں ہوں......؟‘‘ تو وہ مسکرا کے بولی۔ ’’فکر مت کرو، تم محفوظ ہاتھوں میں ہو...... تمہارے زخم دھیرے دھیرے بھر رہے ہیں، بس تم آرام کرو۔‘‘ نرس کمرے سے نکل گئی اور پھر جتنی دفعہ بھی مجھے ہوش آیا، میں نے اسی نرس اور چند مخصوص چہروں کو اپنے اردگرد منڈلاتے دیکھا، جو پوری طرح میرا خیال رکھ رہے تھے۔ یہ زخم بھی کتنے بے وفا ہوتے ہیں۔ مسیحائی کا مرہم ملتے ہی کیسے اپنا مسکن، ہمارا یہ جسم چھوڑ جاتے ہیں۔ وہی جسم جو ان زخموں کی خاطر جانے کیسے کیسے درد اور عذاب جھیلتا ہے، یہ اُسی کو بھول جاتے ہیں۔ ان سے اچھے تو ان زخموں کے دیے ہوئے داغ ہوتے ہیں۔ عُمر بھر ساتھ تو نبھاتے ہیں۔ تقریباً ہفتہ بھر بعد میں اٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہوگیا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر رفیق کی تھی۔ جانے وہ میری تلاش میں کہاں کہاں بھٹک رہا ہوگا۔ میری دیکھ بھال پر مامور طبی عملہ میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیتا تھا یا شاید انہیں واقعی کچھ پتا ہی نہیں تھا اور پھر آٹھویں دن پہلی مرتبہ فیروز خان کا چہرہ نظر آیا۔ وہ میرے کمرے میں داخل ہوا تو میں اٹھ بیٹھا۔ ’’یہ سب کیا ہے فیروز...... میں کہاں ہوں، مجھے یہاں کون لایا ہے، مالک کہاں ہیں، کوئی میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتا......؟‘‘ فیروز نے حسبِ معمول خاموشی سے میرے سارے سوالات سُنے اور پھر بہت اطمینان سے بولا۔ ’’سب پتا چل جائے گا۔ ویسے تم تو واقعی بہت سخت جان نکلے، ورنہ میرا خیال تھا کہ تم جیسا کچا لڑکا ایک جھٹکے ہی میں ٹوٹ جائے گا۔ مگر زندگی میں پہلی مرتبہ میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔‘‘ میں نے حیرت سے فیروز کی طرف دیکھا۔ ’’کیا مطلب، تو کیا تم لوگوں کو خبر تھی کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے، اور مجھے اغوا کر کے کہاں رکھا گیا؟‘‘ فیروز کا چہرہ پھر بے تاثر تھا۔ اس نے جیب سے اپنی مخصوص برانڈ کی بیڑی نکالی اور ہونٹوں میں داب کر سلگائی۔ ’’ہاں، نہ صرف جگہ کا پتا تھا، بلکہ تمہیں یہاں اٹھا کر لانے والے بھی ہمارے ہی آدمی تھے۔‘‘ میرے دماغ کا تو جیسے فیوز ہی اُڑ گیا، میں نے چلّا کر کہا۔ ’’مگر کیوں، میرے ساتھ یہ سب کچھ کیوں کیا گیا......؟‘‘ فیروز کا لہجہ اب بھی دھیما اور پُرسکون تھا۔ ’’تم ہی نے تو مالک سے کہا تھا کہ تمہیں بہت پیسا کمانا ہے۔ یہ پیسا کمانے کی پہلی کسوٹی تھی۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ ہم اتنے ہی پاگل ہیں کہ ایک دن راہ چلتے تمہیں پسٹل تھما کر کروڑوں ریال کا مال لینے ساحل پر بھیج دیں گے، پیسا کمانے کے لیے صرف کلائی کی نہیں، کلیجے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تمہاری برداشت، حوصلے اور بہادری کا امتحان تھا۔ ہم میں سے جو بھی مالک کے خاص کارندے ہیں، انہیں اسی طرح کی کئی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہاں، مگر تم پر مالک نے کچھ زیادہ ہی سخت ہاتھ رکھا۔‘‘ میں منہ کھولے حیرت سے فیروز کی بات سُنتا رہا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ساحل پر ہونے والے ڈرامے سے لے کر میرے فرار کی کوشش تک سب ہی پہلے سے طے شدہ تھا۔ مجھے بہروز کریم کے خاص گروہ میں شامل کرنے سے پہلے انہیں میری وفاداری کا ہر طرح سے امتحان لینا تھا۔ فیروز کے مطابق اگر میں کسی بھی مرحلے پر ہار کر اپنی زبان کھول دیتا، تو اسی لمحے مجھے اس اذیت خانے سے نکال کر پہلی فلائٹ سے ڈی پورٹ کر دیا جاتا۔ مجھے فرار کا موقع بھی جان بوجھ کر دیا گیا تھا، کیوں کہ بہروز یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کہیں میں درد سے ٹوٹ کر اپنی ہمت اور حوصلہ تو نہیں کھو بیٹھا۔ فیروز نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ایسی ساری کارروائیوں کی براہِ راست نگرانی خود بہروز کریم کرتا ہے، کیوں کہ اُسے اپنے اردگرد صرف ایسے خاص چُنے ہوئے وفاداروں کا گروہ چاہیے ہوتا ہے، جو اس کے ہر امتحان پر پورا اُترے۔ میں نے فیروز سے رفیق کے بارے میں پوچھا تو اس نے تسلی رکھنے کو کہا کہ رفیق کو اتنا ہی پتا ہے کہ مجھے مالک نے کسی ضروری کام سے ابوظبی کے دفتر بھیج دیا ہے اور اس عرصے میں وہ لوگ میری طرف سے رفیق کو میرے گھر بھیجنے کے لیے پیسے بھی دیتے رہے ہیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے فیروز نے اپنے فون پر میری رفیق سے بات بھی کروادی۔ میری آواز سن کر رفیق کھل سا گیا۔ ’’اوئے کہاں ہو تم یار! ایسی بھی کیا نوکری، یاروں کو ہی بُھلا دیا۔‘‘ میری آواز بھرا سی گئی۔ مگر میں نے صرف اتنا کہا کہ میں جلد ہی واپس آ کر تم سے ملوں گا۔ اور پھر فیروز کے جانے کے بعد میں نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔

اس دن مجھے احساس ہوا کہ دنیا میں انسان دولت، روپیا، پیسا، سب کچھ کما لیتا ہے، مگر سب سے مشکل کسی کی وفاداری کمانا ہے کہ اس کا تعلق کسی دوسرے کے خلوص اور ایمان سے ہوتا ہے۔ بہروز کریم کی یہ احتیاط اور پریشانی اپنی جگہ بجا تھی۔ سلطنت بنا لینے سے کہیں زیادہ مشکل، سلطنت کو قائم رکھنا ہوتا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے شہنشاہ بہت چھوٹے اور معمولی غداروں کے ہاتھوں اپنی بادشاہت گنوا چکے ہیں اور بہروز کریم مجھے تاریخ یاد رکھنے والا شخص معلوم ہوتا تھا۔ شام کو اچانک باہر ہی ہلچل سی مچ گئی، جو بہروز کی آمد کا خاصہ اور ابتدائی پیغام لے کر آتی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد بہروز میرے کمرے میں موجود تھا، فیروز خان بھی اس کے ساتھ آیا تھا۔ میں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی تو بہروز نے مجھے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور خود بستر کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ

کر مجھے بہت دیر تک غور سے دیکھتا رہا۔ ''کچھ کھو گے نہیں مجھ سے، میری وجہ سے تم پر ظلم کے اتنے پہاڑ توڑے گئے، تمہاری نس نس میں درد کا زہر بھر دیا گیا۔ غصہ تو بہت آیا ہوگا مجھ پر۔'' میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ براہِ راست بہروز کی طرف دیکھا۔ ''نہیں...... آپ نے وہی کیا، جو دنیا میں کسی کی بھی وفاداری جانچنے کے لیے رائج طریقہ ہے۔ انسان کا جسم ہی بظاہر اس کی سب سے بڑی کم زوری اور مجبوری ہوتا ہے۔ تو اگر آپ نے بھی کم زوری کو آزما کر وفاداری کی جانچ کی تو کیسا گلہ شکوہ......؟'' بہروز نے دل چسپی سے پوچھا۔ ''خوب! گویا وفاداری پرکھنے کا کوئی اور طریقہ بھی ہوتا ہے، میں بھی جاننا چاہوں گا۔'' ''جس وفادار کے لیے اس کا جسم اور درد کم زوری ہو، اس کے لیے برداشت کی جانچ ہی سب سے آزمودہ طریقہ ہے، مگر جسے درد سہنے اور اذیت برداشت کرنے کی عادت پڑ چکی ہے، اس کا امتحان کیا ہوگا؟'' بہروز چپ رہا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اس دنیا میں ہر انسان کے لیے قدرت نے ایک الگ امتحان تیار کر رکھا ہے۔ کہیں درد، کہیں دولت، کہیں حُسن اور کہیں اقتدار، آپ نے تو ابھی مجھے صرف ایک آزمائش سے گزارا ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ میرے حصّے کا امتحان ہی نہ ہو......؟'' بہروز نے اپنے سگار کو بے خیالی میں توڑا اور فیروز خان نے جلدی سے لائٹر سے سگار کو شعلہ دکھایا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لڑکے، مگر میں اپنے وفاداروں کو اتنا کچھ دے دیتا ہوں کہ انہیں اور کسی چیز کی حسرت ہی نہیں رہتی، لیکن ایک بات تمہاری دل کو لگتی ہے۔ واقعی وفاداروں کی وفا ناپنے کا کوئی حتمی پیمانہ ایجاد ہی نہیں ہوا کبھی۔ انسان کے خون ہی میں وفا نہ ہو تو یہ صرف دل بہلاوے کی آزمائشیں ہیں۔ مجھے تمہاری صاف گوئی پسند آئی اور مجھے تمہاری قوتِ برداشت کی بھی داد دینی پڑے گی، حالاں کہ دیکھنے میں تم اتنے سخت جان نہیں لگتے۔ بہرحال، اب تم بھی ہماری ٹیم کا حصّہ بن چکے ہو۔ مگر یاد رہے، جس دنیا میں تم قدم رکھنے جا رہے ہو، وہاں سے واپسی کا کوئی دروازہ نہیں۔ میں کبھی خود کسی کو یہ پیش کش نہیں کرتا، مگر تم اگر چاہو تو میں آج بھی تمہیں بہت کچھ دے کر واپس تمہارے ملک رخصت کر سکتا ہوں۔ مگر ایک بار جب تم ہمارے راز اور ٹھکانوں سے واقف ہو گئے، تو پھر تمہاری واپسی کبھی ممکن نہیں ہوگی۔ چاہو تو میں تمہیں سوچنے کے لیے دو دن مزید دے سکتا ہوں۔'' ''میں واپس جانے کے لیے یہاں نہیں آیا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے ہی میں اپنے واپسی کے سارے راستے بند کر چکا ہوں، اور واپسی کی فکر وہ کرتے ہیں، جن کی واپسی کا کوئی منتظر ہو۔ میرا کوئی آگے ہے نہ پیچھے۔ آپ حکم کریں، مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' بہروز نے اطمینان سے میری بات سُنی اور پھر کاندھا تھپتھپاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''پہلے تم مکمل صحت یاب ہو جاؤ، پھر بہت کام پڑے ہیں تمہارے کرنے کے۔ اور ہاں، کچھ دن بعد تمہارے دوست کو یہاں سے کسی بہتر جگہ ٹرانسفر کر دیا جائے گا، کیوں کہ یہاں سے واپسی کے بعد تم اس کے ساتھ نہیں رہو گے۔'' بہروز کریم کمرے سے باہر نکل گیا۔

فیروز خان کچھ حیرت زدہ سا تھا، وہ ایک لمحے کے لیے میرے پاس رُکا۔ ''تم واقعی بہت خوش قسمت ہو لڑکے! مالک کو میں نے آج تک اتنی باتیں کسی سے کرتے نہیں دیکھا۔ جلدی تندرست ہو کر باہر آنا، تمہارے ساتھ مل کر کام کرنے میں مزہ آئے گا۔'' فیروز چلا گیا اور اس کے ٹھیک ایک ہفتے بعد جب میں رفیق کے فلیٹ پہنچا تو وہ اپنا سامان باندھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مجھ سے لپٹ گیا ''اچھا ہوا تم آ گئے، مجھے مالک نے انچارج بنا کر ابوظبی والی فیکٹری میں ٹرانسفر کر دیا ہے۔ پر، تم فکر نہ کرنا، میں نے مالک سے التجا کی ہے کہ وہ تمہیں بھی جلدی ترقی دے کر میرے پاس بھجوا دے۔ تب تک تم یہیں میرے فلیٹ میں رہو گے۔'' میں خاموش رہا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ ہمارے راستے جدا ہو چکے ہیں۔ میں رفیق کو رخصت کرنے ائرپورٹ تک اس کے ساتھ آیا اور جہاز فضا میں بلند ہونے تک باہر لاؤنج میں کھڑا رہا۔ ہماری زندگی میں کچھ ایسے لوگ بھی آتے ہیں، جن کی موجودگی سے کہیں زیادہ ہمیں ان کی غیر حاضری محسوس ہوتی ہے۔ رفیق کے جانے کے بعد میں نے اسے زیادہ قریب پایا۔ ہم انسان اتنے کوتاہ نظر کیوں ہوتے ہیں؟ اپنے قریب کی چیزیں، رشتے، ناتے اور لوگ ہمیں کیوں نظر نہیں آتے، جب کہ ان ہی جذبوں اور رشتوں کی تلاش میں ہم سات سمندر پار تک ساری دنیا چھان لیتے ہیں۔ مجھے تو ویسے بھی دو چار دن میں بہروز کریم کی طرف سے دیے گئے نئے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو جانا تھا، مگر رفیق کے جانے کے بعد مجھ سے چوبیس گھنٹے بھی اُس فلیٹ میں نہیں رہا گیا۔ میں نے فیروز کو کہلوا بھیجا کہ ہو سکے تو مجھے چند دن کے لیے کسی ہوٹل میں منتقل کروا دے۔ جواب میں فیروز نے شام تک ایک بڑے فرنشڈ اپارٹمنٹ کی چابی میرے حوالے کر دی۔ جہازی سائز کے اس اپارٹمنٹ میں ضرورت کی ہر شے پہلے سے موجود تھی۔ ہر چیز نئی، قیمتی اور چمکتی ہوئی۔ قرینے سے سجائی گئی۔ اتنی بڑی خواب گاہ، جس کی کھڑکی سمندر کی طرف کھلتی تھی۔ دبیز ایرانی قالین، ریشمی پردے، فانوس، بڑے بڑے مصوروں کی تصویروں سے سجی دیواریں، ساتویں منزل پر بنے ہوئے اس اپارٹمنٹ کا سمندر کی طرف کھلنے والا ٹیرس اور وہاں پڑی وہ بید کی قیمتی آرام کرسی...... پل بھر کے لیے مجھے اپنے گھر کی چھت پر بنا وہ گودام نما چھوٹا سا کمرا یاد آ گیا اور میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس چھوٹے سے ڈربے نما کمرے سے لے کر اس عالی شان اپارٹمنٹ کے سفر میں نہ جانے میں نے پایا زیادہ تھا یا کھویا بہت۔ مجھے ابھی تک یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ مجھے کام کیا کرنا ہوگا۔ مگر ایک بات تو بہت حد تک واضح ہو چکی تھی کہ بہروز کریم کے کچھ ایسے خفیہ دھندے بھی ہیں، جو قانون کی نظر سے چُھپ کر جاری تھے۔ فیروز سے مجھے اتنا ضرور پتا چل گیا تھا کہ وہ لوگ درپردہ سونے کی اسمگلنگ کا کاروبار کرتے تھے، یہ دولت کمانا بھی تو ایک خبط ہے۔ شاید دنیا کا سب سے بڑا خبط اور جنون، ورنہ بہروز کریم کو بھلا مزید روپیا کمانے کی کیا ضرورت تھی۔ یا شاید یہ بھی ایک نشہ ہے۔ کچھ لوگ خرچ کر کے اس نشے کا سُرور محسوس کرتے ہیں اور کچھ جمع کر کے۔ اسی روز مجھے ایک اور ادراک بھی ہوا کہ دولت مند کی دولت جتنی بڑھتی جاتی ہے، وہ اتنا ہی اپنے اندر سے خود کو غیر محفوظ تصور کرنے لگتا ہے اور ٹھیک اس کے برعکس فقیر کا فقر اور فاقہ جتنا زیادہ بڑھتا ہے، وہ اتنا ہی بہادر اور لاپروا ہوتا جاتا ہے۔ میں بھی جب تک فقیر تھا، مجھے اپنی جھلنگا چارپائی پر بھی جھولتے جھولتے نیند آ جاتی تھی اور آج جب میرے پاس دبئی کے سب سے پوش علاقے میں مہنگا ترین اپارٹمنٹ موجود تھا، تو میں اپنی خواب گاہ کی نرم مسہری پر ساری رات بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

اگلی صبح سویرے ہی فیروز خان کا پیغام آ گیا کہ بہروز کچھ دن کے لیے شہر سے باہر جا رہا ہے۔ اور جانے سے پہلے اس نے ہم سب کو کسی خاص میٹنگ

کے لیے اپنے ساحل والے بنگلے پر بلایا ہے۔ سہ پہر کو ڈرائیور گاڑی لے آیا اور مجھے اور دو چار مزید ارکان کو لیے وہ بہروز کریم کی شاہانہ رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ میں نے اس سے پہلے یہ جگہ نہیں دیکھی تھی۔ میرا اندازہ درست تھا۔ بہروز کو صرف کمانا نہیں، خرچ کرنا بھی آتا تھا اور اس نے اپنی اس رہائش گاہ پر جی بھر کے خرچ کیا تھا۔ کہتے ہیں انسان کا خط اور اس کی رہائش کا سلیقہ، اس کے اندر کے آدمی کی نزاکت یا کرختگی ظاہر کرتے ہیں۔ بہروز کریم کا یہ عالی شان محل اس مثال کی غمازی کر رہا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک جانب پورچ میں دنیا کی چند بہترین اور مہنگی ترین گاڑیاں شیڈ کے نیچے کھڑی تھیں۔ شاید بہروز کو دنیا کی نایاب ترین کاریں جمع کرنے کا شوق تھا۔ دائیں جانب چھوٹی سی پانی کی ایک نہر تھی، جس سے پرے، سبزے پر ایک وسیع و عریض گالف کورس بنایا گیا تھا۔ گھاس کے اونچے نیچے ٹیلوں کی پشت پر جہاں وہ پتھر اور درختوں کے جھنڈ ختم ہوتے تھے، وہاں ٹینس کورٹ بھی تھا، مگر گاڑی ہم سب کو لیے ان سب عجوبوں کو پار کرتی شیشے اور لکڑی کی ایک خوب صورت عمارت کی طرف بڑھتی گئی، جو شاید بہروز کے بنگلے کی انیکسی تھی، کیوں کہ اصل گھر جو کسی برطانوی دور کے قلعے سے مشابہ تھا، اس کی سرخ اور بھوری اینٹوں سے بنی عمارت تو ان سب سے پرے دکھائی دے رہی تھی۔ ہم سب انیکسی میں داخل ہوئے تو بہروز اور فیروز خان پہلے سے وہاں موجود تھے۔ بہروز نے مجھ سمیت سب کا حال پوچھا اور پھر ہمیں بتایا کہ اسے اچانک ایک ضروری کام سے چند دن کے لیے لندن جانا پڑ رہا ہے۔ اور اس کی واپسی ہفتہ بھر میں متوقع ہے۔ پھر اس نے فیروز کو اس عرصے میں سبھی ارکان کی ڈیوٹی کے بارے میں تفصیل بتانے کی ہدایت کی۔ فیروز نے سب کو مختلف ادھورے کام اور وہ سودے بتائے، جو اس عرصے میں انہیں پایۂ تکمیل تک پہنچانے تھے۔ مگر میرے لیے اس تفصیل میں کوئی فرض شامل نہیں تھا۔ باقی سب رکن ایک ایک کر کے وہاں سے رخصت ہوتے گئے اور پھر آخر میں صرف میں ہی کھڑا رہ گیا۔ بہروز کریم نے مُسکرا کر فیروز سے پوچھا ''کیوں فیروز خان! پَری زاد سے تمہاری بہت دوستی ہوگئی ہے کیا، اسے کوئی کام نہیں دیا تم نے؟'' فیروز خان نے حسب معمول سپاٹ چہرے کے ساتھ جواب دیا ''یہ ابھی نیا ہے مالک ...... اور اسے کوئی پرانا سودا ابھی نہیں چکانا۔ آپ خود ہی اس کے لیے کوئی کام بتا دیں۔'' بہروز نے اپنا مخصوص سگار نکالا اور فیروز نے لائٹر سے اسے سلگایا۔ ''ہاں اس کے لیے میرے پاس ایک خاص کام ہے، تم جانتے ہو پَری زاد، تم میرے گروپ کے سب سے نئے رکن ہو۔ اس لیے میرے کاروباری حریفوں اور میرے دشمنوں کی اب تک تم پر نظر بھی نہیں پڑی ہے۔ تمہاری اسی خصوصیت کو میں اس ایک ہفتے میں بروئے کار لانا چاہتا ہوں۔'' میں نے سر جُھکا کر کہا ''میں آپ کے حکم کا منتظر ہوں۔'' بہروز نے مجھے بتایا کہ اس نے یہ محل اپنی چوتھی بیوی کے لیے تعمیر کروایا ہے، جو اس کی سب سے زیادہ لاڈلی بھی ہے۔ اس کی باقی دو بیگمات یہیں دبئی میں اور ایک بیوی اور چھوٹا بیٹا لندن میں رہتے تھے۔ وہ لندن اپنے اسی بیٹے کا کسی نامور تعلیمی ادارے میں داخلہ کروانے کی غرض سے جا رہا تھا، لیکن اُسے اپنی اس نئی کم سن دلہن کی بہت زیادہ فکر لگی رہتی تھی۔ اسی لیے بہروز نے اس محل میں اس کی تفریح کا ہر سامان مہیا کر رکھا تھا۔ اس کے دشمنوں کو ابھی بہروز کریم کی اس نئی شادی کا علم نہیں تھا۔ نہ ہی وہ کریم کی نئی نویلی دلہن کی صورت سے واقف تھے۔ مگر بہروز کے بقول اس کی گھر والی اب گھر میں بیٹھے بیٹھے اوب چکی تھی، لہٰذا وہ اپنی سہیلیوں اور خاندان سے ملنے کے لیے باہر جانے کی ضد کرنے لگی تھی۔ بہروز اس کی محبت کے ہاتھوں انتہائی مجبور ہونے کے باوجود اسے اپنے کسی پرانے وفادار یا محافظ کے ساتھ باہر نہیں بھیجنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ بہروز کے پرانے وفاداروں کو پورا شہر جانتا تھا کہ ان کے ساتھ کا مطلب ہی بہروز کے خاندان کی نشان دہی تھا۔ لہٰذا بہروز چاہتا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں اگر اس کی دلہن کو کہیں جانا ہو تو میں بھی ڈرائیور کے ساتھ اس کے ساتھ جاؤں، دوسری احتیاط مجھے یہ بھی کرنی تھی کہ بہروز کی دلہن کو کسی گارڈ کی موجودگی کی الجھن سے بے بھی بے خبر رکھوں کہ اسے اس زیرِ زمین دنیا کے خطرات سے آگاہ کر کے بہروز اس کی زندگی اجیرن نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہاں، البتہ جس گاڑی میں، مَیں ڈرائیور اور بہروز کی وہ لاڈلی گھر سے نکلیں گے، اس کے تعاقب میں بہروز کے خاص وفادار محافظوں کی ایک ٹیم غیر محسوس طور پر ضرور رہے گی۔ اس دوسری گاڑی کا صرف مجھے پتا ہوگا اور ان کمانڈوز سے فون پر میرا رابطہ رہے گا تاکہ جب بھی میں کوئی خطرہ محسوس کروں تو وہ پلک جھپکتے ہی گاڑی کو اپنی حفاظت کے حصار میں لے لیں۔ پوری بات کہنے کے بعد بہروز نے تصدیق کے لیے میری طرف دیکھا ''سب سمجھ گئے ناں، کوئی بات پوچھنی ہو تو پوچھ سکتے ہو۔ مگر یاد رکھنا، لیلیٰ صبا میری جان ہے۔ اسے ہلکی سی کھرونچ بھی آئی تو اچھا نہیں ہوگا۔ تمہارے پاس غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہے پَری زاد۔'' میں نے سر ہلایا ''نہیں مالک! میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ کوئی غلطی نہیں ہوگی۔'' بہروز مسکرایا ''شاباش! تم ظاہر نہیں کرتے، مگر کافی ذہین ہو۔'' میں چپ رہا، مگر نہ جانے کیوں مجھے اس ساری کہانی میں کوئی ایک چیز بار بار الجھا رہی تھی، جیسے بہروز نے سب کچھ بتاتے ہوئے بھی کچھ بہت خاص چُھپا لیا ہو، جیسے کوئی بہت بڑا راز میرے آس پاس بھٹک کر میرے کان میں کوئی سرگوشی کر کے کچھ بتانے کی کوشش کر رہا ہو، پر بتا نہ پا رہا ہو۔

کچھ دیر میں ایک ملازم نے آ کر بتایا کہ لیلیٰ صبا جاگ چکی ہیں اور کریم کا پوچھ رہی ہیں۔ بہروز کریم نے اٹھتے ہوئے مجھے بھی اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ''تم بھی وہیں آ جاؤ، میں تمہارا تعارف بھی لیلیٰ سے کروا دیتا ہوں۔'' میں بہروز کریم اور فیروز کے نقشِ قدم پر چلتا ہوا اس محل کے ہال نما لاؤنج میں داخل ہوا تو ایک جانب رکھے نفیس اور خوب صورت سفید رنگ کے پیانو کو دیکھ کر میرے قدم ٹھٹھک سے گئے۔ مجھے یاد آیا کہ بچپن میں، میں بھی تو ایک پیانسٹ بننا چاہتا تھا اور آج قدرت نے پیانو دکھایا بھی تو کہاں......؟ اتنے میں اوپر کی منزل کی طرف سے نیچے آتی لکڑی کی سیڑھیوں پر کسی کے نازک قدموں کی آواز گونجی، میری نظریں خود بہ خود جھک گئیں، آنے والی نزاکت سے پاؤں دھرتے نیچے اُتری تو بہروز نے مجھ سے کہا ''ان سے ملو پَری زاد، یہ ہیں میری بیگم۔ اس گھر کی مالکن، لیلیٰ صبا۔'' میں نے جھجکتے ہوئے نظر اٹھائی اور مجھ پر جیسے ایک پل کے لیے بجلی سی گر گئی۔

(جاری ہے)



......ہاشم ندیم......

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ’’ خدا اور محبت‘‘ اور ’’ بچپن کا دسمبر‘‘ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ’’عبداللہ‘‘ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں’’ عبداللہ‘‘ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

’’ پری زاد‘‘ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ’’ سنڈے میگزین‘‘ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

میں نے لیلیٰ صبا کو دیکھا تو چند لمحوں کے لیے تو جیسے پتھر کا ہوگیا۔ بہروز کریم کو خدا نے صرف روپے پیسے ہی سے نہیں نوازا تھا، لیلیٰ صبا کی صورت حُسن کی ایک ان مول نعمت بھی عطا کر رکھی تھی۔ لیلیٰ حُسن و نزاکت کا ایک مکمل امتزاج تھی۔ مغربی لباس میں ملبوس، سیاہ فلیپر کے اوپر میرون شرٹ اور گلے میں سیاہ اسکارف، کُھلے بال اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں نیند کا خمار...... بہروز کریم کی فکر اپنی جگہ بالکل بجا تھی۔ اس گل رُخ کی حفاظت کے لیے سارے دبئی کو بھی مامور کر دیا جاتا، تو کم تھا۔ کریم نے لیلیٰ سے میرا تعارف کروایا’’ اس سے ملو، یہ پَری زاد ہے، میرا نیا اسسٹنٹ......‘‘میں نے چونک کر بہروز کی طرف دیکھا، وہ لیلیٰ سے اردو میں بات کر رہا تھا۔ لیلیٰ نے نخوت سے میری طرف دیکھا اور انگریزی میں بہروز سے کہا’’ اوکم آن آغا، آپ کی پسند کو کیا ہوتا جا رہا ہے؟‘‘ بہروز نے مُسکرا کر میری طرف دیکھا اور انگریزی ہی میں مجھے لاؤنج کے ساتھ مُلحق دوسرے کمرے میں انتظار کرنے کو کہا۔ شاید وہ لیلیٰ کو یہ جتانا چاہ رہا تھا کہ میں انگریزی جانتا ہوں۔ میں چُپ چاپ وہاں سے نکل آیا، مگر لیلیٰ اور کریم کی اونچی آواز میں بحث میرے کانوں تک پہنچتی رہی۔ خاص طور پر جب کریم نے لیلیٰ کو یہ بتایا کہ اب میں گھر سے باہر نکلتے وقت ہمیشہ لیلیٰ کے ساتھ رہوں گا، تو لیلیٰ کی آواز مزید اونچی ہوگئی’’ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں آغا، اب یہ شخص میرا سایہ بنا رہے گا......؟ آپ یہ تو سوچیں کہ جب یہ میرے ساتھ چلے گا تو میرا کتنا مذاق بنے گا، اس سے تو بہتر ہے کہ میں گھر سے باہر ہی نہ نکلوں۔‘‘ بہروز کریم نے اپنے مخصوص ٹھنڈے لہجے میں بیوی کو سمجھایا کہ میرا اس کے ساتھ باہر جانا کیوں ناگزیر ہے، اور یہ کہ وہ یہ سب کچھ لیلیٰ کی محبت میں کر رہا ہے، ورنہ وہ پردیس جاکر بھی لیلیٰ کی طرف سے پریشانی میں مبتلا رہے گا۔ بہرحال، ایک لمبی بحث و تکرار کے بعد آخر کار وہ لیلیٰ کو معاملے کی نزاکت سمجھانے میں کام یاب ہوگیا۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ محبت کا زنگ کتنا طاقت ور ہوتا ہے کہ جو بہروز کریم جیسے فولاد کو بھی بُھربُھری مٹی میں تبدیل کر سکتا ہے۔ مجھے نیا حکم یہ ملا کہ میں اپنا ضروری سامان لے کر انیکسی منتقل ہو جاؤں، تاکہ اگر کبھی لیلیٰ کو اچانک باہر جانا ہو تو اسے میرا انتظار نہ کرنا پڑے۔ مگر میری اُلجھن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ بہ ظاہر یہ سیدھا سادہ نظر آنے والا معاملہ مجھے بہت ٹیڑھا دکھائی دے رہا تھا۔ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ بات صرف لیلیٰ کی حفاظت سے کہیں بڑھ کر ہے اور پھر میرے اس خدشے کی تصدیق بھی جلد ہی ہوگئی، جب ائرپورٹ روانگی سے قبل بہروز نے مجھے بُلا کر سختی سے تاکید کی کہ گھر سے باہر مجھے ہر لمحہ لیلیٰ کے ساتھ رہنا ہوگا اور روزانہ کی رپورٹ دینی ہوگی۔

بہروز کے لندن جانے سے پہلے میں انیکسی میں منتقل ہو چکا تھا۔ فیروز نے لیلیٰ کے اردو بولنے کا معمّا بھی حل کر دیا کہ دراصل لیلیٰ ترکی سے تعلق رکھتی ہے اور بہروز نے اسے وہیں استنبول کے ایک میلے میں دیکھا اور اس پر دل ہار بیٹھا۔ لیلیٰ نے بہروز کی محبت میں اردو سیکھی اور اب وہ ٹوٹی پھوٹی اردو بول بھی لیتی ہے۔ یہ ان کی شادی کا دوسرا سال تھا، مگر میں بدقسمتی سے پہلے روز ہی لیلیٰ صبا کی نظروں میں ایک ناپسندیدہ شخص قرار پا چکا تھا، کیوں کہ اسے بہروز کے لگائے ہوئے پہرے سے شدید چڑ ہوگئی تھی اور اس کی جھنجھلاہٹ کا سارا نزلہ مجھ ہی پر گرتا تھا، لیکن اگر بہروز یہ حکم نہ بھی دیتا، تب بھی لیلیٰ جیسی ماہ رُخ کی مجھ جیسے بدصورت شخص سے نفرت لازمی تھی۔ خاص طور پر اُس وقت، جب اس شخص کی ہم سفری کی شرط بھی لازمی قرار دے دی گئی ہو۔ میں انیکسی میں اپنے کمرے میں آرام کرسی پر بیٹھا بہت دیر تک سامنے دیوار میں لگے بڑے آئینے کو دیکھتا رہا۔ مجھے آئینے پسند نہیں تھے۔ مگر ہر گھر میں، ہر دیوار پر لگے یہ شیشے ہر پل میرا راستہ کاٹتے رہتے تھے۔ اور گھر ہی پر کیا منحصر، باہر گلی میں، سڑک پر، گاڑیوں میں، عمارتوں کے اندر ہر طرف میرے یہ دشمن میری تاک میں گھات لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ میں کہاں کہاں ان سے بچ پاتا۔ سارے شہر میں جا بہ جا یہ میرا منہ چڑانے اور مذاق اڑانے کے لیے کھڑے ملتے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر زندگی میں کبھی مجھے اپنا گھر بنانے کا موقع ملا تو اس میں کسی آئینے کی جگہ نہیں ہوگی۔ کوئی گوشہ تو اس دنیا میں ایسا ہو، جہاں میں بنا کسی خوف اور جھجک صرف اپنے ساتھ رہ سکوں۔

اگلے روز سہ پہر تین بجے کے قریب مجھے گھر کے ملازم نے آکر حکم سنایا کہ مالکن باہر جانا چاہتی ہیں اور ڈرائیور باہر پورچ میں میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں گاڑی کے قریب پہنچا تو لیلیٰ صبا غصّے میں بھری کھڑی تھی’’ اتنی دیر کہاں لگا دی تم نے، کیا اب مجھے تمہاری تیاری کا انتظار بھی کرنا پڑے گا؟‘‘میں نے اسے بتایا کہ مجھے ملازم نے صرف تین منٹ پہلے روانگی کا بتایا ہے اور میں جس حالت میں بیٹھا تھا، ویسے ہی چلا آیا ہوں۔ مگر لیلیٰ نے میری بات پوری ہی نہیں ہونے دی اور جھڑک دیا۔’’ اچھا اچھا...... ٹھیک ہے، اب گاڑی میں بیٹھو، مَیں کسی فضول بحث کے موڈ میں نہیں ہوں‘‘ میں چُپ چاپ ڈرائیور کے ساتھ آگے بیٹھ گیا اور لیلیٰ نے عربی میں ڈرائیور سے کہیں چلنے کو کہا۔ گاڑی دبئی کی بارونق سڑکوں سے ہوتی ایک جدید طرز کی کالونی میں داخل ہوگئی، جہاں اونچے اونچے پُرتعیش اپارٹمنٹس کی بہت سی قطاریں تھیں۔ ہماری گاڑی ’’ جے‘‘ سیریز کے اپارٹمنٹس کی قطار کے سامنے آکر رک گئی۔ لیلیٰ نیچے اُتری تو میں بھی نیچے اُتر آیا۔ اس نے غصّے سے میری طرف دیکھا۔’’ تم کہاں اُتر آئے...... یہیں نیچے میرا انتظار کرو، میں اپنی سہیلی سے مل کر آتی ہوں‘‘ میں نے سر جھکا کر جواب دیا’’ مجھے آپ کو اکیلا نہ چھوڑنے کا حکم ہے۔ مَیں آپ کی سہیلی کے اپارٹمنٹ تک ساتھ چلوں گا۔‘‘ لیلیٰ میری بات سُنتے ہی آپے سے باہر

ہوگئی۔" ہاؤ، ڈیئر یو...... تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھے پلٹ کر جواب دینے کی۔ اپنی اوقات میں رہو ورنہ......" اس بار مجھے اپنا لہجہ سخت کرنا پڑا۔" معافی چاہتا ہوں مگر یہ مالک کا حکم ہے" ہمارے تعاقب میں آنے والے گارڈز کی گاڑی کچھ فاصلے پر کھڑی ہو چکی تھی، اور مجھے ان کی بے چینی سے ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے انہیں ہمارا یہاں زیادہ دیر رکنا کچھ پریشان کر رہا ہے۔ لیلیٰ غصّے سے دانت پیستی، پیر پٹختی اندر لفٹ کی جانب بڑھ گئی۔ پندرہویں منزل پر لیلیٰ کی دوست کا اپارٹمنٹ تھا۔ اُس نے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا تو دونوں سہیلیاں یوں ملیں، جیسے برسوں بعد ملاقات ہوئی ہو۔ لیلیٰ اندر چلی گئی اور میں باہر راہ داری میں ایک جانب دیوار کے ساتھ لگے لوہے، کے بینچ پر بیٹھ گیا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد وہ دونوں باہر نکلیں۔ لیلیٰ نے قریبی شہر کی مارکیٹ سے کچھ خریداری کی اور ہم اُس کی سہیلی کو اپارٹمنٹ کے باہر چھوڑ کر واپس گھر چلے آئے۔ لیلیٰ نے گاڑی سے اُترتے ہی چیخ کر فیروز خان کو حاضر ہونے کا حکم دیا اور غصّے میں بھری اندر چلی گئی۔ میں انیکسی میں آکر بستر پر دراز ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد فیروز خان بھی وہاں نازل ہو گیا" تمہاری، مالکن سے کوئی بحث ہوئی تھی آج......؟"" ہاں، وہ اکیلے جانے کی ضد کر رہی تھیں، میں نے صرف مالک کے حکم کی تعمیل کی۔" فیروز نے ایک لمبی سانس بھری، آئندہ ایسی نوبت نہ آئے، تو بہتر ہے۔ لیلیٰ مالکن، مالک کی بہت چہیتی ہیں۔ وہ یہ سب برداشت نہیں کریں گے۔ یوں سمجھ لو کہ تم ایک دو دھاری تلوار پر چل رہے ہو اور تمہیں دونوں جانب ہی اپنا وزن برابر رکھنا ہے، ورنہ کٹ کر دو حصّوں میں تقسیم ہو جاؤ گے۔" فیروز جاتے جاتے مجھے ایک نئی اُلجھن میں مبتلا کر گیا تھا۔ اگر میں بہروز کریم کا حکم مانتا تو لیلیٰ کی ناراضی یقینی تھی، اور اگر لیلیٰ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس سے دُور رہتا اور مکمل نگرانی نہ کرتا تو بہروز کی حکم عدولی ہوتی اور دونوں صورتوں میں سزا میرا ہی مقدر تھی۔

شام ڈھلتے ہی گھر کے ہال سے پیانو کی مدھر تانیں ابھرنے لگیں۔ کوئی پیانو پر بہت خوب صورت دُھن بجا رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے قدم ہال کی جانب بڑھ گئے۔ ایک بوڑھی انگریز استانی پیانو بجاتے ہوئے لیلیٰ کو پیانو کا سبق دے رہی تھی۔ میں نے لاؤنج کی کھڑکی سے ہال کے اندر کا منظر دیکھا تو الٹے قدموں واپس چلا آیا۔ گویا لیلیٰ کو بھی پیانو سیکھنے کا شوق تھا۔ چلو، ایک بات تو ثابت ہوئی کہ کم از کم خوب صورت اور بدصورت لوگوں کے اندر ایک سا دل ہوتا ہے۔ ورنہ میں تو آج تک یہی سمجھتا رہا کہ بدصورت لوگوں کا دل شاید کچھ کم دھڑکتا ہوگا۔ اگلے روز لیلیٰ صبح سویرے ہی کہیں جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ شاید ڈرائیور تک بہروز کریم کی ہدایات پہنچا دی گئی تھیں۔ ورنہ لیلیٰ کا بس چلتا تو وہ اکیلی ہی ڈرائیور کے ساتھ نکل چکی ہوتی۔ آج لیلیٰ نے مجھ سے زیادہ بحث نہیں کی اور ڈرائیور سے جمیرا کی طرف چلنے کے لیے کہا اور خواہ مخواہ شام تک مالز میں خریداری کرتی رہی۔ جانے یہ امیر عورتوں کو شاپنگ کا اتنا خبط کیوں ہوتا ہے؟ شاید یہ بھی ایک طرح کی بھوک ہوتی ہے۔ اور یہ بھوک صرف بھرے پیٹ ہی لگتی ہے۔ شام کو گھر واپسی کے بعد میرے کان نہ چاہتے ہوئے بھی پیانو کی اس خوب صورت دُھن کی آس کرنے لگے، سماعت کو بھی تو کبھی کبھی بہت شدید بھوک محسوس ہوتی ہے۔ خاص طور پر مجھ جیسوں کی سماعت کو کہ جو ساری عُمر کسی کی زبان سے دو میٹھے بول سُننے کو ترستی رہی۔ اور پھر، ہماری سماعت انسانوں کی زبان سے مایوس ہو کر قدرت کی بکھیری دیگر آوازوں میں اپنے حصّے کی چاشنی ڈھونڈنے لگتی ہے۔ مجھے بہتے پانی کی آواز، بارش کی خاموش بوندوں کی ٹپ ٹپ، سرسراتی ہوا، جھرنوں اور ایسی میٹھی دُھنوں کی سرگوشیاں ہمیشہ اپنی جانب کھینچتی تھی۔ سو، جب پیانو کے لَے چھڑی، تو میں بے اختیار انیکسی سے نکل آیا اور باہر باغیچے میں، لاؤنج کی کھڑکیوں کے آس پاس ٹہلنے لگا۔ جانے کتنی دیر بعد اندر سے آواز آنا بند ہوئی اور بوڑھی پیانو ٹیچر سر پر اسکارف ٹھیک کرتے ہوئے باہر نکلی اور گیٹ کی طرف چل پڑی۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سلام کیا اور بہروز کے خادم کی حیثیت سے اپنا تعارف کروایا۔ وہ خوش دلی سے مسکرا دی۔ اس کا نام مارتھا تھا، میں نے مارتھا سے درخواست کی کہ کیا وہ مجھے بھی پیانو بجانا سکھا سکتی ہے، میں اسے پورا معاوضہ دینے پر بھی تیار تھا، مگر مارتھا کے چہرے پر مایوسی کی لکیریں ابھر آئیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس اپنا پیانو نہیں ہے۔ وہ تو کرسچین کالونی میں رہتی ہے۔ اور اسکول کے بچّوں اور شام کو ایک دو بڑے گھروں میں پیانو سکھا کر اپنا گزارہ کرتی ہے۔ اس کی بات سُن کر میری امیدوں پر اوس گر گئی۔ پھر کسی خیال سے میری آنکھیں جھپکیں،" اگر میں کبھی اپنا پیانو لے سکوں تو کیا آپ مجھے سکھانے آئیں گی؟" مارتھا میرا سوال سُن کر زور سے ہنس پڑی" ہاں ہاں، کیوں نہیں، بلکہ تمہارا شوق دیکھتے ہوئے میں تمہاری فیس بھی آدھی کر دوں گی۔" مارتھا ہنستے ہوئے وہاں سے چلی گئی اور میرے دل میں یہ خواب پلنے لگا کہ جانے کب میں اپنا پیانو خریدوں گا اور مارتھا سے پہلا سبق لوں گا۔

اب میرے پاس اچھی خاصی رقم ہر ماہ جمع ہو جاتی تھی۔ پیانو خریدنا میرے لیے کوئی خاص بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ مگر انیکسی میں پیانو رکھنے کی اجازت شاید مجھے نہ مل پاتی۔ ساری رات میں یہی سوچ سوچ کر کروٹیں بدلتا رہا کہ ایسی کیا تدبیر کروں کہ میری برسوں کی دبی خواہش پوری ہو سکے۔ جب خواب روٹھ جائیں تو راتیں بڑی طویل ہو جاتی ہیں۔ انسان بھی عجب ہے، خواب دیکھے، تو راتوں پر فریب دینے، جال بننے کا الزام لگا دیتا ہے۔ اور خواب نہ آئیں تو اُسی رات کی طوالت سے اُسے بےزاری ہونے لگتی ہے۔ میں بھی اس طویل رات کے بعد صبح اٹھا، تو سَر درد سے پھٹ رہا تھا بستر چھوڑنے کو بالکل بھی من نہیں کر رہا تھا، مگر دس بجتے ہی مالکن کا پیغام آ گیا۔ نوکری یا غلامی کی ایک تعریف شاید اپنے اندر کو کچلنا بھی ہے۔ کسی طرح اٹھ کر منہ پر دو چار چھینٹے مارے اور سُوجی آنکھوں کے ساتھ پورچ میں پہنچ گیا۔ مگر توقع کے برعکس ابھی تک وہاں کوئی گاڑی روانگی کے لیے تیار نہیں تھی۔ البتہ دوسری گاڑی میں محافظ چاق چوبند اور تیار بیٹھے تھے۔

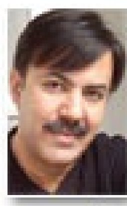
کچھ دیر میں اندر سے ایک خادمہ باہر آئی اور اس نے بتایا کہ مالکن اندر لاؤنج میں مجھے یاد کر رہی ہیں۔ میں الجھا ہوا سا لاؤنج کی جانب بڑھ گیا۔ جانے اب کیا آفت آنے والی تھی، لیلیٰ کے مزاج کا کچھ بھروسا نہیں تھا۔ اور یہ بات ابھی تحقیق طلب تھی کہ یہ خلل کثرتِ حُسن کی وجہ سے تھا یا کثرتِ زر کے سبب، کیوں کہ یہ دونوں ہی اپنے اندر دماغی فتور پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مگر جب میں ہال میں داخل ہوا تو خلافِ معمول لیلیٰ بڑی پُرسکون سی پیانو کے قریب بیٹھی اس کے تاروں سے کھیل رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے زور سے پیانو کی کلوں پر ہاتھ پھیرا اور مجھ سے کہا" تمہیں پیانو بہت پسند ہے، بجانا سیکھنا چاہتے ہو......؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، وہ مسکرائی،" میں نے کل شام تمہاری اور مارتھا کی گفتگو سُن لی تھی۔ تم چاہو تو اسی پیانو پر مارتھا سے سیکھ سکتے ہو، تمہارے مالک سے اجازت میں تمہیں لے دوں گی۔ وہ میری کوئی بات نہیں ٹالتے" میرا جی چاہا کہ اس سے پوچھوں کہ اس کرم خاص اور مہربانی کی کوئی وجہ بھی تو بتائیں۔ اس نے شاید خود ہی میری آنکھوں میں لکھا سوال پڑھ لیا۔" ہاں مگر بدلے میں تمہیں بھی مجھ سے کچھ تعاون کرنا

پڑے گا۔‘‘ ’’کیسا تعاون، میں کچھ سمجھا نہیں......‘‘ وہ سر جھٹک کر بولی۔ ’’جب سے میں اس محل میں آئی ہوں، مجھے یوں لگتا ہے، جیسے کسی قید خانے میں آ گئی ہوں، بہروز مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں، بہت خیال رکھتے ہیں میرا۔ مگر میرے لیے ان کا یہ خوف اور احتیاط کی انتہا کبھی کبھی میرا دم گھونٹنے لگتی ہے۔ مَیں اپنی ہم عُمر سہیلیوں سے ملنا چاہتی ہوں، ان کے ساتھ شہر میں گھومنا چاہتی ہوں، وہاں ترکی میں تو مَیں کسی تتلی کی طرح اُڑتی پھرتی تھی، مگر یہاں مجھ پر بڑے پہرے ہیں۔‘‘ میں نے دھیرے سے سَر جُھکائے جواب دیا ’’یہ سب آپ ہی کی حفاظت کی خاطر کیا گیا ہے۔ مالک کے دشمن بہت ہیں۔ جو ہر پَل اُنہیں نقصان پہنچانے کی تاک میں لگے رہتے ہیں۔‘‘ لیلیٰ نے اُداسی سے ایک سرد آہ بھری ’’جانتی ہوں میں، لیکن کیا تم نہیں سمجھتے کہ اس طرح پہروں میں نکلنے سے میں آغا کے دشمنوں کی نظر میں زیادہ نمایاں ہو جاؤں گی۔ اگر میں اسکارف اور نقاب کے ساتھ سارا دن بھی شہر میں گھومتی پھروں تو مجھے کوئی نہیں پہچان سکے گا۔‘‘ میں نے بے بسی سے اس ضدی لڑکی کی طرف دیکھا۔ ’’آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟‘‘ لیلیٰ نے غور سے میری طرف دیکھا، میری نظر خود بخود جُھک گئی ’’میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ تم یوں دُم چھلا بن کر میرے ساتھ نہ پھرا کرو۔ میری سہیلیاں کتنا مذاق اڑاتی ہیں، میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔‘‘ میری نظر بے اختیار اٹھ گئی۔ لیلیٰ نے جلدی سے بات جوڑی ’’میری بات کا غلط مطلب مت لینا۔ میں تمہارا مذاق نہیں اُڑا رہی۔ مگر جب ہم ساتھ چلتے ہیں، تو مذاق بن ہی جاتا ہے۔ میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ تم دکھاوے کے لیے میرے ساتھ گھر سے نکلا ضرور کرو، مگر کسی مال یا شاپنگ پلازا میں، مَیں اسکارف اور نقاب پہن کر اپنا حلیہ بدل لیا کروں گی۔ تم وہیں کسی کیفے میں بیٹھ کر میرا انتظار کیا کرنا، اور مَیں اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھوم پھر کر دوبارہ وہیں آ جایا کروں گی، لیکن ہم دونوں گھر ایسے ہی آیا کریں گے، جیسے تم مستقل میرے ساتھ تھے۔ آغا بہروز کو اطمینان رہے گا، تمہارا بھرم بھی سب پہ قائم رہے گا، اور میں بھی کچھ گھنٹوں کے لیے ان ساری زنجیروں سے آزاد ہو کر اپنی زندگی جی لیا کروں گی...... بولو، میرا ساتھ دو گے پَری زاد......؟‘‘ اپنا نام لیلیٰ صبا کی زبان سے سُن کر میں زور سے چونکا۔ اس نے اب تک کبھی مجھے یوں براہِ راست نام لے کر مخاطب نہیں کیا تھا۔ کچھ لہجے، کچھ بولیاں کچھ تلفظ اور کچھ لبوں کی ایک جنبش ہی سے عام سے حرف، لفظ اور نام کتنے معتبر ہو جاتے ہیں۔ میرا دل بھی کتنا پاگل تھا، پَل بھر ہی میں یہ بھول گیا کہ کل تک یہی عورت مجھے کس نفرت اور حقارت سے پکار رہی ہے، مگر میں اب تک اس لہجہ بدلنے کے فن اور ہنر سے ناواقف ہی تھا۔ لہٰذا میرا جواب بھی سیدھا سادہ سا تھا۔ ’’شاید مالک میرا یوں لاؤنج میں بیٹھ کر پیانو سیکھنا پسند نہ کریں۔ میری حدود اس لاؤنج سے باہر تک ہیں‘‘ لیلیٰ نے اس مسئلے کا حل بھی چٹکیوں میں نکال لیا۔ ’’کوئی بات نہیں، تم اپنی انیکسی میں پیانو رکھوا سکتے ہو۔ اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ میں آج ہی تمہارے لیے ایک نیا پیانو بُک کروا دیتی ہوں۔ ویسے بھی بہت عرصے سے انیکسی کی نئی تزئین و آرائش کا سوچ رہی تھی۔ اسی بہانے یہ کام بھی ہو جائے گا۔‘‘ جواب میں کہنے کے لیے میرے پاس اب کچھ نہیں بچا تھا۔

اگلے دو دن کے اندر انیکسی کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا گیا، نیا رنگ، نئے پردے، قالین، پینٹنگز، آرائش اور سب سے بڑھ کر سیاہ رنگ کا ایک بڑا سا خوب صورت پیانو، جب کاری گر وہ پیانو انیکسی کے ہال میں رکھوا کر اس کی فٹنگ کر رہے تھے، تو میں وہیں بیٹھا اپنے ایک دیرینہ خواب کو پورا ہوتے دیکھ رہا تھا۔ خواب حقیقت میں ڈھلنے لگیں تب بھی بہت دیر تک ہمیں خواب ہی لگتے ہیں۔ شاید انسان سدا کا بے اعتبار ہے یا پھر مجھ جیسے، جن کے خواب، سدا خواب ہی رہتے ہیں۔ اُسی شام مارتھا نے مجھے ایک گھنٹے کی ٹیوشن میں پیانو کی بنیادی کلوں اور سُروں کے بارے میں پہلی کلاس دی، اور تیسرے دن میری انگلیوں نے پہلی مرتبہ کسی دُھن کو چھیڑا۔ اس درمیان لیلیٰ دو مرتبہ گھر سے باہر نکلی اور شہر کے وسط میں واقع ایک کثیر المنزلہ شاپنگ مال میں داخل ہو کر اس نے اپنے منصوبے کے مطابق خود کو اسکارف اور نقاب سے ڈھانپ لیا۔ میں وہیں ایک کیفے میں بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا اور قریباً تین چار گھنٹے کے درمیان وہ واپس لوٹ آئی۔ اس مال کے دونوں طرف آنے اور جانے کے راستے واقع تھے اور لیلیٰ نے باہر نکلنے کے لیے پچھلے راستے کا انتخاب کیا تھا، پھر ایک دن کے وقفے کے بعد وہ اپنی اُسی سہیلی سے ملنے کے لیے گئی، جہاں میں بھی ایک بار اُس کے ساتھ جا چکا تھا، مگر اس بار اس نے مجھے نچلے فلور ہی پر رکنے کا اشارہ کیا اور خود لفٹ کے ذریعے اوپر چلی گئی۔ بہروز کے واپس آنے میں ابھی دو دن باقی تھے۔ میں نے لیلیٰ کی بات مان تو لی تھی، مگر میں اندر سے نہ جانے کیوں ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا، میں جانتا تھا کہ مَیں بہروز کا حکم نہ مان کر بہت بُرا کر رہا ہوں، مگر لیلیٰ کی آزادی کی خواہش بھی مجھے جائز ہی لگ رہی تھی، عجیب کشمکش جاری تھی میرے دل و دماغ کے درمیان۔ دل کہتا تھا کہ لیلیٰ کا ساتھ دے کر میں نے کچھ غلط نہیں کیا، مگر دماغ کچھ الگ ہی راگ الاپ رہا تھا۔ جانے یہ دل اور دماغ نامی دو سوکنوں کی آپس میں کبھی بنتی کیوں نہیں۔ اور پھر، جب اس کشمکش نے مجھے پوری طرح نڈھال کر دیا، تو تیسرے دن لیلیٰ کے مال سے نکلنے سے پہلے ہی میں ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ لیلیٰ جیسے ہی مال کے پچھلے دروازے سے باہر نکلی، میں بھی کیفے سے نکل کر اس کے پیچھے چل پڑا۔ لیلیٰ نے خود کو ایک لمبی سی عبایا سے ڈھانپ رکھا تھا، وہ سڑک پار کر کے دوسری جانب بنے ایک پارکنگ میں پہنچی، جہاں پہلے سے ایک سیاہ لینڈ کروزر ٹائپ گاڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

یہ گاڑی میں پہلے بھی لیلیٰ کی دوست کے اپارٹمنٹ کے نیچے کھڑی دیکھ چکا تھا، مطلب لیلیٰ اپنی اُسی دوست سے ملنے جا رہی تھی یا اس کے ساتھ مل کر کہیں اور گھومنے جا رہی تھی۔ میں نے فوراً قریب سے گزرتی ٹیکسی کو ہاتھ دیا اور اُسے آگے جاتی سیاہ گاڑی کے پیچھے چلنے کو کہا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں لیلیٰ کو بتائے بغیر اس کی نگرانی جاری رکھوں گا، اس طرح میری اُلجھن کا حل بھی نکل آئے گا اور لیلیٰ کو بھی میری وجہ سے اپنی سہیلیوں اور رشتے داروں کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔ دبئی کی سڑکوں کا ہجوم اور ٹیکسی کے لیے مقررہ رفتار کی حد ہماری گاڑی کی راہ میں حائل تھی۔ مگر ہم پھر بھی کسی نہ کسی طرح اس سیاہ بڑی گاڑی کا پیچھا کرتے رہے۔ لیکن، پھر ایک سگنل کے اچانک بند ہونے کی وجہ سے لیلیٰ کی گاڑی نظروں کے سامنے ہی دور ہوتی ہوتی، اوجھل ہو گئی۔ سگنل کھلنے کے بعد ٹیکسی ڈرائیور نے پوری کوشش کی کہ ہم دوبارہ اسے پکڑ سکیں، مگر ناکام رہے۔ تھک ہار کر ہم دوبارہ اُسی مال کے باہر آ کر رک گئے، جہاں سے میں نے ٹیکسی پکڑی تھی۔ مجھے کیفے میں دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا، تب کہیں جا کر لیلیٰ کی صورت، دکھائی دی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی، ہم واپس گھر پہنچے تو لیلیٰ اُتر کر اندر چلی گئی اور میں نے انیکسی کی جانب قدم بڑھائے ہی تھے کہ میرے عقب میں ایک گرج دار آواز گونجی، ’’اتنی دیر کہاں لگا دی تم لوگوں نے......؟‘‘ میں گھبرا کر واپس پلٹا، کچھ فاصلے پر بہروز کریم کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔

(جاری ہے)



......ہاشم ندیم......

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین'' روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

بہروز کی آواز سُن کر ایک لمحے کے لیے تو جیسے میرا خون ہی خشک ہوگیا۔ انسان بظاہر تو بڑے بڑے ڈاکے مار کر صاف بچ نکلتا ہے، مگر اس دل کے چور کی ایک چھوٹی سی چوری چُھپائے نہیں چُھپتی۔ میں نے ہڑبڑا کر بہروز کو سلام کیا۔ ''مالک آپ واپس آگئے......؟'' بہروز مسکرایا ''تو کیا کچھ غلط کیا واپس آ کر۔ مگر تم لوگ اتنی دیر سے کہاں تھے؟'' میں نے نظریں جُھکائے صرف اتنا بتایا کہ مالکن کو کچھ ضروری خریداری کرنی تھی، لہٰذا ہم شاپنگ مال تک گئے تھے۔ بہروز نے بظاہر اس بات کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا، مگر خود میرے اندر کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ انسان کے جسم اور دماغ کو سُلانے اور سُن کرنے کے لیے بازار میں ہزار ادویہ مل جاتی ہیں، مگر سارے زمانے کے وید، حکیم اور طبیب مل کر بھی ایسی دوا ایجاد نہیں کر پائے، جو چند لمحوں کے لیے کسی کے جاگے ہوئے ضمیر کو سُلا دے۔ بہروز کے گھر واپس لوٹنے کے بعد لیلیٰ نے باہر نکلنا کم کردیا۔ اب وہ تین چار دن بعد گھنٹے دو گھنٹے کے لیے باہر گھوم آیا کرتی، مگر زیادہ تر گھر ہی میں رہتی۔ ان دنوں میں مجھے ماریتھا سے پیانو سیکھنے کا بھرپور وقت ملا اور مہینے بھر میں، انگلیاں پیانو پر خوب چلنے لگیں۔ خود ماریتھا بھی میری اس تیز پیش رفت اور لگن سے بہت خوش تھی۔ ایک شام میں تنہا بیٹھا پیانو پر کسی نئی دھن کی مشق کرتے ہوئے اپنے آپ میں اس قدر مگن ہوگیا کہ مجھے انیکسی کے دروازے سے اندر ہال تک آتی قدموں کی چاپ بھی سُنائی نہ دی اور چونکا اُس وقت، جب پس منظر میں بہروز کریم کی بھاری آواز گونجی۔ ''اچھا بجا لیتے ہو......'' میں گھبرا کر چونک سا گیا اور جلدی سے کھڑا ہوگیا۔ ''معاف کیجیے' مجھے آپ کے آنے کا پتا نہیں چلا۔'' بہروز نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ''انسان کو اپنے اندر اتنا مگن نہیں ہونا چاہیے کہ اپنی طرف بڑھنے والے قدموں کی چاپ بھی نہ سنائی دے۔ آنے والا دشمن بھی ہوسکتا ہے۔'' میں نے دوبارہ معذرت کی۔ اس نے آگے بڑھ کر پیانو کی بے داغ سطح پر ہاتھ پھیر کر اسے غور سے دیکھا۔ ''مجھے صبا نے بتایا تھا کہ اس نے انیکسی میں پیانو رکھوادیا ہے۔ تم نے بہت تھوڑی مدت میں اپنی مالکن کا اعتبار جیت لیا، حالاں کہ لیلیٰ صبا جیسی عورت کے خیالات اپنے حق میں بدلنا بہت مشکل کام ہے...... ایسا کیا جادو ہے تمہارے پاس پری زاد، ہمیں بھی تو بتاؤ......؟'' میں نے چونک کر بہروز کی طرف دیکھا، مگر اس کے چہرے پر حسبِ معمول کوئی مثبت یا منفی تاثر نہیں تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ایسے بے تاثر چہرے والے لوگ، بہت غیر متوقع شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ میں چُپ رہا۔ بہروز چند ضروری ہدایات دے کر واپس پلٹ گیا۔

اگلے ہفتے کی ابتدا ہی سے محل کی نئی سجاوٹ اور تزئین شروع ہوگئی۔ پتا چلا کہ دو دن بعد لیلیٰ صبا کی سال گرہ ہے اور بہروز پچھلے سال کی طرح اسے انتہائی دھوم دھام سے منانا چاہتا ہے۔ لیلیٰ بھی انتہائی خوش دکھائی دیتی تھی، مگر نہ جانے کیوں مجھے لیلیٰ کے اس کِھلے ہوئے چہرے کے پیچھے کبھی کبھی ایک بڑی گہری اُداسی چُھپی دکھائی دیتی۔ شاید بہت زیادہ خوشی اور اطمینان بھی اپنے ساتھ ایک نامعلوم سی اُداسی لے کر وارد ہوتے ہیں یا پھر ساری بات توازن کی ہے۔ تھوڑی سی پریشانی، بے قراری اور بے چینی بھی ضروری ہے، زندگی کے ترازو کو برابر رکھنے کے لیے۔ اگلے روز جب بہروز سال گرہ کی تیاریوں میں مصروف تھا اور محل کے دالان میں بیٹھا ہم سب کو مختلف ہدایات دے رہا تھا کہ اچانک فیروز خان پریشانی میں تیز تیز قدم اٹھاتا بہروز کے قریب آیا اور جُھک کر بہروز کے کان میں کوئی بات کہی۔ لیلیٰ بھی اُسی وقت وہاں پہنچی تھی، اس نے بہروز کے چہرے پر پریشانی اور کشمکش کے آثار دیکھے تو فیروز خان کو جھڑک دیا۔ ''تمہیں کتنی بار منع کیا ہے میں نے فیروز، یوں وقت بے وقت انھیں پریشان مت کیا کرو۔'' فیروز سر جھکائے کھڑا رہا۔ بہروز نے فیروز کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ایک آدھ دن آگے نہیں ہوسکتا یہ سودا......؟'' ''نہیں مالک! وہ لوگ بہت دور سے آئے ہیں۔ اتنا لمبا انتظار نہیں کریں گے ہمارا۔ ان کا زیادہ دیر جزیرے پر انتظار کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں۔'' بہروز نے ایک گہری سانس لی ''مگر فیروز خاناں! تم جانتے ہو کل تمہاری مالکن کی سال گرہ ہے، اور میں پورا سال اس دن کا انتظار کرتا رہا ہوں۔'' لیلیٰ نے چلّا کر پوچھا۔ ''کوئی مجھے بھی بتائے گا۔ یہ سب کیا چل رہا ہے......؟'' بہروز نے ٹھنڈے لہجے میں لیلیٰ کو بتایا کہ ایک بہت ضروری سودے کے لیے اسے دو راتوں کے لیے ایک قریبی جزیرے پر جانا تھا۔ یہ سودا پہلے سے طے شدہ تو تھا، مگر فیروز نے ابھی آ کے بتایا کہ انہیں آج شام ہی نکلنا ہوگا۔ لیلیٰ یہ سُنتے ہی غصّے سے کھڑی ہوگئی۔ ''ٹھیک ہے آغا! تو پھر آپ جائیں اپنے ضروری سودے کے لیے، مگر مجھ سے بھی دوبارہ کبھی بات کرنے کی کوشش نہ کیجیے گا۔ نہیں منانی مجھے کوئی سال گرہ وغیرہ۔'' لیلیٰ پیر پٹختے ہوئے اندر چلی گئی اور بہروز اسے آوازیں دیتا رہ گیا۔ لیلیٰ کے جانے کے بعد بہروز نے غصّے سے گھور کر فیروز کی طرف دیکھا۔ ''کردیا ناں اسے ناراض، فیروز خان۔ تم کبھی موقع محل دیکھ کر بات نہیں کرتے۔ جاؤ، چلنے کی تیاری کرو۔ میں اسے منا کر آتا ہوں......'' بہروز بھی اٹھ کر اندر چلا گیا۔ جانے اس نے کس طرح اپنی محبوب بیوی کو رضامند کیا ہوگا، مگر جب شام کو وہ گھر سے رخصت ہونے کے لیے نکلا تو لیلیٰ صبا بھی اسے پورچ تک چھوڑنے کے لیے آئی، البتہ اس کے چہرے پر خفگی کے آثار ابھی تک نمایاں تھے اور وہ بجھی بجھی سی دکھائی دے رہی تھی۔ بہروز کریم جانے سے پہلے جلد واپس لوٹنے اور پھر بہت دن اس کے ساتھ رہنے کے وعدوں کے ساتھ رخصت ہوگیا۔ لیلیٰ بھی پلٹ کر اندر چلی گئی۔ انسان ساری زندگی وعدے کرنے اور وعدے نبھانے کی زنجیر ہی سے بندھا رہتا ہے اور شاید ہم دوسروں سے

کیے وعدے تو نبھا بھی لیتے ہیں، مگر اپنے آپ سے کیے وعدے سدا وفا ہونے کا انتظار ہی کرتے رہتے ہیں۔ میں نے بھی اپنے آپ سے ایک وعدہ کیا تھا کہ اب اگر لیلیٰ نے مجھ سے کہیں اکیلے جانے کی ضد کی تو میں اسے صاف بتادوں گا کہ میں بہروز کے ساتھ مزید غداری نہیں کرسکتا۔ ہاں، یہ غداری ہی تو تھی کہ میں بہروز کی دی ہوئی ہدایات پر پوری طرح عمل نہیں کر پا رہا تھا۔ دوسرے روز حسبِ توقع لیلیٰ نے سرِ شام ہی کہیں جانے کی ٹھان لی۔ اور ہم گاڑی میں ان ہی اپارٹمنٹس کی پارکنگ میں پہنچ گئے، جہاں ساتویں منزل پر لیلیٰ کی سہیلی رہتی تھی۔ میں نے لیلیٰ سے دبے لفظوں میں کہا کہ ہمیں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہیے، کیوں کہ مالک نے مجھے جاتے ہوئے خاص طور پر ہدایت کی ہے کہ ان دنوں میں لیلیٰ کے ساتھ کہیں بھی باہر نکلنے سے گریز کروں، کیوں کہ وہ جس بڑے کاروباری سودے کے لیے گھر سے جا رہے ہیں، وہ اس کے حریفوں کے دلوں میں کاروباری رقابت کی آگ مزید سلگا کر انہیں کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کرسکتا ہے۔ لیلیٰ نے میری بات سُن کر ایک گہری سانس لی۔ ”ہاں، وہ جاتے ہوئے مجھے بھی گھر سے نہ نکلنے کی تاکید کر گئے ہیں۔ مگر تم فکر نہ کرو۔ میں جلدی مل کر واپس آجاؤں گی۔ میری دوست نے میری سال گرہ کے لیے خاص اہتمام کر رکھا ہے۔ نہ آتی تو وہ مجھ سے ناراض ہو جاتی۔“ لیلیٰ تیزی سے لفٹ کی جانب بڑھ گئی اور میں اپنے ساتھ کیے وعدے کی لاش اپنے کاندھوں پر اٹھائے، وہیں تہہ خانے کی پارکنگ میں کھڑا رہ گیا۔

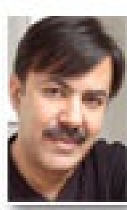
شام تیزی سے ڈھل رہی تھی اور پارکنگ لاٹ میں لگی بتیاں دھیرے دھیرے ایک ایک کرکے جلنا شروع ہو چکی تھیں۔ جب لیلیٰ کو گئے تین گھنٹے سے زیادہ ہونے کو آئے تو میں نے خود اوپر جانے کا فیصلہ کرلیا۔ ابھی قدم بڑھائے ہی تھے کہ لیلیٰ تیزی سے لفٹ سے نکل کر میری جانب بڑھتی نظر آئی۔ وہ اپنا اسکارف لپیٹ کر پرس میں رکھ رہی تھی۔ ”آپ نے بہت دیر کردی۔ آج تو ہم نے آتے وقت آپ کی ہدایت کے مطابق محافظوں کی گاڑی کو بھی منزل سے آگاہ نہیں کیا تھا، وہ سب وہاں گھر میں بے چین ہوں گے۔“ لیلیٰ نے جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ ”ہاں! بس دیر ہوگئی، مگر اب چلو۔ ہمیں وہاں گھر میں یہی تاثر دینا ہے کہ ہم قریبی مال سے روزمرہ کی چند ضروری چیزیں لینے کے لیے اچانک نکل گئے تھے، لہٰذا بتانے کا موقع ہی نہیں ملا۔“ میں بھی جلدی سے گاڑی کی طرف بڑھا اور ٹھیک اُسی وقت تہہ خانے کی مصنوعی سرد فضا میں ایک بھاری آواز گونجی۔ ”ایسی بھی کیا جلدی ہے جانِ آغا! دیکھو ہم تو تمہاری تلاش میں خود ہی چل کر یہاں تک آپہنچے ہیں۔“ میرے قدموں تلے زمین سرک گئی، دور اندھیرے میں ایک ستون کی آڑ میں کھڑی گاڑی سے بہروز کریم اور فیروز خان اُتر کر ہماری جانب بڑھتے دکھائی دیے۔ پس منظر میں محافظوں کی وہ جیپ بھی نظر آئی، جسے میں اور لیلیٰ اپنی دانست میں چکمہ دے کر گھر ہی میں چھوڑ آئے تھے۔ لیلیٰ کے چہرے کا رنگ بھی پل بھر میں زرد پڑ گیا اور میں نے اس کے جسم میں باقاعدہ کانپنے جیسی لرزش دیکھی۔ بہروز نے لیلیٰ کے قریب پہنچ کر پیار سے اس کی ٹھوڑی اٹھا کر لیلیٰ کا جُھکا ہوا چہرہ بلند کیا۔ ”یہ کیا بات ہوئی جانِ آغا! میرے منع کرنے کے باوجود تم گھر سے نکل آئیں۔ کیا کوئی نئی سہیلی بنالی ہے تم نے یہاں۔ ہمیں بھی تو اس سے ملواؤ۔ جس کے پیار میں اتنی کشش ہے کہ تم اپنے محبوب آغا کے حکم کا مان بھی نہ رکھ پائیں۔“ لیلیٰ نے جلدی سے جھک کر بہروز کے پاؤں پکڑ لیے ”معاف کردیں مجھے آغا! بڑی بھول ہوگئی مجھ سے۔ مجھے واقعی گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ مگر میں کسی کی باتوں کے بہکاوے میں آگئی تھی۔ آئندہ ایسی غلطی کبھی نہیں ہوگی۔“ بہروز کا چہرہ اب بھی سپاٹ تھا۔ ”میں تمہیں تو معاف کردوں گا جانِ آغا! مگر اُسے کبھی معاف نہیں کروں گا، جس نے تمہیں بہکا کر گھر سے نکالا اور میری حکم عدولی کی۔ بتاؤ، کون ہے وہ بدنصیب......“ لیلیٰ نے اپنا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اٹھایا ”کہا ناں آغا، بڑی غلطی ہوگئی۔ میں گھر میں بیٹھے بیٹھے اوب گئی تھی۔ اس لیے یہاں چلی آئی۔ یہاں ٹاپ فلور پر ایک بہت اچھا ریستوران ہے۔ سوچا، کافی پی کر دل بہلالوں گی۔ اور مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے۔“ بہروز نے دوبارہ سختی سے پوچھا ”کون ہے وہ، جس نے تمہیں یہاں آنے پر مجبور کیا......؟“ لیلیٰ دھیرے دھیرے کھڑی ہوگئی اور اس نے اپنی انگلی میری جانب اٹھادی۔ ”یہ پَری زاد...... یہی مجھے اس طرح کی الٹی سیدھی پٹیاں پڑھاتا رہتا تھا کہ یہ زندگی میری اپنی ہے، مجھے اسے اپنی مرضی سے جینا چاہیے۔ میں کوئی پنجرے میں قید، قیدی تو نہیں ہوں کہ ہر لمحہ گھٹ گھٹ کر جیوں۔“ لیلیٰ چیخ چیخ کر مجھ پر الزام لگاتی رہی اور میں تو جیسے پل بھر ہی میں اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ مجھ سے کچھ کہا ہی نہیں گیا۔ ایک لمحے کو میری لیلیٰ سے نظر ملی اور مجھے لگا، میرے سامنے لیلیٰ نہیں ناہید کھڑی ہے اور ہم دبئی میں نہیں، میرے پرانے محلے میں کھڑے ہیں۔ بہروز کریم نے اطمینان سے لیلیٰ صبا کی بات سُنی اور میری طرف پلٹا ”اچھا...... تو یہ ہے وہ نمک حرام...... اس سے مجھے ایسی امید ہرگز نہ تھی۔ مگر جانِ آغا، تمہیں تو کچھ خیال کرنا چاہیے تھا ناں۔ اگر اس کی نیت میں کوئی فتور پیدا ہو جاتا اور میرے دشمنوں کے ساتھ مل کر یہ تمہیں کوئی نقصان پہنچا دیتا تو سوچو، پھر میرا کیا ہوتا۔“ ”مجھے ایک غلام کی باتوں میں نہیں آنا چاہیے تھا۔“ لیلیٰ روتے ہوئے گڑگڑائی ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آغا، اس پَری زاد نے اپنے ذرا سے فائدے کے لیے مجھے میری راہ سے بھٹکا دیا۔ میری ہم دردی حاصل کرنے کے لیے میرے دل میں بغاوت کی چنگاری بھڑکا دی۔ آپ تو جانتے ہیں، میں آپ کے بنا کتنی تنہا پڑ جاتی ہوں۔ یہ ضرور مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہوگا۔ تب ہی مجھے یوں اکیلے گھر سے نکلنے پر اُکساتا رہا۔ اچھا ہوا آپ لوگ ٹھیک وقت پر یہاں پہنچ گئے۔“ میں حیرت سے گنگ اور اپنی جگہ جما کھڑا لیلیٰ کی یہ ساری خرافات سُنتا رہا۔ بہروز دھیرے دھیرے چلتا میرے قریب آیا اور اس کی آنکھیں میری آنکھوں میں گڑ گئیں۔ ”تم بتاؤ پَری زاد...... کیا لیلیٰ ٹھیک کہہ رہی ہے؟ اور کوئی بھی جواب دینے سے قبل اتنا ضرور سوچ لینا کہ بہروز کریم کی عدالت میں غداری کی صرف ایک سزا مقرر ہے، سزائے موت۔“ میں نے ایک پل کے لیے نظر اٹھا کر لیلیٰ کی طرف دیکھا۔ وہ لاتعلق سی کھڑی تھی۔ بہروز دوسری بار زور سے چلایا۔ ”جواب دو لڑکے...... کیا یہ سچ ہے......؟“ میں نے سر جھکا لیا ”جی ہاں، مالکن جو کہہ رہی ہیں، سچ کہہ رہی ہیں۔ میں ہی انہیں بہانے سے گھر سے باہر لے کر آیا تھا۔“ ایک لمحے کے لیے لیلیٰ کی آنکھوں میں بے یقینی کی ایک چمک لہرائی، مگر پھر فوراً ہی اس نے خود کو نارمل کرلیا۔ بہروز کریم نے سرسراتی آواز میں مجھ سے پوچھا ”کوئی آخری خواہش ہو تو بتادو۔ تمہاری گنتی کی چند سانسیں باقی رہ گئی ہیں۔“ میں نے بہروز کی طرف دیکھا ”جی مالک...... بس ایک آخری خواہش ہے۔ مجھے مارنے کے بعد میرا چہرہ مسخ کردیجیے گا۔ میں نے یہ زندگی تو جیسے تیسے اس چہرے کے ساتھ گزار لی۔ مگر میں قبر میں اس شناخت کے ساتھ ہرگز نہیں جانا چاہتا۔“ بہروز کچھ دیر تک میری طرف دیکھتا رہا، مجھے اس کے لہجے میں پہلی بار اپنے لیے غصّے سے زیادہ افسوس کا عنصر محسوس ہوا۔ ”جانتے ہو، مرد کی بربادی

کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے، ٹھیک اُس لمحے، جب وہ اپنے دل کے فیصلوں پر عمل شروع کر دیتا ہے۔ میری طرح تم نے بھی خود کو اس عورت کی خاطر برباد کر لیا، پَری زاد...... بُرا کیا، بہت بُرا کیا تم نے۔'' بہروز پلٹا اور زور سے چلایا۔'' اسے لے آؤ فیروز خان......'' بہروز کی آواز اس ویران تہہ خانے کی پارکنگ میں گونج کر رہ گئی۔ اُس روز مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ لیلیٰ خاص طور پر اس پارکنگ میں گاڑی کیوں لگواتی تھی، کیوں کہ یہ پارکنگ تقریباً متروک ہو چکی تھی اور اپارٹمنٹ والے اب چھت پر بنی نئی پارکنگ استعمال کرتے تھے۔ لہٰذا یہاں کسی کا آنا جانا نہیں تھا۔ اس لیے لیلیٰ کی گاڑی گھنٹوں یہاں کھڑی رہتی، تب بھی کسی کے متوجہ ہونے کا امکان ذرا کم ہی تھا۔ مگر آج وہی ویرانی اور تنہائی اس پارکنگ میں ہمارے لیے وبالِ جان بن گئی تھی۔ بہروز کے چلانے پر کچھ دیر بعد فیروز خان دو محافظوں کی مدد سے ایک خوب صورت اور ہینڈسم سے نوجوان کو سختی سے جکڑے اور اس کے منہ پر ٹیپ لپیٹے ایک جانب سے برآمد ہوا۔ میں نے اسے حیرت سے دیکھا، کیوں کہ آج سے پہلے میری اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ مگر لیلیٰ کے جسم سے تو جیسے خون کا آخری قطرہ بھی نچڑ گیا۔ وہ خوف زدہ انداز میں زور سے چلائی ''نہیں آغا نہیں...... اس میں ولید کا کوئی قصور نہیں...... بخش دیں اسے۔'' لیلیٰ دوڑتی ہوئی آئی اور بہروز کے قدموں سے لپٹ گئی۔ بہروز نے کسی اَن دیکھی اذیت کے احساس سے اپنی آنکھیں زور سے میچ لیں اور دھیرے سے یوں بڑبڑایا، جیسے خود کلامی کر رہا ہو۔'' کیوں جانِ آغا...... کیوں...... کس چیز کی کمی تھی تمہیں...... کیا نہیں دیا میں نے تمہیں؟ پیار، محبت، عیش، آرام، دولت، جائیداد، رتبہ، عزت...... آخر کس چیز کی کمی تھی میرے پاس تمہیں؟'' لیلیٰ زاروقطار رو رہی تھی اور وہ اجنبی نوجوان بہروز کے محافظوں کے شکنجے میں تڑپ رہا تھا۔ بہروز نے لڑکے کی طرف دیکھا۔'' یہ وہی ہے ناں، تمہارا سابقہ منگیتر، استنبول والا، ولید......'' لیلیٰ تڑپ کر آگے بڑھی۔'' ہاں آغا! یہ وہی ہے، اسے میری محبت یہاں کھینچ لائی...... یہ سچ ہے کہ آپ نے مجھے سب کچھ دیا۔ پر میں اپنی پہلی محبت کبھی بُھلا نہیں پائی۔ معاف کر دیں ہم دونوں کو۔ میں آپ کی منت کرتی ہوں۔ کم از کم اسے جانے دیں۔'' بہروز نے کرب سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ رقیب کو سامنے زندہ دیکھنے سے زیادہ اذیت ناک، اپنے محبوب کی زبان سے اس کی تعریف سُننا ہوتا ہے۔ بہروز نے لیلیٰ کی طرف دیکھا۔'' واہ رے عورت! واہ، ساری کائنات کے سربستہ راز ایک جانب اور تیرے من کا گورکھ دھندا ایک طرف۔ تجھے سمجھنا کسی کے بس کی بات نہیں۔'' بہروز ایک جھٹکے سے فیروز کی طرف مڑا۔'' میں نے تم سے کہا تھا ناں فیروز خان! ہمارے پیچھے کچھ چکر چل رہا ہے۔ اب دیکھ لیا اپنی آنکھوں سے؟'' فیروز خان نے سر جُھکا لیا۔ اب مجھے بہروز کی منصوبہ بندی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر مجھے لیلیٰ کی نگرانی پر رکھا تھا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ لیلیٰ صبا میری نگرانی میں غیر محتاط ہو جائے گی۔ اس کی سال گرہ والے دن جزیرے پر جانے کا پروگرام بھی ساری ڈرامے بازی تھی۔ وہ کبھی شہر سے باہر گیا ہی نہیں تھا۔ اسے بہت پہلے سے لیلیٰ کی بے وفائی کا علم تھا۔ وہ تو بس لیلیٰ کو رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتا تھا۔ سب مُہرے بہروز نے بہت ناپ تول کر چنے تھے۔ ساری بساط ہی بہروز کی اپنی بچھائی ہوئی تھی۔ اور اب بازی بھی اسی کے ہاتھ تھی۔ بہروز نے کھوئی کھوئی آنکھوں سے فیروز خان کی طرف

دیکھا۔'' مجھے لیلیٰ صبا بہت پیاری ہے فیروز...... بہت ٹوٹ کر محبت کی ہے میں نے اس سے...... دھیان رہے، اسے مرتے وقت زیادہ تکلیف نہ ہو اور ولید چوں کہ میری محبوب کا محبوب ہے۔ لہٰذا اس کی موت بھی اس کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں ہونی چاہیے۔ آخر یہ بہروز کریم کا رقیب ہے۔ یہ اگر عام لچے لفنگے عاشقوں کی طرح مارا گیا، تو یہ اس کے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی۔ لے جاؤ ان دونوں کو۔'' لیلیٰ زور سے چلائی۔'' نہیں آغا! نہیں......'' فیروز نے محافظوں کو اشارہ کیا، انہوں نے لڑکے اور لیلیٰ کو لے جانے کے لیے کھینچا۔ بہروز دھیرے سے بڑبڑایا'' عشق بڑا ظالم ہوتا ہے...... جان کا صدقہ لیے بنا کہاں ٹلتا ہے۔'' اب مجھ سے صبر نہیں ہو سکا اور میں جلدی سے بہروز کی طرف بڑھا۔'' انہیں معاف کر دیں مالک! ان کا قصور بہت بڑا ہے، مگر آپ رحم کریں۔'' میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی میرے سر پر کسی محافظ کی خود کار مشین گن کا دستہ پوری قوت کے ساتھ ٹکرایا اور میرا ذہن اندھیروں میں ڈوب گیا۔ گرنے سے پہلے میں نے تہہ خانے کے کسی کونے سے دو فائرز کی آواز سُنی۔ اور ان سے زیادہ بلند لیلیٰ کی کرب ناک چیخ تھی، پھر دھیرے دھیرے میرا وجود گہرے تاریک اندھیرے کے اتھاہ سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔

سائنس دان موت کی ایک تشریح یہ بھی کرتے ہیں کہ جب انسانی دماغ سے نکلنے والی برقی نبض (Electrical impulse) تھم جائے تو اسے روح نکل جانے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اور روح نکل جانے کے بعد انسانی جسم کی حالت کو ہم موت کہتے ہیں۔ جانے میری روح کتنے عرصے بعد دوبارہ میرے جسم میں واپس آئی۔ رات کا شاید آخری پہر تھا۔ میں کسی اندھیرے کمرے میں بستر پر پڑا ہوا تھا، مگر یہاں اتنا اندھیرا کیوں تھا۔ ضرور بہروز نے ان دونوں کے ساتھ مجھے بھی ختم کر دیا تھا۔ اور اب میں کمرے میں نہیں، کسی قبر میں دفنایا جا چکا تھا۔ ٹھیک ہی کیا بہروز نے۔ زندگی کے کسی امتحان میں بھی تو پورا نہیں اُتر پایا تھا میں...... چلو، جو ہوا، اچھا ہوا۔ قصہ تمام ہوا۔ شجر تو تھے ہی نہیں راستے میں کیا کرتے...... خود اپنے سائے میں چل کر سفر تمام کیا۔ مگر میرا سفر ابھی کچھ باقی تھا شاید...... اچانک کمرے میں تیز روشنی ہو گئی اور کسی نے دھیرے سے میرا نام پکارا۔'' پَری زاد...... ہوش میں آؤ، ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

(جاری ہے)



ہاشم ندیم ....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، مُلک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ’’خدا اور محبت‘‘ اور ’’بچپن کا دسمبر‘‘ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ’’عبداللہ‘‘ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ’’عبداللہ‘‘ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چُکے ہیں۔

’’پری زاد‘‘ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ’’سنڈے میگزین‘‘ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

رومی کہتا ہے کہ ’’تمہارا مقصد محبت کی تلاش میں بھٹکنا نہیں...... تمہیں تو بس ان تمام رکاوٹوں کو کھوجنا ہے، جو تم نے خود اپنے اندر اس محبت کے خلاف کھڑی کر رکھی ہیں۔‘‘ میں بھی شاید اپنے اندر کی رکاوٹیں کھوج لیتا، اگر مجھے مزید کچھ دیر اس بے ہوشی کے سمندر میں غرق رہنے کا موقع مل پاتا، مگر کوئی مجھے زور زور سے جھنجھوڑ رہا تھا۔ ’’پَری زاد، ہوش میں آؤ...... ہم یہاں سے کوچ کر رہے ہیں......‘‘ میری چندھیائی آنکھوں نے فیروز خان کا دُھندلا سا ہیولا دیکھا، جو مجھ پر جُھکا مجھے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا، چند لمحوں کی غنودگی کے بعد میں ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں انیکسی میں اپنے کمرے کے بستر پر تھا۔ فیروز نے میرا چہرہ تھپتھپایا۔ ’’جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہم سب کچھ دن کے لیے کسی دوسری جگہ منتقل ہو رہے ہیں۔ تمہارے پاس صرف آدھا گھنٹہ ہے۔ ہم لوگ باہر گاڑیوں کے قریب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔‘‘ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دوپہر کی تیز دھوپ ڈھل رہی تھی۔ مطلب میں پورا دن بے سُدھ پڑا رہا تھا۔ میرے سَر میں ابھی تک درد سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ ہاتھ لگا کر دیکھا تو پٹی بندھی ہوئی تھی۔ کھڑے ہوتے ہی مجھے ایک زوردار چکّر آیا اور میں نے جلدی سے پلنگ کی پائنتی کو پکڑ لیا۔ کچھ دیر تک سُرخ اور سیاہ دائرے آنکھوں کے سامنے رقص کرتے رہے اور پھر میں اپنے ڈولتے قدم سنبھال سنبھال کر رکھتا باہر نکل آیا۔ پورچ میں تقریباً سبھی گاڑیاں روانگی کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ سارا گھر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ یہ عمارتیں مکینوں کے بنا کتنی ویران ہو جاتی ہیں۔ شاید انسان دنیا کا سب سے بڑا ساحر، جادوگر ہے، لوگوں کو تو اپنا عادی بناتا ہی ہے۔ گھر، دیواریں اور مکان بھی اس کے سحر سے بچ نہیں پاتے۔ میرے گاڑی میں بیٹھتے ہی فیروز نے گاڑی آگے بڑھا دی اور باقی ساری گاڑیاں بھی ہمارے پیچھے چل پڑیں۔

’’مالک کہاں ہیں......؟‘‘ فیروز میرا سوال سن کر کچھ دیر خاموش رہا۔ ’’وہ وہیں گھر پر رہیں گے تین دن۔ مالکن کے سوئم کے بعد ہم بھی واپس چلے جائیں گے گھر......‘‘ میرے اندر کوئی دل نما چیز بہت زور سے ٹوٹی۔ بڑے زور کا چھناکا ہوا۔ ایک ہلکی سی آس، جو میرے سینے میں کسی پھانس کی طرح اٹکی ہوئی تھی، فیروز نے ایک جھٹکے ہی میں اسے کھینچ کر باہر نکال دیا۔ کچھ تیر، جن کے دو موہے سرے آگے کی جانب سے باہر کو مُڑے ہوتے ہیں، ان کا جسم میں پیوست ہونا اتنا تکلیف دہ نہیں ہوتا، جتنی اذیت ان کو جسم سے باہر کھینچ نکالنے میں ہوتی ہے۔ جانے میں کیوں یہ امید لگائے بیٹھا تھا کہ بہروز کریم نے لیلیٰ کو معاف کر دیا ہوگا۔ مگر افسوس ہماری آس اور امیدیں اکثر دغا دے جاتی ہیں۔ فیروز نے مجھے بتایا کہ رات کو قریبی پولیس اسٹیشن میں بہروز کے ڈرائیور نے رپورٹ درج کروائی کہ جیسے ہی اس کی مالکن لفٹ سے باہر نکلی، ایک نوجوان نے اس پر حملہ کر دیا اور نوجوان کے پستول سے نکلی گولی مالکن کے سینے میں پیوست ہوگئی۔ ڈرائیور کی جوابی گولی سے نوجوان بھی وہیں ڈھیر ہوگیا۔ لیلیٰ کے سینے میں پیوست گولی، جس پستول سے نکلی تھی، وہ بنا لائسنس تھا اور نوجوان کے ہاتھ میں دبا پایا گیا تھا۔ ڈرائیور کا پسٹل لائسنس والا تھا، جو اس نے رپورٹ کے ساتھ ہی تھانے میں جمع کروا دیا۔ اور اس وقت ڈرائیور پولیس کی حراست میں تھا۔ بہروز نے ہم سب کو احتیاطاً محل سے منتقل کروا دیا تھا، تاکہ ہم میں سے کوئی پولیس کی نظروں میں نہ آسکے۔ پولیس اس بات کی تفتیش میں لگی تھی کہ آخر مرنے والے اس نوجوان کا مقصد کیا تھا۔ بہروز نے پولیس کے سامنے شک ظاہر کیا تھا کہ مرنے والے ولید کا تعلق اس کے مخالف کاروباری طبقے سے ہو سکتا ہے۔ بہرحال، جو کچھ بھی تھا۔ یہ تفتیش اب لمبی چلنے والی تھی، مگر میں ان سب باتوں سے لاتعلق اپنے آپ میں گم بیٹھا صرف لیلیٰ کے بارے میں سوچتا رہا۔ لیلیٰ صبا نے ایسا کیوں کیا۔ یہ محبت تو انسان کو جان لیوا حد تک نڈر بنا دیتی ہے، آخر کس چیز کی کمی تھی لیلیٰ کو۔ حُسن، صورت، شکل، دولت، مرتبہ اور عزت...... کیا محبت ان سب نعمتوں سے الگ، کچھ سوا مانگتی ہے؟ شاید محبت کی ضروریات اور محبت کی دنیا ہماری ان سب عارضی خواہشات اور دکھاوے کی دنیاؤں سے بہت بلند، بہت جدا ہوتی ہے۔ ہم ایک ہفتے تک کسی اور کوٹھی میں منتقل بلکہ مقید رہے۔ پابندی اور اکتاہٹ گزرتے وقت کو بہت طویل بنا دیتی ہے، مگر جیسے تیسے وہ ایک طویل ترین ہفتہ بھی گزر ہی گیا۔

آٹھویں دن ہم پھر سے بہروز کے محل میں تھے، مگر بہروز اب وہ بہروز نہیں تھا، جسے میں نے آٹھ دن پہلے دیکھا تھا، اس کی آنکھوں کی ویرانی اور وحشت دیکھ کر میں اندر سے لرز سا گیا، وہ چُپ چاپ سا اپنی خواب گاہ کی بالکونی (ٹیرس) میں بیٹھا دُور خلا میں گھور رہا تھا۔ ’’آگئے تم لوگ...... اچھا کیا، مگر اب کچھ دن تک ذرا محتاط رہنا، معاملہ تازہ ہے......‘‘ فیروز سَر ہلا کر باقی ساتھیوں سمیت پلٹ گیا، مگر میں اپنی جگہ کھڑا رہا اور تنہائی پاتے ہی ان سے براہِ راست پوچھ لیا۔ ’’آپ نے انہیں مار کیوں دیا، آپ تو ان سے بہت محبت کرتے تھے، پھر......؟‘‘ بہروز اب بھی گم صم تھا ’’محبت کرتا تھا، تب ہی تو مار ڈالا......‘‘ میری آواز نہ چاہتے ہوئے بھی بلند ہوگئی۔ ’’مگر کیوں؟ آپ انہیں طلاق دے کر فارغ بھی تو کر سکتے تھے۔ جان بخشی بھی تو ممکن تھی ان کی۔ آپ کے ساتھ نہ سہی، مگر کم از کم وہ زندہ تو رہتیں۔‘‘ بہروز نے میری طرف دیکھا۔ میری نظر جھک گئی۔ ’’اتنا ظرف نہیں تھا مجھ میں پَری زاد...... کبھی کبھی محبت ہمیں بہت خود غرض، بڑا کم ظرف بنا دیتی ہے۔ یہ جو لوگ محبت میں قربانی، ایثار اور بانٹ دینے کے فلسفے کی باتیں کرتے ہیں، یہ سب بکواس ہے، جھوٹ بولتے ہیں سب۔ محبت، شدید نفرت سے بھی زیادہ کمینہ اور خود غرض جذبہ ہے اور جن کی محبت میں لالچ، خود غرضی اور سب کچھ پا لینے کی ہوس نہیں ہوتی، سمجھ لو، ان کی محبت میں ہی ذرا کھوٹ ہے۔‘‘ بہروز نے آج پہلی بار مجھ سے یوں کُھل کر بات کی تھی یا پھر شاید آج اُسے دل کی بات سُنانے کے لیے کسی سامع کی ضرورت تھی۔ ہم زندگی میں اپنے دل کی بہت سی باتیں اس لیے نہیں کر پاتے، کیوں کہ ہمیں اپنے معیار کا سامع نہیں ملتا۔ میری آواز ٹوٹ

ٹوٹ کر نکل رہی تھی۔ ’’تو پھر مجھے کیوں بخش دیا آپ نے۔ میرا جرم بھی تو کچھ کم نہیں تھا۔ مجھے بھی وہیں مار ڈالتے۔‘‘ بہروز اب بھی بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ ’’ہاں، تمہیں بھی مار دیتا اسی وقت۔ بس تمہاری آخری خواہش نے ہاتھ روک دیا میرا۔ کیوں خود سے اتنی نفرت کرتے ہو؟ مرد کی شخصیت صرف اس کے چہرے سے مکمل نہیں ہوتی۔ یہ سب لوئر مڈل کلاس طبقے کی محرومیاں ہیں۔ مرد دولت، اختیار، طاقت اور رتبے سے مکمل ہوتا ہے۔ یہ چہرہ، وجاہت وغیرہ فلمی ستاروں کی ضرورت ہے۔ سپنوں کے شہزادے صرف ناولز میں پائے جاتے ہیں۔ اصل دنیا تمہارے چہرے سے کہیں زیادہ کرخت ہے پَری زاد۔‘‘ میں چُپ چاپ کھڑا سنتا رہا۔ یہ بات کبھی مجھے لیلیٰ کی ماں نے بھی کہی تھی۔ اور پھر اچانک ہی بہروز کو کچھ یاد آ گیا۔ ’’ہاں، مگر تمہیں خودکشی کا اتنا شوق کیوں ہے۔ تم جانتے تھے کہ وہ عورت تمہاری جان کے درپے ہے اور سارے الزام تمہارے سر ڈال کر اپنی آئی قضا تمہارے حصے منتقل کرنا چاہتی ہے، پھر بھی تم نے اس کے لیے جھوٹ بولا، کیوں......؟‘‘ ’’اس لیے کہ میں آپ کے نوکروں اور دیگر عملے کے سامنے آپ کے گھر کی عزت کو رسوا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے لیلیٰ مالکن نے ہمیشہ یہی بتایا کہ وہ اپنی سہیلی یا رشتے داروں سے ملنے جاتی ہیں، اپنی تنہائی سے گھبرا کر۔ ورنہ میں کبھی آپ سے نہ چُھپاتا۔‘‘ بہروز نے ایک گہری سانس لی۔ ’’میں جانتا ہوں، اس کے لیے تمہیں بے وقوف بنانا کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ بہرحال، تم نے اپنی زندگی کے بدلے میری عزت بچانے کا سوچا۔ میں یہ بات ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ تمہاری ذمّے داریاں آج سے بدل دی گئی ہیں۔ جاتے ہوئے فیروز سے ملتے جانا اور ہاں اب تم انیکسی ہی میں رہو گے۔‘‘ بہروز کے کمرے سے نکل کر میں انیکسی میں واپس آ گیا۔

اگلے روز فیروز نے مجھے ایک آراستہ دفتر میں پہنچا دیا۔ ’’یہ آج سے تمہارا دفتر ہے، مالک نے تمہیں منیجر کے عہدے پر ترقی دے دی ہے۔ باہر بیٹھا عملہ تمہیں سارا کام سمجھا دے گا۔ یہ ہماری سب سے بڑی تعمیراتی کمپنی کا دفتر ہے اور یہ سارا عملہ آج سے تمہارے ماتحت ہو گا۔‘‘ میں حیرت سے فیروز کو دیکھتا رہا۔ فیروز نے میرے چہرے پر لکھے سوال پڑھ لیے اور مسکرا کر بولا ’’تم بہت جذباتی ہو۔ مگر وفادار ہو۔ اور مالک وفاداروں کی بہت قدر کرتے ہیں۔ تمہیں اب کچھ عرصے تک اسی کمپنی کا کام دیکھنا ہو گا، کیوں کہ ہمیں ڈر ہے کہ تمہاری جذباتیت کسی بھی موڑ پر ہمارے لیے کوئی نیا بکھیڑا نہ کھڑا کر دے، لہٰذا فی الحال تمہیں کسی خطرے والے جھنجھٹ میں نہیں ڈالنا چاہتے۔ ویسے بھی دبئی کی پولیس اب چوبیس گھنٹے ہم سب پر نظر رکھ رہی ہے۔ یہاں کا قانون سب کے لیے یکساں اور بہت سخت ہے، تمہیں بھی بہت ہوشیار رہنا ہو گا۔‘‘ فیروز اپنی بات ختم کر کے چلا گیا۔ میں بہت دیر تک وہیں کھڑا اس عالی شان دفتر اور بڑی سی میز کے پیچھے رکھی اس چمکتی سیاہ کرسی کو دیکھتا رہا۔ کل کی ایک غریب بستی کا پَری زاد آج دبئی کی سب سے بڑی تعمیراتی کمپنی کا منیجر تھا۔ میں نے کرسی کی بے داغ سطح پر ہاتھ پھیرا اور اس پر بیٹھ کر تین چار مرتبہ اسے گھما کر بارھویں منزل پر واقع اپنے دفتر کی بڑی بڑی شیشے کی کھڑکیوں سے دبئی شہر کی گہما گہمی کا نظارہ کیا۔ اُس روز مجھ پر ایک اور صدیوں پرانا راز بھی منکشف ہوا کہ ان اونچی آسمان سے باتیں کرتی عمارتوں کے کمروں میں بیٹھے لوگوں کو زمین پر چلتے عام انسان اتنے چھوٹے، حقیر اور کیڑے مکوڑوں جیسے کیوں دکھائی دیتے ہیں۔ تیسرے دن رفیق اچانک ہی بنا بتائے کسی کام سے دبئی آ گیا، اور عملے سے پوچھتے پاچھتے فیکٹری کے دفتر تک آ پہنچا۔ مجھے منیجر کی کرسی پر بیٹھے دیکھ کر کچھ دیر کے لیے تو وہ کچھ کہنا ہی بھول گیا۔ میں نے چپڑاسی سے چائے یا کافی لانے کے لیے کہا اور رفیق کو ہاتھ سے پکڑ کر سامنے صوفے پر بٹھا دیا۔ ’’اب کچھ کہو گے بھی یا یوں ہی گم صم بیٹھے رہو گے؟‘‘ رفیق نے ایک ہی سانس میں پانی کا پورا گلاس حلق سے نیچے انڈیل لیا۔ ’’پَری زاد پیارے...... سچ بتاؤ، تم کوئی ایسا کام تو نہیں کر رہے، جو تم مجھے اور باقی دنیا کو بتا نہیں سکتے۔‘‘ میں نے گہری سانس بھری ’’نہیں، میں ایسا کوئی کام نہیں کر رہا، جس کے بارے میں مجھے تم سے یا کسی اور سے کچھ چُھپانے کی ضرورت پیش آئے۔‘‘ مگر میرے جواب سے رفیق کی تشفّی نہیں ہوئی۔ ’’دیکھو پَری زاد! میں جانتا ہوں کہ بہروز مالک کے ہاں ایسا بہت کچھ ہوتا ہے، جس کی ہمیں بھی خبر نہیں۔ اگر خود کو کسی ایسی گرہ میں الجھا بیٹھے ہو، تو ابھی بھی وقت ہے، میں تمہیں چپ چاپ دبئی سے پار کروا سکتا ہوں، ایک دو دوست ہیں میرے لانچ والے۔ کسی کو تمہارے فرار کی خبر بھی نہیں ہو گی۔‘‘ میں نے مسکرا کر اپنے اس نادان دوست کی طرف دیکھا۔ ’’مجھے صرف خود اپنے آپ سے فرار چاہیے۔ بولو، خود مجھے اپنے آپ سے فرار کروا سکتے ہو......؟ ہے کوئی ایسی لانچ، بحری جہاز یا اڑن کھٹولا، جو مجھے خود میری ذات کے جزیرے سے فرار کروانے میں مدد کر سکے......؟‘‘ رفیق کی پلکیں نم ہو گئیں اور پھر وہ زیادہ دیر وہاں بیٹھ نہیں سکا۔

میرے دن اور رات پھر سے اسی یک سانیت کا شکار ہونے لگے، جس سے میں ہمیشہ ہی بے زار رہتا تھا، البتہ پیانو سے دوستی پکّی ہو چکی تھی۔ لیلیٰ کی موت کے بعد مارتھا نے محل میں آنا بند کر دیا تھا، مگر اب میری انگلیاں اپنی مرضی کی دُھنیں بکھیرنا خوب جانتی تھیں۔ بہروز کریم بھی اب زیادہ تر گھر ہی پر رہتا تھا، خاموش، کھویا کھویا، افسردہ سا...... اُس شام میں ایک ضروری فائل پر اس کے دستخط لینے اس کے پاس پہنچا، تو وہ کہیں جانے کی تیاری میں دکھائی دیا۔ ’’آپ کہیں جا رہے ہیں مالک؟‘‘ ’’ہاں، کچھ دن کے لیے اس کی یادوں سے فرار کی ایک کوشش کر دیکھتا ہوں، حالاں کہ کہیں نہ کہیں اندر سے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ سب بے کار جائے گا۔‘‘ بہروز شام کے جہاز سے لندن فلائی کر گیا اور میں رات گئے تک یہ سوچتا رہا کہ ہم انسان سب کچھ بُھلا دیتے ہیں۔ رشتے ناتے دوستیاں، دشمنیاں، مذہب اور حتیٰ کہ اپنے خدا کو بھی، تو پھر صرف ایک محبت کی یاد کو اپنے دل سے مٹا کیوں نہیں پاتے۔ کاش یہ مقدر انسان کو اور کوئی اختیار نہ دیتا، صرف یادیں بُھلانے کا مختار کر دیتا۔

میری توقع کے مطابق بہروز زیادہ دن باہر نہیں بتا سکا اور ٹھیک دو ہفتے کے بعد واپس آ گیا۔ مگر اس کی واپسی کی وجہ کچھ اور بھی تھی۔ یہ مجھے بعد میں پتا چلا، جب فیروز نے مجھے خبر دی کہ اس تُرک نوجوان، ولید کا باپ انتہائی اثر و رسوخ والا ہے اور وہ بہت جلد دبئی پہنچ کر لیلیٰ صبا اور اپنے بیٹے کے قتل کے کیس کی نئے سرے سے تفتیش شروع کروانا چاہتا ہے اور پھر ٹھیک تین دن بعد پولیس کی بہت سی گاڑیاں بہروز کریم کے گھر کے باہر جمع ہونا شروع ہو گئیں اور ایک بار پھر ہم سب سے بیانات لیے گئے۔ بہروز کے چہرے پر حسبِ معمول کوئی تاثر نہیں تھا، مگر فیروز مجھے کافی پریشان دکھائی دیا۔ رات کو بہروز نے ہم سب کو محل کے بڑے ہال میں میٹنگ کے

لیے بلایا اور پُرسکون لہجے میں بتایا کہ دبئی پولیس نے کیس پھر سے کھول لیا ہے، اور ڈرائیور جس کی ضمانت ہو چکی تھی، اسے بھی دوبارہ گرفتار کر لیا گیا ہے، لہٰذا اس کے ذاتی عملے کو آج کے بعد کُھلی اجازت ہے کہ اپنی جان بچانے کے لیے جو جہاں نکلنا چاہے، نکل جائے، اور ہو سکتا ہے کہ آنے والے دن بہت سخت ہوں، کیوں کہ دبئی پولیس بہت عرصے سے اس موقعے کی تلاش میں تھی کہ انہیں بہروز کے خلاف کوئی شکایت موصول ہو، تو وہ سارے گڑے مردے ایک ساتھ ہی اکھاڑنا شروع کر دے، کیوں کہ اب تک بہروز اتنا محتاط رہا تھا کہ سب جانتے ہوئے بھی کوئی اس کی طرف انگلی نہیں اٹھا سکا تھا۔ میٹنگ ختم ہوئی تو صرف میں اور فیروز وہاں رُکے، باقی تمام ممبرز نے حسبِ توقع جانے سے پہلے اپنا آخری فیصلہ بہروز کو سُنا دیا کہ وہ ایسے مشکل وقت میں

بہروز کا ساتھ چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے، چاہے انجام کچھ بھی ہو۔ واقعی، بہروز نے اپنے اردگرد بہت چُن کر لوگ جمع کیے تھے۔ فیروز نے ان کے جاتے ہی دروازہ بند کیا اور پریشانی سے بولا ''ہم سب یہیں رہیں گے، مگر آپ کو فوراً یہاں سے کسی اور ملک نکل جانا چاہیے۔ ان حالات میں بھارت یا پاکستان ہی بہتر رہے گا۔ میں آج رات ہی بڑی لانچ تیار کروا دیتا ہوں۔ سمندر میں ہمارے وفاداروں کی کمی نہیں، دو راتوں کے بعد آپ کسی محفوظ مقام پر ہوں گے۔'' بہروز نے اطمینان سے فیروز کی پوری بات سُنی۔ ''کبھی کبھی رُوپوشی انسان کو مزید ظاہر کر دیتی ہے فیروز خان...... تم پَری زاد کو لے کر کسی طرف نکل جاؤ۔ اُس کے ہاتھ ابھی صاف ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے بھی دوسروں کی ساتھ شامل کر کے دھر لیا جائے۔'' بہروز کریم کا لہجہ حتمی تھا۔ فیروز مایوس سا وہاں سے پلٹ گیا، میں نے بھی واپسی کے لیے قدم بڑھائے تو میرے عقب میں بہروز کی آواز گونجی۔ ''جب کُوچ کا وقت آئے تو ضدمت کرنا، چلے جانا۔'' میں نے پلٹ کر جواب دیا ''آپ جانتے ہیں، آپ ہمیں قانون میں مقرر سزا سے بھی بڑی سزا دے رہے ہیں۔'' بہروز نے سگار کا ایک لمبا سا کش لیا اور ایک چیک میری جانب بڑھایا۔ ''اسے رکھ لو، بُرے وقت میں کام آئے گا، اور میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، اپنے آپ کو اتنا حقیر مت جانو، یہ دنیا مَرے ہوئے کو مزید مارتی ہے، مگر جو سینہ تان کر اس کے سامنے کھڑا ہو جائے اور اسے للکارے، اُسی کو سلام کرتی ہے، دنیا کو للکارنا سیکھو پَری زاد...... محبت زندگی کی پہلی یا آخری ضرورت نہیں ہوتی اور تم تو بہت خوش قسمت ہو کہ تمہارے پاس دل کے بہلانے کو یہ ایک عذر تو موجود ہے کہ کسی کی محبت تمہارا مقدر ہی نہیں۔ مسئلہ تو ہم جیسوں کا ہے، جو محبت پا کر خود اسے اپنے ہاتھوں سے کھو دیتے ہیں۔ تمہیں دیکھ کر مجھے اکثر تم پر رشک آتا ہے کہ کاش، تمہاری طرح میں بھی عُمر بھر اس عذاب سے محروم رہتا تو کتنا اچھا ہوتا۔'' میں نے حیرت سے بہروز کی طرف دیکھا۔ شاید کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ''کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا......''

لیلیٰ صبا کے قتل کی تفتیش کا دائرہ تیزی سے ہمارے گرد تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے فیروز سے بہروز کریم کو دبئی سے نکال لے جانے کی ایک آخری کوشش کرنے کو کہا۔ فیروز نے مجھے بتایا کہ اب شاید یہاں سے نکلنا اتنا آسان نہ ہو، کیوں کہ اس کی اطلاع کے مطابق پولیس نے محل کے اردگرد راستوں کی نگرانی بھی شروع کر دی تھی۔ فیروز نے ایک حتمی کوشش کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ہم سب نے مل کر کسی نہ کسی طرح بہروز کریم کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ ٹھیک تین دن بعد ہم سارے کارندے مع بہروز، دو بڑی لانچوں میں بنکاک یا کسی اور جانب نکل جائیں گے۔ ہمارے چہروں پر لکھا فیصلہ پڑھ کر بہروز سمجھ گیا کہ ہم سے مزید بحث بے فائدہ رہے گی۔ فیروز خان کو ایسے معاملات کی سنگینی کا اندازہ اور ان سے نمٹنے کا طریقہ خوب آتا تھا۔ اس نے ہمارے فرار والی رات ہی محل میں بہروز کی سال گرہ کا جشن اور پارٹی منعقد کرنے کا ڈھونگ رچایا اور شہر کے تمام رئیسوں کو دعوت نامے بھی ارسال کر دیے گئے۔ طے پایا کہ شام کو اندھیرا ڈھلتے ہی جب مہمانوں کی آمد شروع ہونے والی ہوگی، فیروز خان، بہروز اور دیگر چند کارندوں کو لے کر پہلی لانچ پکڑ لے گا، تب تک میں اور دیگر عملہ مہمانوں کی آؤ بھگت میں مصروف رہیں گے اور موقع ملتے ہی ہم بھی نکل جائیں گے۔ تیسرے دن شام ہی سے محل میں ہل چل سی مچ گئی۔ فیروز نے مجھے بتایا کہ پہرہ کافی سخت ہے، اس لیے انہیں اندھیرا ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ میں نے فیروز کے سامنے ایک ہمیشہ کی آزمائی ہوئی ترکیب تجویز کی۔ فیروز نے کچھ دیر سوچنے کے بعد سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے، یہ جوا بھی کھیل لیتے ہیں، کوئی حرج نہیں ہے، مگر پھر تمہارا یہاں سے جلدی نکلنا شاید ممکن نہ ہو۔'' بہروز ابھی اپنی خواب گاہ میں تھا۔ میں نے اس کے ڈرائیور کو بہروز کی خاص گاڑی لگانے کو کہا اور گھر سے نکلتے ہوئے لاؤنج میں پڑے بہروز کے سگار کیس سے ایک سگار اٹھا لیا۔ ڈھلتے اندھیرے میں جب بہروز کی کار محل سے باہر نکلی، تو میں ایسے زاویے کے ساتھ ہاتھ میں سگار لیے پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا کہ پہلی نظر میں باہر سے دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ کار میں بہروز بیٹھا کہیں جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ محل کے دربانوں نے بھی کھٹ سے سلام جڑ دیے۔ شاید ہم لوگوں سے کہیں زیادہ، ان کے معمولات سے مانوس اور آشنا ہو جاتے ہیں۔ ہماری ذاتی اشیاء، اوقاتِ کار اور عادات ہماری پہچان بن جاتے ہیں اور خود ہم اس پہچان میں کہیں کھو سے جاتے ہیں۔ بہروز کی مخصوص کار کے محل سے نکلتے ہی ایک سیاہ رنگ کی بڑی چوکی جیپ ہمارے تعاقب میں چل پڑی۔ ہمارا پرانا طریقہ شاید ابھی تک کارآمد تھا۔ میں نے ڈرائیور کو گاڑی کی رفتار بڑھانے کو کہا اور ہم تین چار گھنٹے تک دبئی کی سڑکوں پر اِدھر سے اُدھر بے مقصد کار دوڑاتے رہے۔ تعاقب میں آنے والی جیپ کو ہم نے برابر یہی تاثر دیے رکھا، جیسے ہم اس کے تعاقب سے جان چُھڑانے کے لیے بار بار کار کی رفتار تیز کر رہے ہیں۔ پرانی انگریزی جاسوسی فلموں میں، مَیں نے ایسے مناظر بارہا دیکھے تھے، مگر تب میں یہ نہیں جانتا تھا کہ خود میری زندگی میں بھی یہ مناظر حقیقت کا روپ دھار لیں گے۔ شاید قدرت انسانی ذہن کی اڑان وہاں تک رکھتی ہے، جہاں تک اس جہانِ ناتمام میں ممکنات کی حد ہو۔ ورنہ یہ مصنف، رائٹر اور قلم کار وہ سب کچھ کیسے سوچ اور لکھ لیتے ہیں، جو کبھی اُن کے ساتھ پیش ہی نہ آیا ہو۔ یہ تخیّل کیا بلا ہے، جو انہونی کو بھی ہونی کر کے لکھتا ہے۔ مگر میرا پیچھا کرنے والی جیپ میرا تخیّل نہیں تھی۔ جب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ بہروز کریم اور دیگر ساتھی محل سے نکل کر ساحل تک پہنچ گئے ہوں گے، تب میں نے ڈرائیور کو گاڑی محل کی طرف موڑنے کو کہا۔ میری توقع کے مطابق فیروز خان ان سب کو لے کر نکل چکا تھا۔ مہمانوں کی بھیڑ نے کار اندر آتے دیکھی تو سب ہماری طرف لپکے۔ میں نے بہ مشکل ان سے معذرت کی کہ مالک کچھ دیر میں پہنچنے والے ہیں۔ وہ لوگ تب تک عشائیہ تناول فرمائیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ ان مہمانوں میں سے کچھ کا تعلق قانون نافذ کرنے والے اداروں سے بھی ضرور ہوگا، مگر مجھے بہرحال ان کا یہ بھرم آخری وقت تک سمیٹے رکھنا تھا کہ بہروز ضروری کام نمٹا کر آتا ہی ہوگا۔ کہتے ہیں، تنہائی آس پاس لوگوں کی غیر موجودگی کا نام نہیں، ہمارے آس پاس موجود انسانوں میں ہماری غیر دل چسپی ہمیں تنہا کرتی ہے۔ میں بھی اس پارٹی کے ہجوم میں تنہا کھڑا محفل برخاست کرنے کے بہانے ڈھونڈتا رہا۔ پھر اچانک محل کے گیٹ پر بہت سی گاڑیوں اور مخصوص سائرن کا ایک شور سا اٹھا۔ چند لمحے بعد دبئی پولیس کا ایک بڑا افسر میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا انداز اس کے عہدے سے کہیں زیادہ تحکمانہ تھا۔ ''تمہارا مالک بہروز کریم کہاں ہے......؟'' ''بس آتے ہی ہوں کے مالک۔'' افسر مخصوص عربی لہجے کی انگریزی میں گرجا۔ ''ہمارے پاس اس کی گرفتاری کا وارنٹ ہے۔'' میں نے سادگی سے جواب دیا ''جب وہ واپس آئیں تو گرفتار کر لیجیے گا۔'' مہمان یہ سارا معاملہ دیکھ کر دھیرے دھیرے چھٹنے لگے اور پھر کچھ دیر بعد اس افسر کا ماتحت باہر سے بھاگتا ہوا اندر آیا اور اس نے افسر کے کان میں کچھ کہا۔ افسر کی بھنویں تن گئیں اور وہ غصے میں میری طرف پلٹا اور پھر اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''میرے پاس تمہارے لیے ایک بُری خبر ہے......''

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، مُلک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ’’خدا اور محبت‘‘ اور ’’بچپن کا دسمبر‘‘ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ’’عبداللہ‘‘ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ’’عبداللہ‘‘ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

’’پری زاد‘‘ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ’’سنڈے میگزین‘‘ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

میرا دل زور سے دھڑکا، اس پولیس افسر نے مڑ کر اپنے ماتحت سے عربی میں کچھ کہا اور پھر میری طرف پلٹا ’’میں تمہیں گرفتار کر رہا ہوں، تمہارا مالک اور دیگر ساتھی پہلے ہی پکڑے جا چکے ہیں۔ فی الحال، تم پر کوئی واضح الزام نہیں، مگر شک کی بنیاد پر حراست میں لیا جا رہا ہے۔‘‘ کبھی کبھی ہمارے خدشات حقیقت کا روپ دھارنے میں زیادہ دیر نہیں لگاتے، شاید ہمارے اندر ابھرتے خوف اور وہم کا تقدیر اور پیش آنے والے واقعات سے کچھ خاص اور براہِ راست رشتہ ہوتا ہے، اسی لیے جب مجھے گرفتار کرکے لاک اپ پہنچایا گیا، تو میں نے اپنے خدشات کے عین مطابق بہروز کریم، فیروز اور دیگر عملے کو مختلف چھوٹے چھوٹے حوالات نُما کمروں میں بند پایا۔ بہروز کے قانونی مشیروں اور چوٹی کے وکلاء کی ٹیم بھی پولیس حکّام کے ساتھ بحث کرتی نظر آئی۔ مجھے بھی ایک لاک اپ میں دھکیل دیا گیا، اور مَیں اطمینان سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ انسان کی ساری بے چینی اور بے قراری اُسی وقت تک ہوتی ہے، جب تک اختیار اُس کے ہاتھ رہتا ہے، جب فیصلوں کے مختار دوسرے ہوجائیں تو پھر اک اَن جانا سا سکون اور ٹھہراؤ جیسے سارے وجود کی بے چینی سمیٹ لیتا ہے۔ میرا فیصلہ بھی اب میرے صیادوں کے ہاتھ تھا، پھر مجھے بھلا کاہے کی فکر ہوتی۔ اگلے روز ہمیں عدالت میں پیش کرنے سے پہلے ایک چھوٹے سے ہال نما کمرے میں جمع کیا گیا۔ بہروز کریم کے چہرے پر حسبِ معمول سکون تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرایا۔ ’’کہو پَری زاد! نیند کیسی رہی؟‘‘ کہتے ہیں مشکلات سے دُور بھاگ کر ہم صرف اس مصیبت کے حل سے اپنا فاصلہ بڑھا رہے ہوتے ہیں، وگرنہ مشکل تو ہمارے ساتھ ہی چل رہی ہوتی ہے۔ بہروز کے وکلاء نے ایڑی چوٹی کا زور لگالیا، مگر اس کی ضمانت کروانے میں کام یاب نہیں ہوسکے۔ رات کو جب لاک اپ میں سنّاٹا چھا گیا، تو میں نے ساتھ والے لاک اپ کی دیوار پر دھیرے سے دستک دی ’’آپ سو تو نہیں گئے مالک......؟‘‘ کچھ دیر بعد بہروز کی آواز گونجی ’’کسی سوتے ہوئے سے یہ بڑا عجیب سوال ہوتا ہے؟‘‘ میں نے ایک گہری سانس لی ’’معذرت چاہتا ہوں مالک، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کل عدالت میں قاضی کے سامنے مالکن کے قتل کا اعتراف کرکے جُرم اپنے سَر لے لوں گا، آپ میرے اعتراف کے بعد کوئی اعتراض نہ کریں، تو مہربانی ہوگی۔‘‘ بہروز نے کچھ دیر توقف کیا، پھر اس کی ٹھہری ہوئی آواز ابھری ’’بہروز کریم اتنا ہی بوجھ لادتا ہے، جتنا وہ ڈھو سکے۔ تمہارے اس احسان کا بوجھ بہت بھاری ہے پَری زاد، اور ویسے بھی ولید کا باپ اس کی لیلی سے پرانی رفاقت کے سارے ثبوت لے کر آیا ہے، تم پر یہ قتل ڈال بھی دیے جائیں تو دوسری طرف کا کوئی بھی اچھا وکیل بہت جلد سچ کی تہہ تک پہنچ کر اُسے عدالت کے سامنے پیش کردے گا۔ میں نے زندگی میں بہت جُرم کیے ہیں۔ کسی نہ کسی مقام پر تو رسّی کو تنگ ہونا ہی تھا۔ تم اطمینان سے سوجاؤ، مجھے ابھی بہت جاگنا ہے۔‘‘ پھر شاید پوری رات میں اور بہروز اپنی اپنی آہنی کوٹھریوں میں ساری رات جاگتے رہے۔ بہ ظاہر ہم دونوں ہی قیدی تھے، لیکن دونوں میں کتنا فرق تھا، ہم میں سے ایک ساری دنیا جیت کر اور جہاں بھر کی نعمتیں سمیٹ کر اس عقوبت خانے میں پہنچا تھا اور شاید ہی اس کی کوئی حسرت باقی بچی ہو، جب کہ دوسرا وہ بدنصیب تھا، جس کی زندگی ہی عُمر بھر حسرت کا دوسرا نام رہی تھی۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ تقدیر اس دنیا میں ایک ہی وقت میں کسی عرب شہنشاہ یا امریکی ارب پتی کے گھر پیدا ہونے والے اور میری کچی بستی میں جنم لینے والے دو بچّوں میں کیسے توازن رکھتی ہوگی۔ بادشاہ اور فقیر کے گناہ و ثواب برابر کیسے تولے جاسکتے ہیں، چاہے وہ دونوں ہم مذہب ہی کیوں نہ ہوں۔ آخر اس فرق کی کوئی تو جزا ہوگی۔ کوئی تو صلہ یا انعام طے کر رکھا ہوگا اوپر والے نے۔ کسی مقام پر تو اس فقیر کی محرومیوں کا حساب برابر کیا جائے گا یا پھر اسے بھی تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کرلیا جائے گا۔

اگلے روز عدالت میں قاضی کے سامنے وکلاء کی بحث شروع ہونے سے پہلے ہی کریم نے اپنا گناہ قبول کرلیا اور ساتھ ہی عدالت سے درخواست کی کہ گرفتار شدہ عملے میں بہت سے ایسے بھی ہیں، جن کا اس کی مجرمانہ سرگرمیوں سے کوئی تعلق نہیں، لہٰذا انہیں ضمانت پر رہا کردیا جائے۔ ہم سب گم صُم کھڑے بہروز کریم کا بیان سُنتے رہے۔ اس نے اپنے بیان میں اپنے ہر جرم کا مرکزی کردار خود ہی کو ٹھہرایا۔ فیروز اپنے مالک کی باتیں سُن کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ ہم سبھی کی پلکیں نم تھیں۔ بہروز کریم کا بیان کسی زندہ انسان کا اقرار نامہ نہیں لگتا تھا۔ کہتے ہیں، زندگی کا المیہ یہ نہیں کہ یہ بہت جلد ختم ہوجاتی ہے، المیہ یہ ہے کہ ہم بہت دیر بعد اسے جینا شروع کرتے ہیں، لیکن بہروز کے بیان کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اس نے زندگی کو جی بھر کے جی لیا ہے، اتنا کہ اب وہ اس تماشے سے اوب چکا ہے۔ کچھ لوگ صدیوں زندہ رہ کر بھی ایک پل زندگی جی نہیں پاتے اور کچھ پل بھر میں صدیوں کا مزہ کشید کرلیتے ہیں، تو پھر ہم کسی بھی شخص کی عمر کو سال اور مہینوں میں کیوں ناپتے ہیں، یہ کیوں نہیں کہتے کہ فلاں شخص دو پل جیا اور پھر مرگیا اور فلاں عُمر بھر جیتا رہا۔ ایک مہینے کے اندر قاضی نے بہروز کو موت کی سزا سُنادی۔ فیروز خان کو بھی اس کی معاونت کے جُرم میں زندگی کی قضاء کی سزا ملی۔ چند کو عمر قید ہوئی اور مجھ سمیت کچھ دوسرے ناکمل شہادتوں کی بنیاد پر رہا کردیے گئے۔ انصاف وہی ہوتا ہے، جو فوری ہو، ہمارے ہاں تو انصاف اتنی دیر سے ملتا ہے کہ خود انصاف سزا بن جاتا ہے۔

بہروز کریم نے اپنی ساری دولت، جائداد اور اثاثوں کو دو حصّوں میں تقسیم کرکے آدھا حصّہ اپنی بیوی اور بچّوں میں بانٹ دیا اور آدھا اپنے تمام بچ جانے والے ساتھیوں میں تقسیم کردیا۔ اس نے وہ تمام ٹرسٹ اور فلاحی ادارے بھی ہمیشہ کے لیے یک جا کرکے ایک بورڈ آف ڈائریکٹرز کے زیرِ اہتمام کردیے، جو اس کی سرپرستی میں چلتے تھے اور جن کی کمائی سے ہزاروں ضرورت مندوں کو فائدہ ہوتا تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ظالم بہت سخی ہوتا ہے۔ بہروز کریم اگر ظالم تھا تو سخاوت کا یہ معیار اس کے شایانِ شان تھا۔ شاید چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا گناہ گار بھی کہیں نہ کہیں اپنے اعمال کا وزن برابر رکھنے کی

شدید خواہش میں مبتلا رہتا ہے۔ ہم کچھ بھی کرلیں، مگر سزا اور جزا کا یہ نظام خود بہ خود ہی ہماری رگوں میں سرایت کیے رہتا ہے۔ مَیں بہروز کریم کے اثاثوں کی وصیت پڑھتے ہوئے رو پڑا۔ اس نے اپنے محل میں پڑا ہوا بڑا پیانو میرے نام لکھ دیا تھا، اور پھر ساتھ ہی ایک ضمنی نوٹ میں تحریر تھا کہ چوں کہ اس پیانو کا وزن بہت زیادہ ہے اور بہروز کو خدشہ ہے کہ اس کی محبوب بیوی کا یہ پسندیدہ پیانو محل سے کہیں منتقل کیے جانے کی صورت میں اپنی اصل شکل و ہیئت کھو نہ دے، لہٰذا وہ جائداد، جہاں وہ پیانو پڑا ہوا ہے، تمام تر محل اور انیکسی سمیت پَری زاد کے نام کی جاتی ہے۔ بہروز جاتے جاتے ہم سب کے نام اتنا کچھ کر گیا تھا، جو ہم سب کی سات نسلوں کے لیے کافی تھا۔ اس نے اپنے تمام اداروں میں کام کرنے والے اعلیٰ سے اعلیٰ افسر سے لے کر ایک معمولی نوکر اور چپڑاسی تک کو برابر بانٹا تھا۔

آخری ملاقات کی رات، جب ہم سب کارکن اس سے آخری بار مل کر واپس لوٹ رہے تھے، تو میں قطار میں سب سے آخر میں کھڑا رہا۔ سب جا چکے، تو بہروز نے میری طرف دیکھا۔ ’’تم مجھ سے نہیں ملو گے پَری زاد......‘‘ مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں تمام ادب و آداب بالائے طاق رکھ کر روتے ہوئے اس کے گلے لگ گیا اور پھر مجھے سنبھالتے ہوئے بہروز بھی رو پڑا۔ اس آہنی اور فولادی وجود و اعصاب کے آدمی کو میں نے پہلی بار نم آنکھیں لیے سر جھکائے کھڑے دیکھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے ’’کیوں کیا آپ نے ایسا......؟ کیوں خود کو موت کے منہ میں جھونک دیا، آپ کے وکلاء اور قانونی مشیر اتنے اہل تو تھے کہ آپ کی سزا کو کم از کم عمر قید میں تبدیل کروا دیتے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ سزا آپ نے اپنے لیے خود تجویز کی ہے، قاضی نے تو بس اپنے دست خط ثبت کیے ہیں، آپ کے فیصلے پر۔‘‘ بہروز نے سر اٹھایا ’’شاید میں لیلیٰ کے ساتھ ہی مر گیا تھا۔ میں خود کو بہت مضبوط سمجھتا تھا پَری زاد۔ لیکن یہ محبت بڑے بڑے تناور درختوں کو دیمک کی طرح کھا کر ڈھا سکتی ہے۔ یہ احساس مجھے بہت دیر میں ہوا۔ میں نے اپنے لیے یہ سزا اس لیے تجویز نہیں کی کہ میں نے اُسے مار کیوں ڈالا بلکہ میں نے خود کو یہ سزا اس لیے دی ہے کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی تھی۔ جب کہ میں اس کی محبت میں اتنا آگے بڑھ گیا تھا کہ مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ اب میری واپسی ناممکن ہے۔ مگر یہ راز تب کُھلا، جب وہ دنیا سے جا چکی تھی۔ تب میں نے جانا کہ میں بھی اب اس کے بنا جی نہیں پاؤں گا۔ اگر مزید زندہ رہتا تو یہ منافقت ہوتی۔ اور بہروز نے آج تک ہر گناہ کیا ہے، سوائے منافقت کے۔‘‘ اس نے مجھے آخری مرتبہ بھینچ کر گلے لگایا ’’اپنا خیال رکھنا، بہت قیمتی ہو تم، مگر نہ جانے کیوں، خود کو اتنا ارزاں کر رکھا ہے۔‘‘ میں ایک بار پھر رو پڑا۔ بہروز سے رخصت ہونا دنیا کا سب سے مشکل کام تھا، مگر سپاہی میرے سر پر آ کھڑا ہوا۔ واپسی پر میں فیروز خان کی کوٹھری کے پاس رُک گیا، وہ آہٹ سن کر سلاخوں کے قریب آ گیا۔ میں
نے نم پلکوں سے اس کا استقبال کیا ’’جا رہے ہو فیروز؟‘‘ وہ دُکھ سے مسکرایا ’’ایک نہ ایک دن تو جانا ہی تھا۔ مالک کے ساتھ ہی چلا جاؤں، تو بہتر ہے، میں نے ان کی زندگی کی حفاظت کی قسم کھا رکھی تھی، دعا کرو کہ کل مجھے اُن سے پہلے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے، ورنہ میں اوپر جا کر خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا......؟‘‘ میں نے فیروز کا کاندھا تھپتھپایا ’’تم سے بڑھ کر وفاداری اس دنیا میں بھلا کسی اور نے کیا نبھائی ہو گی۔ بے وفا تو ہم ہیں، جنھیں تم یہاں تنہا کسی آسرے کے بغیر چھوڑے جا رہے ہو۔ کہاں ملے گا اب مجھے تم جیسا سچا اور وفادار دوست؟‘‘ فیروز مسکرایا ’’پاکستان میں میرا ایک بھائی ہے کبیر خان، ضرورت پڑے تو اسے اپنے پاس بلا لینا، ہم دونوں کا ایک ہی خون ہے۔ اب تم جاؤ پَری زاد، مجھے اپنی آخری عبادت کرنی ہے۔ شاید یہ آخری سجدہ ہی وہاں کام آ جائے، ورنہ عُمر تو بس رائیگاں گئی۔‘‘ میں آنکھوں میں آنسو لیے بوجھل قدموں سے وہاں سے چلا آیا۔

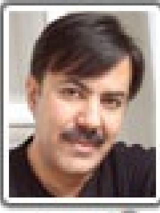
بہروز اور اس کے وفادار فیروز کی آخری رسومات ایک ساتھ ادا کر کے انھیں اسی شہر میں دفنا دیا گیا، جہاں انھوں نے عروج کی آخری منزل سَر کی تھی اور جہاں وہ ایک ساتھ زوال پزیر ہو گئے۔ بہت دنوں تک تو مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ غم کی شدت شاید ہماری قوتِ گویائی بھی سلب کر لیتی ہے۔ میں گھنٹوں بڑے ہال میں گم صم بیٹھا اس بڑے پیانو کو دیکھتا رہتا، جسے کبھی لیلیٰ صبا بیٹھ کر بجایا کرتی تھی۔ شاید اس کی نازک انگلیوں کے نشانات بھی ابھی تک اس پیانو کے سُروں پر ثبت ہوں گے۔ میرا جی ہی نہیں مانتا تھا کہ میں اپنے ہاتھ لگا کر اس کے نشان مٹا دوں۔ پھر ایک شام مارتھا واپس آ گئی اور مجھے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ وہ اپنی سوتیلی ماں کے پُرسے کے لیے انگلینڈ گئی ہوئی تھی، جب یہ ساری واردات ہوئی۔ میں نے مارتھا کو پھر سے کام پر رکھ لیا اور اس سے انیکسی میں شفٹ ہو جانے کی درخواست بھی کی۔ جانے کیوں وہ مجھے اس محل اور لیلیٰ صبا کا ایک حصّہ نظر آتی تھی۔ رفیق کو بھی میں نے دوبارہ دبئی واپس بلوا لیا تھا۔ مگر اس نے محل میں منتقل ہونے سے معذرت کر لی ’’نہیں پیارے! یہاں پر تُو ہی سجتا ہے، مالک یہ سب کچھ تیرے نام کر گئے ہیں، مجھے اسی فلیٹ میں رہنے دے۔‘‘ میں جانتا تھا کہ اس کا جواب یہی ہو گا۔ ’’ٹھیک ہے، مگر ایک شرط تمھیں میری بھی ماننی ہو گی، ورنہ میں سمجھوں گا کہ تم نے مجھے دل سے اپنا دوست نہیں مانا۔‘‘ ’’کیسی شرط......؟‘‘ میں نے دراز سے ایک چابی نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمائی۔ ’’تم ہمیشہ سے یہاں ایک بہت اچھا پاکستانی ریسٹورنٹ کھولنا چاہتے تھے ناں، یہ تمہارے ریسٹورنٹ کی چابی ہے۔‘‘ رفیق کچھ دیر تک ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہا اور پھر اس نے مجھے آگے بڑھ کر گلے لگا لیا ’’تُو صرف نام ہی کا نہیں، دل کا بھی پَری زاد ہے......‘‘ بہروز کے جانے کے بعد مجھے پتا چلا کہ یہ امیر کیسے امیر سے امیر تر ہوتے جاتے ہیں، دولت ایک ایسا مقناطیس ہے، جو صرف دولت کے لوہے کو اپنی جانب کھینچتا ہے۔ بہروز کے شروع کیے گئے درجنوں منصوبے جو میرے حصّے آئے تھے، وہ پیسا کھینچنے کے کچھ ایسے ہی مقناطیس تھے، میرا کام صرف اتنا رہ گیا تھا کہ میں اپنے منیجرز کی بتائی ہوئی اسکیمز میں پیسے لگاؤں اور پھر ہفتوں بیٹھ کر ان سے حاصل ہونے والا منافع گنتا رہوں۔ اس سے کہیں زیادہ محنت تو میں استاد مستانہ کے ورکشاپ پر دن کے چند گھنٹوں میں کر لیتا تھا۔ یا پھر شاید ان امیروں کو بیٹھ کر یوں دولت گننا بھی محنت ہی لگتی ہو، لیکن میں اس جمع تفریق کے کھیل سے چند مہینوں ہی میں اکتانے لگا۔ دولت مند کو دولت خرچ کرنے کا سلیقہ آنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ وہی دولت اس کے لیے سر درد بننے لگتی ہے۔ میرے منیجرز مجھے روزانہ پیسا کمانے کے نت نئے گُر بتاتے اور پھر جب ان کے منصوبے کام یاب ہو جاتے تو وہ پارٹی کرتے، جشن مناتے۔ انھیں اس بات پر بھی حیرت ہوتی تھی کہ میں ان کی دماغی عرق ریزی کے نتیجے اب بہت اکتاہٹ سے سُنتا تھا۔ اُن ہی دنوں اسپین کی ایک بڑی تعمیراتی کمپنی نے ہمارا ٹینڈر منظور کر لیا۔ میں سفر سے بہت کتراتا تھا اور حتی الامکان کوشش یہی ہوتی تھی کہ مجھے خود کہیں جانا نہ پڑے، مگر اس بار کچھ ایسی صورتِ حال بنی کہ مجھے بارسلونا جانا ہی پڑا۔ یہ پیسا بڑے کمال کی چیز ہے۔ ایک ہی جیسے خوش پوش اور معزز دکھائی دینے والے انسانوں کو پل بھر میں درجوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ میری فلائٹ کا ٹکٹ عملے نے بزنس ایگزیکٹو کلاس میں سب سے اونچی تقسیم کا بُک کروایا تھا، لہٰذا کچھ ہی دیر میں مجھ سے کہیں زیادہ خوش لباس اور اونچے درجے کے دکھائی دینے والے مسافر جہاز کے پچھلے حصّے میں بیٹھ چکے تھے اور جہاز کا سارا عملہ میرے آگے بچھا جا رہا تھا۔ مجھے جانے کیوں اپنے کالج کے روٹ پر چلنے والی لوکل بس یاد آ گئی، جس کے پائیدان پر لٹکتے ہوئے میں نے کالج تک اَن گنت سفر کیے تھے، کیوں کہ میرے پاس اندر بیٹھنے کے پیسے نہیں ہوتے تھے اور کنڈکٹر ترس کھا کر چند سکّوں کے عوض مجھے پائیدان پر لٹکنے ہی کی اجازت دیتا تھا۔

اسپین کے جس سات ستارہ ہوٹل میں میرا قیام تھا، اس کے صدارتی سوئٹ سے باہر دیکھنے پر دور سفید پتھر اور لکڑی سے بنا ایک بہت بڑا سا گول اکھاڑہ دکھائی دیتا تھا۔ میرے میزبانوں نے اگلی شام معاہدہ طے ہوجانے کی خوشی میں مجھے اُسی اکھاڑے میں بھینسے کی انسان سے جنگ دکھانے کا اہتمام کرڈالا۔ میں نہیں جانا چاہتا تھا، مگر میزبان بہ ضد تھے کہ کوئی اسپین آئے اور یہ تماشا نہ دیکھے، تو اسے کفرانِ نعمت کہا جاتا ہے۔ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ مجھے تو دنیا کے سبھی بڑے شہر اب ایک جیسے ہی لگتے ہیں۔ وہی بھاگ دوڑ، نفسا نفسی، سب کا ایک دوسرے کو اپنے سے زیادہ خوش اور مطمئن جان کر خود کو مزید مشقت میں مبتلا کرنا، مگر یہ شہر باقی بڑے شہروں سے کچھ جدا دکھائی دے رہا تھا، مشرقی اور مغربی تعمیر کا سنگم، مجھے بچپن میں آنہ لائبریری سے کرائے پر لی گئی الف لیلیٰ کی کہانیاں یاد آنے لگیں۔ وہی محرابیں، وہی ستونوں کی قوسِ قزح، اندرونِ شہر اینٹوں کی بنی گلیاں اور رستے، نئی تعمیر کا شاہ کار، الف لیلوی گھر اور عمارتیں...... مسلمان کیا تھے، اور کیا سے کیا ہوگئے۔ دنیا کی تاریخ میں جتنا عروج اور پھر جتنا زوال ہم مسلمانوں نے دیکھا ہے، شاید ہی کسی اور قوم اور مذہب نے دیکھا ہو، شام چار بجے ہم اکھاڑے میں اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ اکھاڑہ کھچا کھچ تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ انسان سدا کا وحشی ہے اور اسے یہ دہشت بھرے تماشے دیکھنے میں ہمیشہ ہی لطف آتا ہے۔ کچھ ہی دیر میں سیاہ بُل فائٹنگ کے سوٹ پر سُرخ جیکٹ اور سَر پر کالا ہیٹ پہنے ایک سُرخ چادر لہراتا، ہسپانوی بُل فائٹر اکھاڑے میں داخل ہوا، تو تماشائیوں نے تالیوں اور سیٹیوں سے آسمان سر پر اٹھالیا۔ کنواری لڑکیوں نے اس وجیہہ لڑکے پر پھولوں کی بارش کردی۔ مگر بُل فائٹر نے صرف ایک گلاب اٹھا کر اسے اپنے ہونٹوں سے لگایا، جو اس کی محبوبہ نے اس پر پھینکا تھا۔ میرا خاص میزبان مجھے یہ ساری روداد کسی رواں تبصرے کی طرح سُنا رہا تھا۔ یہ لڑاکا اسپین کے بہترین بُل فائٹرز میں سے ایک تھا، جسے لوگ انتونیو کے نام سے جانتے تھے۔ انتونیو آج تک اسپین کے ننانوے جنگلی بھینسوں کو ایسے اکھاڑوں میں ہرا کر موت کے گھاٹ اتار چکا تھا اور آج اس کا یہ ایک سوواں مقابلہ تھا۔ اور اس نے اپنی محبوبہ ماریا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنا سینکڑا مکمل کر کے ماریا سے شادی کرلے گا۔ سارا شہر یہ بات جانتا تھا اور اسی لیے آج اکھاڑے میں تل دھرنے کی بھی جگہ نہ تھی۔ دوسری جانب اندھیرے قید خانے میں کھڑا بھینسا بھی آج اپنی سوویں لڑائی لڑنے جارہا تھا۔ لوگوں نے اس کی وحشیانہ طاقت کی وجہ سے اس کا نام ''کِلر'' رکھ چھوڑا تھا، اور کِلر نے اپنے ننانوے گزشتہ مقابلوں میں کسی بھی بُل فائٹر کا جسم ادھیڑے بنا اسے اکھاڑے سے واپس نہیں جانے دیا تھا۔ مگر اپنے وقت کے یہ دو بہترین لڑاکا آج پہلی مرتبہ ایک دوسرے کے مدمقابل آرہے تھے۔ انتونیو نے اپنی تلوار کی چمکتی دھار کو چُھو کر دیکھا، اور کمرے میں بند کِلر نے اپنے کُھروں سے ریتیلی زمین کو کھرونچا، ماریا نے انتونیو سے وعدہ لیا تھا کہ اس آخری بھینسے کو زیر کرنے کے بعد وہ اس کھیل کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دے گا، کیوں کہ ماریا اپنے محبوب کے توانا جسم پر مزید نوکیلے سینگوں کی کاٹ اور زخموں کے نشان نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ انتونیو نے اپنی سیاہ مخملی پوشاک کے سنہری بٹن بند کیے اور گھٹنوں تک لمبے مخصوص چمڑے کے جوتوں کے تسمے باندھے اور تلوار کی نوک زمین پر ٹیک کر ایک شانِ بے نیازی سے کھڑا ہوگیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ لڑائی کے لیے تیار ہے۔ تماشائیوں کی تالیوں، سیٹیوں اور شور سے کان پڑی آواز سُنائی نہیں دے رہی تھی۔ ماریا نے اپنے سر پر سجے سیاہ جالی کے نقاب والے ہیٹ کو ذرا سا سرکا کر انتونیو کو سلام کیا اور ہاتھ میں پکڑا دوسرا سرخ گلاب بھی اُس پر نچھاور کردیا۔ ٹھیک اسی لمحے میری نظر اکھاڑے میں دوسری جانب بیٹھے ایک شخص پر پڑی، جو میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور تعظیم سے سر جُھکا کر سلام کیا۔ شاید میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا، مگر اس وقت میری پوری توجہ انتونیو اور کِلر کے مقابلے پر تھی۔ کِلر کی آنکھوں سے پٹی ہٹا کر اس کے قید خانے کا دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ اور اب وہ اکھاڑے میں داخل ہونے کے بعد اپنے سوویں شکار انتونیو کو اکھاڑے کے درمیان کھڑا سُرخ کپڑا لہراتے دیکھ رہا تھا، مگر کِلر اتنی جنگوں کے بعد ایک بات تو اچھی طرح جان چکا تھا کہ اس کا اصل ہدف وہ بے جان سُرخ کپڑا نہیں بلکہ اس کے عقب میں کھڑا وہ سفاک دشمن ہے، جو پہلے اسے تماشے کی غرض سے خوب تھکائے گا اور پھر نڈھال کرنے کے بعد ٹھیک اس کی دو آنکھوں کے درمیان نازک جلد والے حصے میں اپنی تیز دھار تلوار پوری طرح گھونپ کر اُسے ہمیشہ کے لیے ختم کردے گا، مگر اسے یہ لمحہ آنے سے پہلے ہی اپنے دشمن کو اپنے نوکیلے سینگوں میں پرو کر آسمان کی جانب اچھال کر اس کے جسم کو ادھیڑ کر رکھ دینا ہوگا۔ بُل فائٹنگ دراصل بھینسے اور لڑاکے (بُل فائٹر) کے درمیان اعصاب کی جنگ ہوتی ہے اور جو اپنے اعصاب قابو میں رکھے، وہی فاتح بن کر اکھاڑے سے باہر نکلتا ہے۔

انتونیو نے سُرخ مخملی کپڑا لہرایا، جنگ شروع ہوگئی۔ کِلر کا پہلا وار خالی گیا اور انتونیو نے اپنی تلوار سے اس کے جسم پر ایک چرکا لگا کر، کِلر کے مضبوط جسم پر پڑے درجنوں داغوں میں ایک اور کا اضافہ کردیا۔ کِلر غضب ناک ہو کر پلٹا اور دُور سے بھاگتے ہوئے قریب آکر اچانک اپنا زاویہ بدل لیا۔ اس کے تیز دھار سینگ کی نوک نے انتونیو کے پہلو میں چنگاریاں سی بھر دیں۔ تماشائیوں کی چیخیں نکل گئیں اور ماریا گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ انتونیو اور کِلر دونوں ہی جان چکے تھے کہ ان کا مقابلہ آج کسی عام حریف سے نہیں۔ انتونیو کے ہاتھ میں پکڑی سُرخ چادر اب دھیرے دھیرے

چیتھڑوں میں تبدیل ہوتی جارہی تھی اور جہاں کِلر کا جسم انتونیو کی تلوار کے چرکوں سے لہولہان تھا، وہی انتونیو کا بدن بھی بے حد مہارت اور احتیاط کے باوجود خراشوں سے بھر چکا تھا اور دونوں ہی شدید تھکن سے نڈھال تھے۔ ماریا جب اپنے محبوب کو اس خوں خوار قاتل بھینسے کے جسم سے مَس ہوتے دیکھتی تو اس کے حلق سے بے اختیار چیخ بلند ہوجاتی۔ اس نے چلا کر انتونیو سے کہا ''انتونیو! بس کردو، میرے فائٹر، یہ دیوانگی ہے۔ مقابلہ ختم کردو۔'' مگر انتونیو نے مُسکرا کر اپنی زندگی کو دیکھا اور آخری بار چادر لہرا کر پھینک دی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ بھینسے کی آنکھوں کے درمیان تلوار گھونپنے کے لیے تیار ہے، مگر اس نے خود کو بھی کِلر کے سامنے پوری طرح عیاں کردیا تاکہ بھینسا ساری احتیاط بھلا کر تیزی سے اس کی جانب بڑھے اور انتونیو موقع ملتے ہی اسے ختم کردے، تماشائیوں کا شور اور چیخیں آسمان تک بلند ہورہی تھیں اور وہ سب انتونیو کو اس دیوانگی سے روکنے کی کوشش کررہے تھے۔ مگر انتونیو اپنی زندگی کا آخری مقابلہ ہار کر واپس پلٹنا نہیں چاہتا تھا۔ کِلر نے پلٹ کر اپنے اس بہادر دشمن کو دیکھا اور چند لمحے رک کر دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تولتے رہے اور پھر کِلر غراتا اور منہ سے جھاگ بہاتا انتونیو کی طرف دوڑتے ہوئے لپکا۔ انتونیو نے اپنے جسم کو ایک خاص انداز میں اکڑا کر تلوار کا دستہ مضبوطی سے اپنے ہوا میں اٹھے دائیں ہاتھ میں تھام لیا۔ کِلر بھی سمجھ گیا کہ اس کا یہ آخری حملہ ان میں سے کسی ایک کے لیے تخت یا تختہ ثابت ہونے والا ہے۔ وہ ایک انتہائی ذہین جانور تھا اور دشمن کی چالوں کو سمجھتا تھا۔ اس نے بھاگتے بھاگتے اپنے جسم کو اچانک ایک جھکائی دی، تاکہ اپنے سر کی جانب لپکتی تلوار کی نوک سے بچ سکے، مگر تلوار دستے تک اس کے سر میں اتر چکی تھی۔ خود انتونیو بھی کِلر کے ٹنوں وزنی جسم کی زوردار ٹکر سے کئی فٹ ہوا میں اچھلا اور جب وہ زمین کی طرف گر رہا تھا تو کِلر کے نوکیلے سینگ اس کے گرتے جسم کا انتظار کررہے تھے۔ انتونیو کے جسم میں کِلر نے اپنے سینگ پرو دیئے۔ اور ایک لمحے بعد ہی دونوں اکھاڑے کی ریتیلی زمین پر گرے اپنی آخری سانسیں لے رہے تھے، دونوں نے آنکھیں بند ہونے سے پہلے اپنے بہادر دشمن کو آخری پیغام دیا ''بہت خوب...... تم واقعی بہترین لڑاکا تھے میرے دشمن......'' ماریا اپنے محبوب کی حالت دیکھ کر صدمے سے لہرائی اور وہیں گر کر بے سُدھ ہوگئی۔ سارے مجمعے کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ عورتیں رو پڑیں، اپنی اپنی زندگی کے آخری مقابلے میں کِلر اور انتونیو دونوں ہی برابر رہے تھے۔ تماشا ختم ہوچکا تھا۔ ٹھیک اُسی لمحے کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں اس سارے تماشے میں اتنا محو تھا کہ بُری طرح چونک گیا، یہ وہی شخص تھا، جس نے مقابلہ شروع ہونے سے پہلے مجھے سلام کیا تھا۔ وہ پُراسرار انداز میں مسکرایا ''بہت تلاش کیا ہے تمہیں۔ آخر کار، آج پکڑے ہی گئے......!!!

(جاری ہے)



......ہاشم ندیم......

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ’’خدا اور محبت‘‘ اور ’’بچپن کا دسمبر‘‘ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ’’عبداللہ‘‘ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ’’عبداللہ‘‘ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

’’پری زاد‘‘ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ’’سنڈے میگزین‘‘ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

میں نے حیرت سے اُس شخص کی طرف دیکھا، وہ اردو میں بات کر رہا تھا۔ ’’کیا ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟‘‘ وہ مُسکرایا ’’ہم دونوں نہیں، صرف میں تمہیں جانتا ہوں......تم پَری زاد ہو ناں، بہروز کریم کے جاں نشین......‘‘ ’’نہیں، میں صرف پَری زاد ہوں۔ بہروز کا جاں نشین بننے کی اہلیت نہیں ہے مجھ میں۔‘‘ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ’’لوگ مجھے سیٹھ ابراہیم کے نام سے جانتے ہیں، بھارت کی شان، بمبئی میں رہتا ہوں۔‘‘ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ’’بمبئی‘‘ ہاں بھئی، بمبئی، یہ نیا نام ممبئی ہمیں تو بالکل نہیں جچتا، جو بات بمبئی میں تھی، وہ اس ممبئی میں کہاں۔ جانے یہ لوگ شہروں کے نام کیوں بدل دیتے ہیں، کتنی یادیں جُڑی ہوتی ہیں ان ناموں کے ساتھ، اب تمہارے لاہور کو کوئی کل سے اچانک ٹمبکٹو کہہ کر بلانا شروع کردے، تو تمہیں کیسا لگے گا؟‘‘ میں اس کی بے تکلفی سے ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ ’’تم نے مجھے بتایا نہیں، تم مجھے کیسے جانتے ہو؟‘‘ سیٹھ ابراہیم میرے ساتھ چلتے چلتے اکھاڑے سے باہر آچکا تھا۔ میرے میزبان نے مجھے باہر آتے دیکھ کر گاڑی منگوالی۔ میں نے ابھی گاڑی کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ سیٹھ ابراہیم کی گاڑی بھی ہماری گاڑی کے پیچھے آکر لگ گئی۔ سیٹھ ابراہیم نے جیب سے اپنا کارڈ نکالا اور مجھے دیتے ہوئے بولا۔ ’’میں شام کو تم سے ملنا چاہتا ہوں، تمہارا مالک بہروز مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ ہم بزنس پارٹنر تھے، باقی باتیں شام کو ہوں گی۔‘‘ سیٹھ ابراہیم مجھے ایک نئی اُلجھن میں مبتلا کر کے چلا گیا، شام کو سوئمنگ پول کے کنارے بچھی کرسیوں پر وہ مجھ سے پہلے موجود تھا۔ میں نے براہِ راست مدّعے کی بات کی۔ ’’ہاں بولو سیٹھ ابراہیم تمہیں مجھ سے ایسا کیا خاص کام ہے؟‘‘ سیٹھ دھیرے سے مسکرایا ’’تم نے شاید غور سے میرا نام نہیں سُنا۔ مجھے ابراہیم کہتے ہیں۔ بمبئی کی فلم انڈسٹری میرے دَم سے چلتی ہے، میں زیادہ تر دبئی میں رہتا ہوں۔ یہاں اسپین میں بھی ایک فلم کی افتتاحی تقریب میں آیا تھا۔ خوش قسمتی سے تم بھی یہیں مل گئے۔ شاید بہروز نے تمہیں بتایا نہیں کہ اس کا اربوں کا کالا دھن ہماری فلم انڈسٹری ہی میں سفید ہوتا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارا وہ پرانا رشتہ برقرار رہے۔ کہو، کیا کہتے ہو......؟‘‘ ’’میں کچھ سمجھا نہیں......؟‘‘ ابراہیم نے اپنی آنکھوں پر لگا قیمتی دھوپ کا چشمہ اتارا ’’ہم بھارتی فلموں میں اپنا روپیا لگاتے ہیں، ایک فلم ستّر، اسّی کروڑ تک چلی جاتی ہے۔ فلم چل جائے تو تین چار سو کروڑ لے آتی ہے، پٹ بھی جائے تو ہمارا کچھ نقصان نہیں، ہمارے ٹیکس کے وکیل اس نقصان کو تین گنا بڑھا کر ٹیکس کے گوشواروں میں بھر دیتے ہیں۔ مطلب چت بھی ہماری اور پٹ بھی۔ منافع ہو تو ساری دنیا کے سامنے سفید دھن آتا ہے، نقصان ہو تو ہمارا کالا دھن نقصان کے پردے میں چُھپ جاتا ہے۔ بولو، پیسا لگاؤ گے فلم انڈسٹری میں؟‘‘ ’’تمہاری پیش کش کا شکریہ، مگر میرا کالا دھن کمانے یا اسے سفید کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میرے پاس جو ہے، وہ بھی میری اوقات سے کہیں زیادہ ہے۔ مجھ سے تو یہ بھی نہیں سنبھلتا۔‘‘ سیٹھ ابراہیم طنزاً مُسکرایا۔ ’’جانتا ہوں، تم شاید پہلے بہروز کے خاص محافظ تھے، مگر یاد رکھو، اپنی سلطنت قائم رکھنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے اور شاید تم یہ بات نہیں جانتے کہ بمبئی کی فلم انڈسٹری پر ہمیشہ سے انڈر ورلڈ کا راج رہا ہے۔ ہم ان کٹھ پتلیوں کو اپنی انگلیوں پر نچاتے ہیں۔ آدھی رات کو بھی ہمارا فون چلا جائے تو ان کے بڑے بڑے ستارے بھاگے چلے آتے ہیں، ورنہ کوئی سوچ بھی سکتا ہے کہ شاہ رخ، سلمان، کرینہ یا کترینہ کسی کے بیٹے، بھائی کی سال گرہ میں کیک کٹوانے چلے آئیں۔ یا ہمارے خاندانوں کی کسی شادی میں آئٹم نمبر پیش کرنے کو دوڑے آئیں۔ یہ سب ہماری زیرِ زمین دنیا کی طاقت کے کرشمے ہیں اور سچ پوچھو، تو ان لوگوں پر حکومت کر کے بڑا مزہ آتا ہے۔ اور چوں کہ بہروز کریم ہماری اس سلطنت کا ایک اہم عُہدے دار تھا۔ لہٰذا میں نے اپنا فرض سمجھا کہ تمہیں بھی شمولیت کی دعوت دوں۔ آگے فیصلہ تمہارے ہاتھ ہے۔ ویسے تم اتنا لیے دیے کیوں رہتے ہو۔ دبئی میں بھی، مَیں نے تمہیں کبھی کسی تقریب میں نہیں دیکھا۔ سُنا ہے، پیتے پلاتے بھی نہیں، کیوں یہ جوگ لے رکھا ہے تم نے......؟‘‘ میں دھیرے سے مسکرایا۔ ’’شاید یہی جوگ میرا مقدر ہے، اور میں سچ کہہ رہا ہوں، مجھے کسی سلطنت یا رتبے کی کوئی خواہش نہیں۔ میں شاید ازلی طور پر غلام ہی پیدا ہوا ہوں، غلام ابنِ غلام......ابنِ غلام۔ اور اب مجھ میں کوئی ’’خوئے سلطانی‘‘ پیدا ہونا بہت مشکل ہے۔ یہ تم جیسوں ہی کے سَر پر جچتی ہے۔‘‘ سیٹھ ابراہیم میری بات سُن کر سنجیدہ سا ہوگیا۔ ’’اتنے کڑوے سچ اتنی آسانی سے کیسے بول لیتے ہو تم......؟ اور میں نے تو یہ بھی سُنا ہے کہ تمہارے بہروز والے محل میں کسی

عورت کا بھی آنا جانا نہیں ہے۔ شراب، عورت اور جوا، اگر یہ سب تمہاری زندگی میں کوئی معنی نہیں رکھتے، تو پھر اتنا پیسا بھی کس کام کا۔ آخر کوئی تو خواہش ہوگی تمہاری......؟" میں چپ رہا، اب میں اسے کیا بتاتا کہ میری خواہش ساری دنیا سے جدا ہے۔ ہر آرزو سے سوا ہے۔ مجھے تو بس ایک نگاہ چاہیے۔ اپنے نصیب کی ایک جھلک، صرف ایک پیار بھری نظر، جو صرف میرے لیے ہو۔ بنا کسی تحقیر، طنز، حقارت اور ترحم کے جذبات کے۔ سیٹھ ابراہیم جاتے جاتے چند لمحوں کے لیے رُکا۔ "اچھے لگے ہو تم مجھے، لالچ نہیں ہے تمہارے اندر اور جو شخص اپنی خواہشوں پر قابو پالے، وہ اپنے فیصلوں میں آزاد ہوتا ہے۔ کبھی کسی مقام پر میری ضرورت پڑے تو یاد کرلینا، ہاں، تمہیں ایک ضروری اطلاع بھی دینی تھی مجھے۔ دبئی پولیس تم پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہے، نہ صرف تم پر بلکہ بہروز کے ہر قریبی ساتھی پر، ان کی خاص توجہ ہے آج کل......تم اسی لیے بچے ہوئے ہو، کیوں کہ فی الحال انہیں تمہارے خلاف کسی غیر قانونی سرگرمی کی خبر نہیں ملی، مگر تمہیں بہت احتیاط سے چلنے کی ضرورت ہے۔ وہ لوگ بہت عرصے تک بہروز کو بھولنے والے نہیں ہیں۔" سیٹھ ابراہیم واپس پلٹ گیا۔

میں دبئی واپس پہنچا تو پہلی مرتبہ اپنی اطراف غور سے ماحول کا جائزہ لیا تو مجھے سیٹھ ابراہیم کی بات ٹھیک لگی۔ دبئی ائرپورٹ ہی سے میری نگرانی شروع ہو چکی تھی، ایک سرکاری گاڑی نے گھر تک ہمارا پیچھا کیا اور پھر صبح و شام، آتے جاتے میں نے کچھ مخصوص چہروں اور گاڑیوں کو ہمیشہ اپنے گھر، دفتر اور ہر اس جگہ کے آس پاس پایا، جہاں مجھے پہنچنا ہوتا تھا۔ مجھے ایک عجیب سی گھٹن چوبیس گھنٹے محسوس ہونے لگی، جیسے وہ شہر نہیں، کوئی قید خانہ ہو، شاید سلاخوں کے پیچھے قید رہنا کھلے آسمان تلے قید رہنے سے کہیں زیادہ آسان ہوتا ہے۔ ویسے بھی اب میرا جی اس ریت اور سیمنٹ سے بنی عمارتوں کے صحرا سے اکتانے لگا تھا، لہٰذا میں نے اپنے مُلک واپسی کا فیصلہ کرلیا۔ رفیق نے یہ خبر سُنی تو آگے بڑھ کر مجھے گلے لگالیا۔ "خوش کردیا تو نے یار...... پتا نہیں کیوں، مگر مجھے ہر وقت تیری طرف سے دھڑکا ہی لگا رہتا ہے۔ تُو چل، میں بھی تیرے پیچھے سب سمیٹ کر واپس پلٹتا ہوں۔ ہماری مٹی اور ہمارا خمیر یہاں کا نہیں ہے یار...... چاہے ساری عُمر گزار لیں، پھر بھی ایک اجنبیت اور غیریت کا احساس ہمیشہ بے چین رکھتا ہے۔ چاہے وہاں اپنے ملک میں کچھ بھی ٹھیک نہیں، پر اس اَن جانے پن سے تو نجات ملے گی۔" میں نے اپنے باقی اسٹاف کو جمع کر کے اپنی واپسی کا فیصلہ سُنایا تو وہ پریشان ہوگئے کہ پیچھے اتنا بڑا کاروبار کون سنبھالے گا۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ میں مہینے میں ایک دو بار چکر لگالیا کروں گا اور پھر آج کل تو ہزار سہولتیں پیدا کردی ہیں، ان نت نئی ایجادات نے۔ انسان جسمانی طور پر چاہے موجود نہ ہو، پر تصویر اور آواز کے ذریعے چوبیس گھنٹے رابطے میں رہ سکتا ہے۔ محل کے معاملات میں نے مارتھا کو کیئر ٹیکر بنا کر اس کے حوالے کردیے اور اس سے، دبئی سے صرف بہروز کا سفید پیانو پاکستان بھجوانے کی درخواست کی۔

میرے عملے نے دو ہفتے کی جاں فشانی کے بعد میرے ہی شہر کے سب سے پوش علاقے میں میرے لیے ایک بنگلہ خرید کر اسے اپنے طور پر آراستہ بھی کروا دیا تھا اور پھر میری روانگی کا دن بھی آگیا۔ میں نے رفیق کو سختی سے منع کیا تھا کہ وہ میری واپسی کی خبر کو حتی الامکان زیادہ پھیلنے سے روکے رکھے، مگر میں اسے یہ تاکید کرنا بھول گیا کہ یہی احتیاط وہ پاکستان میں میرے خاندان والوں کے لیے بھی روا رکھے، اور پھر وہی ہوا، جس کا ڈر تھا، میرے شہر کے ہوائی اڈے کے باہر انتظار گاہ میں میرا سارا خاندان گل دستے اور ہار لیے میرا انتظار کر رہا تھا، سبھی بہن بھائی اور ان کی اولاد، بھابیاں اور بھابیوں کی بہنیں اور ان کے خاندان کے بزرگ، پورا ایک لشکر میرے استقبال کے لیے موجود کھڑا تھا۔ مجھے وہ دن یاد آگیا، جب میں یہاں سے دبئی جانے کے لیے ایک پرانے رکشے میں ائرپورٹ پہنچا تھا۔ اُس دن میرے گھر کے صحن تک بھی کوئی مجھے رخصت کرنے نہیں آیا تھا۔ وقت بھی کیسی کروٹیں بدل لیتا ہے۔ نہ جانے کیسے پل میں بدل جاتے ہیں، یہ دنیا کے بدلتے رشتے......ساری عُمر جنہوں نے پَری زاد پر سنگ باری کی، آج وہی لوگ پھولوں کی پتیاں نچھاور کر رہے تھے، سچ تو یہ ہے کہ مجھے ان کے برسائے پتھروں نے اتنی چوٹ نہیں پہنچائی تھی، جتنا لہولہان مجھے ان کے پھینکے ہوئے پھولوں نے کیا۔ بھائیوں کا اصرار تھا کہ میں ان کے ساتھ ان کے گھر چلوں، میں تقریباً سات سال بعد واپس لوٹا تھا اور ان سات سالوں میں، میں نے اپنے سب بہن بھائیوں کو اتنا روپیا بھیجا تھا کہ وہ سب آج اپنے اپنے ذاتی گھروں کے مالک تھے، بہنوں کی شادیاں ہوچکی تھیں اور وہ بھی اپنے گھروں میں خوش تھیں، سبھی کی خواہش تھی کہ میں کم از کم پہلا دن ان کے گھر پر گزاروں، بھابیوں کی جو بہنیں اب رشتے کے قابل تھیں، وہ پوری تیاری کے ساتھ بن ٹھن کر آئی تھیں اور ہر بھابی کی تقریباً یہی خواہش محسوس ہو رہی تھی کہ میں وہیں ائرپورٹ ہی پر ان میں سے کسی ایک کو پسند کر کے رشتے کے لیے ہاں کردوں، حالاں کہ ان مظلوم لڑکیوں کے چہروں پر لکھی بے چارگی کی داستان صاف نظر آرہی تھی کہ وہ خود پر کس قدر جبر کر کے خود کو اس امتحان کے لیے تیار کر پائی ہوں گی۔

میں نے بڑی مشکل سے ان سب کو یقین دلایا کہ مجھے ایک بے حد فوری نوعیت کی کاروباری میٹنگ کے لیے جانا ہے اور مَیں موقع ملتے ہی ان سب کی طرف فرداً فرداً حاضری دینے ضرور آؤں گا۔ میرا پاکستانی عملہ، جس کی بھرتی میرے منیجرز نے چند ہفتے قبل ہی کی تھی، حیرت سے کھڑا یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ ائرپورٹ کی پارکنگ لین میں سیاہ مرسڈیز گاڑیوں کا فلیٹ میرے استقبال کے لیے موجود تھا اور میں کسی نہ کسی طرح سب کو مطمئن کر کے، یا شاید غیر مطمئن چھوڑ کر اپنے گھر کو روانہ ہوا تو شہر کے راستے اور گلیاں مجھے اُسی طرح خود پر مُسکراتے نظر آئے، جیسے میں انہیں سات سال پہلے مُسکاتا چھوڑ گیا تھا۔ نہ جانے ہم پردیس جا کر یہ کیوں سمجھنے لگتے ہیں کہ ہمارے جاتے ہی دیس میں سب کچھ بدل چکا ہوگا۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ وہی سڑکیں، وہیں راہیں جن پر میں جانے کتنے سال تک جوتیاں چٹخاتا رہا تھا۔ میں شہر کے سب سے قیمتی علاقے میں اپنے نئے گھر پہنچا، تو مجھے ان اجنبی دیواروں سے شناسائی میں کافی وقت لگا۔ بہ ظاہر پتھر کے بے جان نظر آنے والے یہ درو دیوار بھی اپنے اندر ایک عجیب سا احساس رکھتے ہیں۔ ہم سے خوش یا ناخوش رہتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ہم سے باتیں بھی کرتے ہیں۔ مگر ہم انسانوں کی محدود سماعت ان کی یہ گفتگو سُن نہیں پاتی۔ شام کو میرے بلاوے پر کبیر بھی پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر چند لمحوں کے لیے میں حیرت زدہ سا رہ گیا۔ وہ بہت حد تک اپنے بڑے بھائی فیروز سے مشابہت رکھتا تھا۔ گو، عمر میں اس سے چھوٹا تھا۔ کبیر بھی فیروز کے ذکر پر افسردہ ہوگیا، میں نے اسے گھر کی تمام تر ذمے داری سونپ دی۔ وہ شروع ہی میں اتنی بڑی ذمے داری لینے سے کچھ ہچکچا رہا تھا، مگر میرے اصرار پر مان گیا۔ میں نے اسی کو اپنا سکیوریٹی انچارج بھی مقرر کردیا اور شاید اپنے بڑے بھائی کی طرح وہ بھی اسی کام میں راحت محسوس کرتا تھا۔ اس نے بڑے فخر سے اپنی جیب سے ایک غیر ممنوعہ پستول کا لائسنس نکال کر مجھے دکھایا۔ "یہ دیکھو صاب۔ ہمارے پاس اسلحے کا لائسنس بھی ہے۔ ہمارے ہوتے آپ کو کسی فکر کا ضرورت

نہیں۔‘‘ میں جانتا تھا کہ کبیر خان سچ کہہ رہا ہے۔ ہمارے ملک میں بڑے لوگوں میں شمار کے لیے آج کل ذاتی محافظوں کی ایک فوج بھی لازمی درکار ہوتی ہے۔ مجھے بہروز کی ایک نصیحت ہمیشہ یاد رہتی تھی کہ ’’جیسا دیس ہو، بھیس بھی ویسا ہی ضروری ہے...... ورنہ یہ انسان عموماً دوسرے انسان کو کم تر سمجھنے میں دیر نہیں کرتا۔‘‘ اور میں نے پردیس میں اپنی زندگی کے اتنے سال کم تر دکھائی دینے کے لیے ضائع نہیں کیے تھے۔ ہفتے بھر ہی میں سارے شہر کے امراء کو خبر ہو چکی تھی کہ ’’پی زیڈ‘‘ نامی کوئی بہت بڑا صنعت کار شہر میں اپنا کاروبار پھیلانے کے لیے وارد ہو چکا ہے۔ ہاں، پی زیڈ۔ یہی نام تجویز کیا تھا میرے منیجرز نے میری نئی کمپنی کے لیے، اور جو مجھے میرے نام سے نہیں جانتے تھے، اب میں ان کے لیے پی زیڈ نامی ایک بڑا انڈسٹریلیسٹ تھا۔ اس طرح مجھے اس تعارفی شرمندگی سے بھی عارضی طور پر نجات مل گئی تھی، جو پورا نام بتانے میں مجھے ہمیشہ اٹھانی پڑتی تھی۔

یہ دولت مند لوگ اندر سے کتنے تنہا ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے چند دنوں ہی میں ہو گیا، جب چاروں طرف سے مجھے تعارفی دعوت ناموں نے گھیر لیا۔ یہ شام کی پارٹیاں، رات کی دعوتیں، ظہرانے، عصرانے اور عشائیے۔ آخر ان امیروں کو اپنے اردگرد ہر وقت اتنا ہجوم کیوں چاہیے ہوتا ہے؟ یہ سب اندر سے شدید تنہا ہونے کی نشانی نہیں تو اور کیا ہے، مگر میں تو ہمیشہ ہی سے ان پُرہجوم محفلوں سے کتراتا تھا۔ لوگوں کی تیز چُبھتی نظریں، طنز اور طعنوں کا عادی ہو جانے کے باوجود میں اس تجربے کو بار بار نہیں دہرانا چاہتا تھا۔ ہم اپنی زندگی میں بہت سی بے چینیاں اور درد اس لیے بھی پال لیتے ہیں کہ ہمیں حقائق سے نظریں چرانے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ میرا اسٹاف منیجر، کمالی بہت تیز اور چلتا پُرزہ قسم کا بندہ تھا۔ وہ شہر میں ہونے والی کسی بھی بڑی تقریب کا دعوت نامہ مجھ تک پہنچانے میں دیر نہیں کرتا تھا، مگر میں ہر بار کسی نہ کسی طور اسے ٹال دیتا تھا۔

اگلے ہفتے سے میں نے سمندر کنارے ایک اعلیٰ ذاتی عمارت میں قائم اپنے دفتر جانا شروع کر دیا۔ ہمارا زیادہ تر کام ابھی تک دبئی آفس ہی سے ہوتا آ رہا تھا، مگر کمالی نے یہاں بھی خاصا عملہ بھرتی کر لیا تھا۔ مجھے ایک بار پھر تعارفی مرحلے کی اذیت سے گزرنا پڑا۔ ایک بات میں کبھی بھی ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں پایا تھا کہ یہ ان بڑے بڑے غیر متعلقہ دفتروں میں اتنی بہت سی خواتین کیوں بھرتی کر لی جاتی ہیں۔ جب کہ کچھ کاموں کی نوعیت اس صنفِ نازک کی موجودگی سے بالکل بھی میل نہیں کھاتی۔ جیسا کہ ہماری تعمیراتی کمپنی، جانے کمالی نے اتنے بہت سے اسسٹنٹ اور ڈپٹی منیجر ٹائپ عہدوں پر ان نازک لڑکیوں کو کیوں بھرتی کر لیا۔ میرے استفسار پر وہ دھیرے سے مسکرایا۔ ’’ساری بات حسِ لطافت کی ہے سر، وہ جسے انگریزی میں Aesthetic Sense کہتے ہیں۔ ویسے بھی ریسرچ نے ثابت کیا ہے کہ جن دفاتر میں خواتین، مَردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں، وہاں کے مرد ورکرز زیادہ ذمے داری کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ لباس اور اوقاتِ کار کا بھی خاص خیال رکھتے ہیں سَر جی۔ اور دفتر کا ماحول بھی خوش گوار رہتا ہے۔‘‘ میرا جی چاہا کہ میں کمالی سے پوچھوں کہ اس نے دفاتر اور ان کے طریقۂ کار پر ہونے والی سیکڑوں تحقیقات میں سے صرف ایک اسی ریسرچ کو نافذ العمل کیوں سمجھا؟ مگر میں چپ رہا۔ دفتر میں کام کرنے والی خواتین اور لڑکیاں بھی پہلی بار مجھے دیکھ کر اسی تذبذب کا شکار ہوئیں، جو میرے لیے ہر عورت کا خاصہ رہا تھا۔ مگر میں اس کمپنی کا مالک تھا اور ان کی مجبوری تھی کہ وہ میرے احترام میں کھڑی ہو جائیں اور مجھ سے بات کرتے وقت ان کے ہونٹوں پر ایک مصنوعی مسکراہٹ جَمی رہے۔ کمالی نے میرے آنے سے پہلے ہی میرے لیے ایک تیز طرار سی لیڈی سیکرٹری کا بندوبست کر رکھا تھا۔ جسے میں نے پہلے دن ہی کسی ڈپٹی منیجر کے سیکشن میں منتقل کر دیا اور کمالی ہی کو اپنا پی اے بھی مقرر کر لیا۔ جانے یہ کمالی کی ترقی تھی یا تنزلی، مگر وہ اس خدمت سے بہت خوش دکھائی دیا۔ کبیر خان میرے ساتھ ہی میری گاڑی میں دفتر آتا اور میری روانگی تک عمارت کے کسی گوشے میں یا باہر گاڑی ہی میں میرا انتظار کرتا رہتا، مگر نہ جانے کیوں کمالی کی اس سے جان جاتی تھی۔ کمالی کئی بار مجھ سے دبے لفظوں میں یہ گزارش کر چکا تھا کہ میں اسے اپنے ساتھ دفتر کے اندر تک نہ لایا کروں، کیوں کہ بقول اس کے، کبیر خان کا انداز ہی بڑا خوف ناک تھا۔ اور خود کبیر خان کے بھی کمالی کے بارے میں کچھ اچھے خیالات نہیں تھے۔ ’’ہم کو یہ آدمی کچھ ٹھیک نہیں لگتا صاب۔ یہ بڑا چاپلوس ہے اور خوشامدی لوگ اچھا نہیں ہوتا۔‘‘ وہ دونوں میرے لحاظ کی وجہ سے ایک دوسرے کو برداشت کرتے آ رہے تھے۔ میں نے کبیر خان کو سمجھایا کہ یہ دنیا چلتی ہی خوشامد پر ہے۔ صدر سے لے کر کلرک تک سب کسی نہ کسی خوشامد کی وجہ سے اپنی جگہ اور عُہدے پر قائم ہیں۔ خوشامد شاید دنیا کا سب سے قدیم ہتھیار ہے، جس کی دھار کسی بھی دور میں کند نہیں ہوتی۔

کچھ دن اسی ہنگامہ خیزی کی نذر ہو گئے، مگر جیسے ہی کاروباری معاملات اپنی ڈگر پر آئے، میں نے ڈرائیور کو گاڑی نکال کر، اسے شہر کے وسط میں واقع ایک گنجان علاقے میں چلنے کے لیے کہا۔ تنگ سڑکوں اور گلیوں سے ہوتے ہوئے ہم گھنٹہ بھر بعد ایک کھلے میدان میں آ نکلے۔ سامنے ابھی تک وہی پرانا ٹین کا بڑا سا نصف گولائی میں کٹا بورڈ گیٹ پر آویزاں تھا، ’’مستانہ گیراج‘‘ میری آنکھوں کے سامنے ماضی کے کئی دن، پل بھر میں لہرا گئے۔ ڈرائیور کو میں نے گاڑی گیراج کے احاطے میں لے جانے کو کہا۔ اس نے دبے لفظوں میں مجھے بتانے کی کوشش کی کہ کمپنی کی گاڑیوں کے لیے اپنا مخصوص ڈیلر اور گیراج شہر کے پوش علاقے میں موجود ہے، مگر میں نے سُنی ان سُنی کر دی۔ گیراج کے برآمدے میں لکڑی کے ستون کے ساتھ اپنی مخصوص جگہ پر وہی پرانا سا ریڈیو لٹکا ہوا تھا اور فضا استاد مستانے کے مَن بھاتے گانوں کی آواز سے گونج رہی تھی ’’جو درد دیا، اپنوں نے دیا، غیروں سے شکایت کون کرے......‘‘ گاڑی اندر داخل ہوتے دیکھ کر ایک شاگرد بھاگتا ہوا ہماری کار کی طرف آیا۔ ’’جی صاحب...... حکم کریں، سروس کرنی ہے یا آئل بدلوانا ہے۔ ٹیوننگ بھی ہو جائے گی، پر آپ کی گاڑی کا انجن سیل بند ہے۔ کچھ وقت لگے گا ہماری ورک شاپ پر......‘‘ یہ کوئی نیا لڑکا تھا۔ کچھ دور باقی لڑکے ویلڈنگ پلانٹ پر اسی طرح ویلڈنگ میں جُتے ہوئے تھے، جیسے کبھی میں وہاں سارا دن بیٹھ کر اپنا خون ویلڈنگ کی چنگاریوں میں جلایا کرتا تھا۔ میں نے لڑکے سے سختی سے کہا ’’تمہارا استاد کہاں ہے؟ اس نے ہماری گاڑیوں کا ستیاناس کر دیا ہے، ٹھیک سے کام نہیں آتا اُسے، جاؤ، بلا کر لاؤ۔‘‘ شاگرد گھبرا کر اندر کی جانب بھاگا اور چند لمحوں بعد استاد کی غصّے میں بھَری آواز سنائی دی۔ ’’ارے کون سا سیٹھ ہے میاں! ہم بھی تو دیکھیں، استاد مستانے نے آج تک اپنے کام میں ہیرا پھیری نہیں کی۔ ہم محنت کرتے ہیں، چوری نہیں کرتے۔‘‘ استاد مستانہ اپنے مخصوص حلیے میں سر پر دو پلی ٹوپی رکھے، واسکٹ پہنے اور منہ میں پان دبائے بڑبڑاتا ہوا برآمدے سے نکل کر گیراج کے صحن میں آیا اور ہماری گاڑی کی طرف بڑھا۔ میں نے ڈرائیور اور کبیر کو گاڑی کے اندر ہی بیٹھے رہنے کو کہا اور خود نیچے اتر آیا۔ میری آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ تھا، جسے میں نے اتار کر اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ استاد بے خیالی میں غصّے میں بھرا میری طرف بڑھا۔ میں منہ دوسری جانب موڑ کر کھڑا ہو گیا اور غصّے سے بولا۔ ’’کیوں استاد مستانے...... یہ گیراج ہے یا ہیرا پھیری کا اڈا......؟‘‘ مستانے کے سارے شاگرد برآمدے میں دم بخود کھڑے اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ کب ان کا بھڑکیلا استاد سب کچھ بھول کر مجھ پر پل پڑے۔ میرے تیور دیکھ کر کبیر خان کا ہاتھ ہولسٹر میں بندھے پسٹل کی جانب بڑھ گیا۔

(جاری ہے)



......ہاشم ندیم......

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ’’خدا اور محبت‘‘ اور ’’بچپن کا دسمبر‘‘ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ’’عبداللہ‘‘ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز فلم کے شعبے میں ’’عبداللہ‘‘ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

’’پری زاد‘‘ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ’’سنڈے میگزین‘‘ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

استاد مستانے کے شاگردوں نے بھی اپنے طور پر آس پاس پڑے اوزار بطور ہتھیار اٹھا لیے، کیوں کہ انہیں یقین ہوگیا تھا کہ اُن کا استاد اکیلا ہی ہم سے بھڑ جائے گا۔ تبھی میں نے پلٹ کر بپھرے ہوئے استاد مستانے کی طرف دیکھا۔ ’’کم از کم یہ سات سو سال پرانا ریڈیو تو بدل لیتے استاد...... اب تو اس کے اردو گانے بھی چائنیز میں سُنائی دیتے ہیں۔‘‘ استاد کا منہ کُھلے کا کُھلا رہ گیا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی جیسے وہ اپنی جگہ جامد ہوگیا اور پھر اس کی آنکھوں سے ایک جھڑی سی جاری ہوگئی اور وہ دوڑ کر روتے ہوئے میرے گلے لگ گیا۔ ’’او بے وفا......! اتنے دن بعد اپنے استاد کی یاد آئی۔ مجھے رفیق نے فون کرکے بتایا تھا کہ تم واپس آچکے ہو۔‘‘ سارا گیراج ہمیں حیرت سے دیکھ رہا تھا اور پھر چند پرانے شاگردوں نے بھی مجھے پہچان لیا اور ہمارے گرد ایک جمگھٹا سا لگ گیا۔

استاد نے بڑی مشکل سے انہیں ڈانٹ کر کام پر لگایا، مگر وہ سب بہانے بہانے سے میری کار کے گرد چکر کاٹتے رہے۔ وہ سب جان چکے تھے کہ کل تک میں بھی انہی میں سے ایک تھا، مگر آج اُن کے سامنے ان کے خوابوں کی تعبیر بنا کھڑا تھا۔ ہم کم زور اور بے بس انسان جنم سے لے کر فنا تک یہی تو کرتے رہتے ہیں، اپنے خوابوں کا پیچھا، ان خوابوں کو سچ کرنے کی دُھن میں مگن...... مگر ہر ایک کے حصّے میں تعبیریں بھلا کب آتی ہیں اور گیراج کے معصوم لڑکے یہ بات نہیں جانتے تھے کہ میں آج جو کچھ تھا، یہ کبھی میرا خواب نہیں رہا تھا۔ میں نے تو بہت چھوٹا سا سپنا بُنا تھا۔ بہت معصوم سا خواب تھا میرا، مگر اس کی تعبیر کے لیے جانے مجھے ابھی کتنے طویل رستوں سے گزرنا باقی تھا کہ منزل ابھی تک لاپتا تھی۔ شاید ہر انسان ہی کا مقدر، اپنے خوابوں کو کسی اور کے لیے تعبیر ہوتے دیکھنا ہوتا ہے اور اس کا اپنا خواب سدا کے لیے خواب ہی رہ جاتا ہے۔

استاد مستانے نے نکڑ کے ہوٹل سے میری پسندیدہ دودھ پتّی چائے منگوائی اور خود میرے سامنے بیٹھ کر ٹکر ٹکر مجھے دیکھنے لگا۔ ’’تم نے تو واقعی کر دکھایا پیارے، ورنہ میرا تو کرامات سے یقین ہی اُٹھ چلا تھا۔ جو تم نے چاہا، تمہیں مل گیا۔ ایسا دنیا میں کہاں ہوتا ہے بھلا۔‘‘ میں نے مسکرا کر استاد کی طرف دیکھا۔ ’’صرف تھوڑی سی دولت آگئی ہے، میرے پاس باقی کچھ نہیں بدلا استاد...... میں ابھی تک وہی پری زاد ہوں۔‘‘ استاد نے پینترا بدل کر کہا۔ ’’کمال کرتے ہو تم، دولت سے بڑی تبدیلی بھی کوئی اور ہوتی ہے کیا......؟ لوگوں کی زندگیاں صرف ہوجاتی ہیں چند دھیلے کمانے میں۔ اب مجھ ہی کو دیکھ لو، سدا کے کنگال ہی رہے۔ اچھا یہ بتاؤ، کوئی شادی وادی بھی کی ہے یا نہیں، یا ابھی تک وہی شرمیلے، کنوارے پری زاد ہو؟‘‘ میں نے مزے دار چائے کا آخری گھونٹ حلق سے نیچے اتارا۔ ’’مجھ سے بھلا کون شادی کرے گی استاد، اور پھر شاگرد بیاہ کرلے اور اس کا استاد کنوارا رہے، یہ کہاں کا دستور ہے؟‘‘ استاد نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ’’کیوں اس عُمر میں میری لٹیا ڈبونے کی بات کرتے ہو پری زاد پیارے، اور یہ کیا بات کردی کہ تم سے کون بیاہ کرے گی، ذرا اعلان تو کرکے دیکھو نکاح کا، پورا سوئمبر رچے گا تمہارا تو......‘‘ میں نے استاد کی بات دوسری جانب موڑ دی۔ ’’میری شادی کی بات چھوڑو تم یہ بتاؤ کہ گیراج کا یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟ لگتا ہے برسوں سے رنگ و روغن نہیں کروایا۔ کام والی گاڑیاں بھی اکّا دُکّا کھڑی نظر آرہی ہیں، صحن میں۔ یہ سب کیا ہے......؟‘‘ استاد نے میری بات ٹالنے کی کوشش کی۔ ’’کچھ نہیں دھندے میں تو بھلا مندا چلتا ہی رہتا ہے، تم سناؤ کیسی گزر رہی ہے؟‘‘ اتنے میں چائے کے برتن اٹھانے والے لڑکے نے ہماری بات سُن کر راز کھول ہی دیا۔ ’’پری زاد بھائی! گیراج تو گروی پڑا ہے ہمارا تین سال سے۔ استاد غلط بتا رہا ہے، کوئی دھندا نہیں، صرف مندا ہی مندا ہے آج کل یہاں۔‘‘ استاد نے آنکھیں دکھاتے ہوئے اسے بُری طرح سے جھاڑ پلائی۔ ’’کم بخت! تُو باز نہیں آئے گا بڑوں کی باتوں میں دخل دینے سے، چل دفع ہو، جاکر اس اٹھتر بیاسی کرولا کے ڈینٹ نکال۔ شام تک مجھے گاڑی تیار چاہیے، ورنہ کھال ادھیڑ دوں گا تیری۔‘‘ لڑکا منہ بسورتا وہاں سے چلا گیا۔ میں نے استاد کی طرف دیکھا۔ ’’یہ میں کیا سُن رہا ہوں استاد! گیراج گروی پڑا ہے، کیوں......؟‘‘ استاد نے ایک لمبی سانس بھری۔ ’’اب کیا بتاؤں پری زاد! پرانے میکینک اور گیراجوں کا کام ٹھپ ہوچکا ہے۔ گاڑیوں کے انجن اب سیل بند آتے ہیں۔ ٹیوننگ اور مرمت کمپیوٹر والی مشینوں پر ہوتی ہے۔ ٹائر بنا ٹیوب کے آگئے ہیں اور خراد کا کام اب ماڈرن مشین کرتی ہے۔ ہمارے پاس تو وہی چند پرانی کھٹارا گاڑیاں آتی ہیں، جن کا مزاج یہ نئی مشینیں سمجھ نہیں سکتیں۔ خرچے تمہارے سامنے ہی تھے سارے۔ ایسے میں گیراج گروی نہ رکھتا تو کیا کرتا۔ مجھے اپنی فکر نہیں، بس یہی سوچ کر پریشان رہتا ہوں کہ گیراج کی قرقی یا نیلامی کے بعد نیا مالک کہیں ان بچّوں کو بے روزگار نہ کردے۔ تم تو جانتے ہو، ان سب کے گھر، ان ہی کے دم سے چلتے ہیں۔ کئی دفعہ ان سے کہا کہ کم بختو، جاؤ جاکر کوئی نیا دھندا ڈھونڈو...... پر، یہ ہیں کہ یہاں سے ٹلتے ہی نہیں۔‘‘ میں چپ چاپ بیٹھا استاد کی ساری بات سُنتا رہا۔ ’’کس کے پاس گروی رکھا ہے یہ گیراج تم نے......؟‘‘ استاد نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا۔ ’’یہ اسی علاقے کا ایک مارواڑی سیٹھ، بھلا آدمی ہے۔ قرقی کی تاریخ سے پہلے تنگ نہیں کرے گا۔‘‘ ’’مجھے اس سیٹھ کا نام اور مکمل پتا چاہیے استاد۔‘‘ استاد نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’نہیں پیارے! استاد اپنے شاگردوں کو دیتا ضرور ہے، لیتا کچھ نہیں۔‘‘ میں نے استاد سے زیادہ بحث نہیں کی اور کمالی کو فون کرکے گیراج پہنچنے کو کہا۔ آدھے گھنٹے بعد ہی وہ ہڑبڑایا سا گیراج میں موجود تھا۔ میں نے گیراج کے سب سے سینئر شاگرد کو کمالی اور ڈرائیور کے ساتھ سیٹھ کی طرف بھجوا دیا، جس کا پتا گیراج کے سبھی لڑکے جانتے تھے۔ تین گھنٹے بعد ہی کمالی رہن رکھے گئے کاغذات کے ساتھ میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے جائداد کی آزادی کے کاغذ استاد کی جھولی میں ڈال دیے۔ ’’یہ گیراج جتنا تمہارا ہے، اتنا ہی میرا بھی ہے استاد۔ اگلے ہفتے تک نئی کمپیوٹرائزڈ مشینری بھی آجائے گی اور تمہاری یہ ڈیوٹی ہے کہ اپنی نگرانی میں میرے اس گیراج کو ایک دم ٹِپ ٹاپ بنادو۔ اگلی دفعہ جب میں اپنے گیراج کو دیکھنے آؤں، تو مجھے یہاں میرا پرانا استاد مستانہ چاہیے۔ ہاں، مگر یہ ریڈیو نہ بدلنا۔ اس کے بنا یہ گیراج مکمل نہیں ہوگا۔‘‘ استاد مستانہ گم صم سا ہاتھوں میں قرقی کھلنے کے کاغذات لیے بیٹھا مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کا کاندھا تھپتھپایا اور اٹھ کر وہاں سے جانے کے لیے مُڑا۔ استاد نے مجھے پیچھے سے آواز دی۔ ’’پری زاد......‘‘ میں نے مُڑ کر دیکھا تو وہ میرے گلے لگ گیا۔ میرے آس پاس گیراج کے سارے لڑکے جمع

ہو چکے تھے، کسی نے میرے ہاتھ تھام رکھے تھے، تو کوئی میرے شانے سے لگا کھڑا تھا۔ یہ کم بخت، بے جان اور کھردرے کاغذ کے چند روپے اپنے اندر کتنی خوشیوں پر قبضہ جمائے رکھتے ہیں۔ کیسے کیسے کرتب، کرشمے دکھاتا ہے یہ پیسا۔ روتوں کو ہنسا دیتا ہے اور ہنستوں سے بچھڑ کر انہیں آٹھ آٹھ آنسو رلاتا ہے، اور یہ دولت مند کتنے ان جان رہتے ہیں، اس پیسے کے استعمال سے۔ کاش! ان بے جان کاغذ کے ٹکڑوں کا صرف ایک مصرف ہوتا، خوشیوں کا کاروبار۔ ان لڑکوں کے چہروں پر ایسی خوشی تھی کہ جس کے بدلے ساری دنیا کی دولت بھی لٹا دی جاتی تو کوئی گھاٹے کا سودا نہ ہوتا، مگر عموماً قدرت جنہیں دولت دیتی ہے، بدلے میں ان کا دل نکال لے جاتی ہے، شاید اسی لیے یہ دنیا دل والوں سے خالی ہوتی جا رہی ہے۔

گیراج سے نکلتے نکلتے سہ پہر کے چار بج گئے۔ دفتر جانے کا وقت تو رہا نہیں تھا، میں نے ڈرائیور کو گاڑی گھر کی طرف موڑنے کا کہہ دیا اور پھر واپسی پر میری نظر اپنی پرانی یونی ورسٹی کے بورڈ پر پڑی۔ میں نے گاڑی رکوا دی اور کچھ دیر کے لیے نیچے اتر کر گیٹ سے اندر چلا گیا۔ اس درس گاہ میں، مَیں نے اپنی زندگی کے چند اچھے دن گزارے تھے، اچانک ہی میرے اندر خود میرے ہی ہاتھوں دفنایا ہوا، وہ ایک ناکام سا شاعر جاگ اٹھا، جس کے کلام پر داد و تحسین سے کبھی وہ سامنے نظر آنے والا بڑا آڈیٹوریم گونج اٹھتا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ دبئی جاتے وقت میں اپنی ساری نظمیں اور کلام ٹین کے ایک بکسے میں بند کر کے اپنے پرانے گھر کے چھت والے کمرے میں چھوڑ آیا تھا۔ جانے اب وہ سارے رجسٹر اور کاغذوں کے دستے کہاں ہوں گے۔ کاش! میں وہ سب اپنے ساتھ ہی دبئی لے جاتا۔ میں ان ہی خیالوں میں گم تھا کہ میرے عقب میں ایک مانوس سی بھاری آواز گونجی۔ ’’تم پَری زاد ہو ناں......‘‘ میں چونک کر پلٹا۔ میرے عقب میں کھڑی میری گاڑی سے کچھ فاصلے پر ایک بزرگ شیروانی اور جناح ٹوپی پہنے کھڑے مجھے اپنی نظر کے چشمے کے پیچھے سے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ ’’جی...... میں پَری زاد ہوں...... مگر آپ......؟؟‘‘ وہ میری طرف بڑھے۔ ’’بھول گئے، یادداشت کی کمزوری تو بڑھاپے سے مشروط ہوتی ہے، مگر مَیں نے تو تمہیں پہلی نظر ہی میں پہچان لیا تھا۔‘‘ میری زبان سے بے اختیار نکل گیا۔ ’’مجھے پہچاننے کے لیے شاید یادداشت شرط نہ ہو۔ آپ شاید سر احمد ہیں، ہمارے لائبریری انچارج؟؟‘‘ وہ مُسکرائے۔ ’’ٹھیک پہچانا۔ تمہارے جانے کے بعد اردو بزمِ ادب کا شعبہ بھی میرے حوالے کر دیا گیا تھا۔ تمہاری کہی ہوئی نظمیں آج تک جامعہ کے ادبی پرچے میں چَھپتی رہتی ہیں اور تمہاری وہ اسٹیج ڈرامے والی نظم ’’گر تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے......‘‘ ہر سال جب بھی اوتھیلو اسٹیج کیا جاتا ہے، پس منظر میں تمہاری وہ نظم ضرور دہرائی جاتی ہے۔‘‘ میں خاموشی سے احمد صاحب کی بات سُنتا رہا۔ میرا دل چاہا کہ انہیں بتا دوں کہ مَیں وہ شاعری بھی کسی خاص مقصد سے کیا کرتا تھا۔ کالج کی چند مہ جبینوں میں اک ذرا سی توجہ حاصل کرنا مقصد تھا میرا، اور بس...... انہوں نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ’’مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی، تم اچانک یونی ورسٹی چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے، تعلیم مکمل کی یا نہیں؟‘‘ میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ ’’کچھ مجبوریاں تھیں سر، مجھے دبئی جانا پڑا۔‘‘ سر احمد نے پلٹ کر میری قیمتی گاڑی اور گارڈز کی طرف دیکھا۔ ’’لگتا ہے، تم نے وقت ضائع نہیں کیا وہاں، لیکن تم یہاں باہر لان میں کیوں کھڑے ہو، اندر چلو۔ بہت سے طالب علم تم سے ملنا چاہیں گے۔ شعبۂ اردو میں اکثر تمہاری نظموں پر بات چلتی ہے۔‘‘ میں نے طریقے سے معذرت کی۔ ’’نہیں سر...... آج نہیں، یہ میرا کارڈ ہے۔ کبھی فرصت ملے تو میرے دفتر چکر لگائیے گا۔ آپ کی خدمت کر کے مجھے بہت خوشی ہوگی۔‘‘

یونی ورسٹی سے گھر واپس آنے کے بعد بھی، میں بہت دیر تک یونی ورسٹی کی یادوں کو اپنے ذہن سے نکال نہیں پایا۔ مجھے وہ نٹ کھٹ سی لبنیٰ بھی یاد آئی۔ جانے اب وہ کہاں ہوگی۔ سیٹھ عابد سے شادی کے بعد کبھی اس کے بارے میں کچھ سُننے میں نہیں آیا تھا۔ لبنیٰ کی ماں کے ایک جملے نے میری زندگی کے تمام راستے بدل دیئے تھے، مگر میں دولت کمانے کی دھن میں ایسا مگن ہوا کہ اپنے اندر بسنے والے اُس حسّاس اور نازک انسان کو بھی کچل کر رکھ دیا، جو کبھی میرا سب سے اچھا دوست تھا، لیکن اس ساری تگ و دو سے مجھے کیا ملا۔ میں تو آج بھی اتنا ہی تنہا اور اکیلا تھا، نہ کسی کے حرفِ دعا میں تھا، نہ کسی کے دستِ طلب میں...... نہ کسی کی آنکھ کا نور تھا، نہ کسی کے دل کا قرار...... مجھے ٹیرس پر بیٹھے جانے کتنی دیر ہو چکی تھی۔ باہر اندھیرا اچھل کر شام کو رات کی سیاہ چادر میں لپیٹ رہا تھا۔ لوگ دن اور رات کو ایک دوسرے کی ضد کہتے ہیں، مگر مجھے تو یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھی لگتے تھے، پکے دوست...... تبھی تو جب دن شدید تھکن سے چُور ہو کر شام تک ہانپنے لگتا ہے، تب شام اپنی مہربان سہیلی، رات کو آواز دے کر بلاتی ہے اور رات اپنی کالی شال میں اس تھکے ماندے دن کو سمیٹ کر سلا لیتی ہے۔ یوں شاید ہر رات کی گود میں ایک بھرپور دن آنکھیں موندے سویا رہتا ہے، بس ہمیں ہی نظر نہیں آتا۔ کچھ دیر بعد ملازم نے آ کر بتایا کہ کمالی مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ کمالی ٹیرس پر آیا تو معمول سے کچھ زیادہ پُرتکلف لباس میں ملبوس تھا۔ ’’یہ کیا سر......؟ آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے، ہمیں سیٹھ رحمان کے فارم

ہاؤس جانا ہے، پارٹی میں۔ شام سے تین مرتبہ وہ خود مجھے یاد دہانی کروا چکے ہیں کہ یہ دعوت خاص طور پر آپ کے اعزاز میں منعقد کی جا رہی ہے۔‘‘ میں نے جان چُھڑوانے کی کوشش کی۔ ’’میرا موڈ نہیں ہے کمالی، تم میری طرف سے کوئی مناسب معذرت پیش کر دینا......‘‘ کمالی گڑبڑا سا گیا۔ ’’نہیں سر! اچھا نہیں لگے گا، سارے شہر کے امراء وہاں اکٹھے ہوں گے اور پھر ہمیں وہاں، اپنے نئے ٹینڈرز کے امیدواروں سے ملنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ نیا نیا کاروبار ہے اپنا سر۔ یہ میل جول رکھنا ضروری ہے۔‘‘ میں نے بادلِ نخواستہ خود کو بڑی مشکل سے آمادہ کیا اور گھنٹے بھر بعد ہم سیٹھ رحمان کے فارم ہاؤس کی راہ پر گام زن تھے۔

آج کل امیروں کا یہ ایک نیا مشغلہ بنتا جا رہا ہے۔ شہر میں ٹھیک ٹھاک عالی شان گھر یا جائداد ہونے کے باوجود، کسی ویرانے میں سیکڑوں ایکڑ اراضی پر ایک فارم ہاؤس تعمیر کیا جاتا ہے، جہاں ایسی ہی کاروباری اور غیر رسمی دعوتیں رکھی جاتی ہیں۔ یہ فارم ہاؤسز ایک طرح سے امراء کا اسٹیٹس سمبل بھی ہوتے ہیں اور کچھ خاص لوگوں کے لیے پردے کا کام بھی کرتے ہیں۔ سیٹھ رحمان کا فارم ہاؤس بھی کچھ ایسا ہی پردہ محسوس ہوتا تھا۔ کئی ایکڑ گھاس کے میدان اور گالف کورس کے درمیان بنی شیشے کی عمارت، جس کے آس پاس مصنوعی نہر اور فواروں کے ذریعے پانی کے بہاؤ کا انتظام موجود تھا۔ انسان مادی طور پر چاہے جتنی بھی ترقی کر لے۔ پانی اور سبزہ اس کی جبلّت سے کبھی نہیں نکل سکتا۔ ہمارے ذہنوں میں جنّت کا تصور بھی تو بہتی نہروں، ٹھنڈے چشموں اور گھنے

سایوں ہی کی صورت نقش ہے۔ سارا فارم ہاؤس برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا، بار بی کیو کا بندوبست بھی باہر سبزے ہی میں کیا گیا تھا۔ میں وہاں موجود لوگوں سے صرف نام کی حد تک ہی واقف تھا، مگر لگتا تھا کہ کمالی نے میرا کافی تفصیلی تعارف کروایا تھا۔ تبھی وہ سب مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ میری کمپنی اگلے ہفتے ایک بہت بڑا آرڈر ٹینڈر کرنے والی تھی۔ معیاری آلات کی فراہمی اور ایک نئی جدید ہاؤسنگ سوسائٹی کے لیے ہمیں بہت بڑی مالیت کا ٹھیکا دینا تھا اور وہاں پارٹی میں موجود سبھی کاروباری طبقے اس ٹھیکے میں دل چسپی کا اظہار کر رہے تھے۔ سیٹھ رحمان پچاس پچپن سالہ

ایک کھاگ اور شوقین مزاج شخص تھا، جسے باتیں بنانے کے فن سے کافی آگاہی تھی۔ اس نے فرداً فرداً سبھی مہمانوں سے میرا تعارف کروایا اور وقتاً فوقتاً اپنی گفتگو کے دوران مجھے یہ جتانے میں قطعاً عار محسوس نہیں کی کہ وہ ہماری کمپنی کے ٹھیکے میں کافی دل چسپی رکھتا ہے۔ ہمارے ساتھ چلتے ہوئے کمالی جس طرح سیٹھ رحمان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا، اس سے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس نے کمالی کو بھی خوش کر رکھا ہے۔ ”کیا بتاؤں سر جی...... یہ اپنے رحمان صاحب تو یاروں کے یار ہیں، بڑا اللا گلا رہتا ہے، ان کے فارم ہاؤس پر۔ صوبائی اور وفاقی وزراء اور نوکر شاہی تو سمجھیں کہ بس ان ہی کی دل دادہ ہے، آج بھی جو کافی منسٹرز اور سیکرٹریز آپ کو اس دعوت میں نظر آ رہے ہیں، یہ ان ہی کا کمال ہے۔ سبھی کو خوش رکھنے کا فن تو کوئی رحمان صاحب سے سیکھے۔“ کمالی کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ اس محفل میں مجھے ایک اور ادراک ہوا۔ اخلاقیات اور شرم و حیا کے معیارات ہر طبقے میں اپنے اپنے طور پر طے اور رائج شدہ ہوتے ہیں۔ محفل میں زرق برق اور جھلمل کرتے ملبوسات میں خواتین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، جو اس آزادانہ ماحول میں یہاں وہاں اٹھلاتی پھر رہی تھیں اور ان میں زیادہ تر وہ تھیں، جو کسی نہ کسی بڑے آدمی کے ساتھ بطور ”دوست“ اس محفل میں شریک تھیں۔ تعارف کے دوران ان میں سے اکثر نے مجھ سے بھی مُسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا۔ کبھی مشرقی اقدار میں زنانے اور مردانے کا رواج ہوا کرتا تھا۔ بڑے بڑے راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کی محفلوں اور دعوتوں میں مرد اور خواتین الگ الگ حصّوں میں شریک ہوا کرتی تھیں۔ مطلب یہ کہ دولت کی فراوانی کا ان بدلتی قدروں سے کوئی تعلق نہیں تھا، کیوں کہ دولت اور پیسا تو ان کے پاس آج کے ان دولتیوں سے کہیں زیادہ تھا، تو پھر یہ آزاد خیالی اور بے حجابی ہمارے معاشرے میں کہاں سے دَر آئی۔ چوں کہ انسان کی ابتدا پتھر کے دور سے ہوئی تھی، تو شاید اس کا اختتام بھی پتھر کے دور ہی پر ہوگا۔ درمیانی مدت مکمل عروج اور پھر یک سر زوال کا محض ایک دورانیہ ہی تو ہے، کھانے سے پہلے ہر طرح کے غیر ممنوعہ اور ممنوعہ مشروبات سے مہمانوں کی تواضع کی گئی۔ انسان خدا سے ہمیشہ عقل اور ہوش مندی کا طلب گار رہتا ہے تاکہ زندگی متوازن اور خوش گوار گزار سکے، مگر شام ہوتے ہی ہم میں سے اکثر اس ہوش مندی سے گھبرا کر خود کو مدہوشی کے اندھیرے کنوئیں میں کیوں اتار لیتے ہیں، مجھے یہ بات آج تک سمجھ نہیں آئی تھی۔ میرے اردگرد مصنوعی مدہوشی کا دور دورہ تھا، عارضی اور جھوٹی بے خودی۔

میں نے اُکتا کر کمالی کو وہاں سے نکلنے کا اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے لپک کر میرے قریب آیا۔ ”اتنی جلدی سر...... کھانا بس لگنے ہی والا ہے۔ سیٹھ رحمان کو کسی خاص مہمان کا انتظار ہے۔ ان کے آتے ہی کھانا چُن دیا جائے گا۔“ میں نے اکتاہٹ سے کمالی کی طرف دیکھا۔ ”ہماری حاضری لگ گئی ہے، تم اب یہاں سے نکلنے کی کرو۔“ کمالی نے سر ہلایا اور سیٹھ رحمان کو روانگی سے مطلع کرنے کے لیے چلا گیا۔ میں نے ابھی کار پارکنگ کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ کسی جانب سے رحمان، کمالی کے ساتھ تیز اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا نمودار ہوا۔ ”یہ کیا بھئی، زید صاحب! آپ ابھی سے چل دیے۔ ابھی تو شام اور محفل ٹھیک طرح سے بھیگی بھی نہیں......“ میں دھیرے سے مُسکرایا۔ ”میں شام دیر تک اوس میں بھیگتا رہوں، تو مجھے زکام ہو جاتا ہے۔ بھیگنے کے معاملے میں کم ظرف واقع ہوا ہوں مَیں۔“ سیٹھ میری بات سُن کر زوردار قہقہہ لگا کے ہنسا۔ ”خوب...... بہت خوب...... بھئی میں تو سمجھتا تھا کہ پورے شہر میں، صرف ایک میں ہی بذلہ سنج باقی بچا ہوں، مگر آج اپنا مقابل دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ اب تو میں آپ کو ہرگز اتنی جلدی واپس نہیں جانے دوں گا، محفل کے بعد بیٹھ کر آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ برسوں بعد کسی ہم زاد سے واسطہ پڑا ہے۔“ میں نے بہت جان چُھڑانے کی کوشش کی کہ ”کل ایک اہم پروجیکٹ کے لیے میٹنگ کی تیاری کرنی ہے، مگر سیٹھ رحمان اڑ گیا۔ ”نہیں بھئی، ابھی تو آپ کو اس محفل کی جان سے ملوانا ہے، شہ پارہ بیگم...... چوٹی کی ایکٹریس ہیں...... بڑی دھوم مچائی ہے انہوں نے فلم انڈسٹری میں۔ ویسے تو وہ کبھی کسی پبلک پلیس پر یوں آتی جاتی نہیں، مگر ہمارے ساتھ کچھ دیرینہ مراسم کا خیال ہے انہیں، اسی لیے آ رہی ہیں۔ یہ لیں، شاید یہ ان ہی کی گاڑی ہے، وہ آ گئیں، آپ بس دو لمحے انتظار کریں۔ میں نے آپ کی بڑی تعریف کی ہے اُن سے...... وہ خود بھی بہت مشتاق تھیں آپ سے ملنے کی۔ سچ پوچھیں تو وہ صرف آپ سے ملنے ہی آ رہی ہیں۔“ سیٹھ رحمان جلدی سے آگے بڑھ گیا اور میرا سوال میرے مَن ہی میں مچل کر رہ گیا کہ وہ بھلا مجھے جانتا ہی کتنا تھا کہ اسے میری تعریف کی ضرورت پڑ گئی۔ کچھ ہی دیر میں سیٹھ رحمان ایک زرق برق، ناز و ادا کے پیکر کو لیے میری طرف آتا نظر آیا۔ میری نظر اس کے چہرے سے ہٹ کر ساتھ چلتی عورت پر پڑی تو حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ میں اس عورت کو جانتا تھا، مگر تب اس کا نام شہ پارہ نہیں تھا۔ شہ پارہ کی نظر میری نظر سے ٹکرائی، تو وہ بھی ایک جھٹکے سے ٹھٹھک کر وہیں جم گئی۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، مُلک کے معروف ومنفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ’’خدا اور محبت‘‘ اور ’’بچپن کا دسمبر‘‘ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ’’عبداللہ‘‘ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ’’عبداللہ‘‘ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

’’پری زاد‘‘ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ’’سنڈے میگزین‘‘ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

سیٹھ رحمان کے ساتھ آنے والی عورت لبنیٰ تھی۔ ہاں وہی میری یونی ورسٹی کی سب سے خُوب صورت اور طرح دار لبنیٰ، جس کی شادی سیٹھ عابد نامی ایک دولت مند کباڑیے سے ہوگئی تھی، سیٹھ رحمان ہم دونوں کی کیفیت سے بے خبر ہمارا تعارف کروانے میں مصروف تھا۔ ’’شہہ پارہ بیگم! ان سے ملیں، یہی ہیں، پی زیڈ صاحب اور آج کل شہر میں بس انہی کے چرچے ہیں اور یہ ہیں شہہ پارہ... ہمارے ملک کی نام ور آرٹسٹ، پڑوسی ملک میں بھی اپنی اداکاری سے دھوم مچا چکی ہیں۔ آج ہم نے خاص آپ سے ملاقات کے لیے انہیں مدعو کیا ہے‘‘۔ لبنیٰ چپ چاپ کھڑی میری طرف دیکھتی رہی۔ ’’ہماری پہلے بھی ملاقات ہوچکی ہے رحمان صاحب، مگر تب یہ پی زیڈ نہیں تھے اور نہ مَیں شہہ پارہ‘‘۔ سیٹھ رحمٰن کو شہہ پارہ کی بات سُن کی حیرت کا ایک جھٹکا لگا ’’ارے... واقعی... بھئی پی۔ زیڈ صاحب، آپ تو واقعی چُھپے رستم نکلے، جب کہ ہم یہ سمجھتے رہے کہ اس گوہرِ نایاب سے دوستی کا شرف صرف ہمیں ہی حاصل ہے‘‘۔ لبنیٰ عرف شہہ پارہ نے سیٹھ رحمان کی طرف دیکھے بغیر کہا ’’ہمیں کچھ دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دیجیے رحمان صاحب... پُرانے بچھڑے ہوئے ملیں، تو کہنے کو بہت کچھ ہوتا ہے دونوں کے درمیان‘‘۔ سیٹھ رحمان لبنیٰ کی بات سُن کر ہڑبڑا کے بولا ’’ہاں ہاں، کیوں نہیں، آپ لوگ باتیں کریں، میں کھانا لگوانے کا انتظام کرتا ہوں‘‘۔ سیٹھ رحمان جاتے جاتے بھی ہمیں حیرت سے دیکھتا رہا۔ لبنیٰ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائی میرے قریب آگئی، ’’پَری زاد... یہ تمہی ہو ناں! مجھے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آ رہا، تو تم ہو شہر کے وہ نئے بگ شاٹ، بڑے صنعت کار، میرا تعلق اب فلم انڈسٹری سے ضرور ہے، مگر ایسا میں نے صرف فلموں ہی میں ہوتے دیکھا ہے۔ تم واقعی ایک فاتح ہو پَری زاد...‘‘ میں نے لبنیٰ کی طرف دیکھا۔ وہ آج بھی اُتنی ہی خُوب صُورت اور جاذبِ نظر تھی، بلکہ اس کے حُسن میں اب اُداسی کی آمیزش نے ایک عجیب سا رنگ بھر دیا تھا۔ حُسن اداس ہو تو کتنا مکمل ہو جاتا ہے۔ ’’نہیں، مَیں کبھی فاتح نہیں رہا، بس ہارتا ہی آیا ہوں، مگر تم اور یہ شہہ پارہ، یہ سب کیا ہے، تمہارا شوہر کہاں ہے، وہ سیٹھ عابد...؟‘‘ لبنیٰ دھیمے سے مسکائی ’’سیٹھ عابد ایک کام یاب سوداگر تھا۔ اسے جب تک شادی کے سودے میں اپنا فائدہ نظر آیا، اس نے مجھے اپنے ساتھ رکھا اور جب سُود سمیت سارا منافع وصول ہوگیا، تو تین لفظ کہہ کر آزاد کر دیا۔ تم نہیں جانتے پَری زاد، اُسے سودے بازی خوب آتی تھی‘‘۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ’’نہیں، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ کیسا سودے باز تھا‘‘۔ لبنیٰ نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ’’اوہ! اس کا مطلب میرا شک صحیح تھا۔ اس نے تم سے بھی تمہاری شاعری کا سودا کیا تھا ناں، مجھے ہمیشہ اس کے نام سے چَھپی اس کتاب کے لفظوں میں تمہاری جھلک نظر آتی تھی، مگر میں خود کو کبھی یہ یقین نہیں دلا پائی کہ تم اپنے فن کو سیٹھ عابد جیسے کسی دکان دار کے ہاتھ بیچ سکتے ہو؟‘‘ میں نے لبنیٰ کی سیاہ غزالی آنکھوں میں چُھپے سوال کا جواب دیا۔ ’’ابھی تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ سیٹھ عابد ایک بہت کام یاب سوداگر تھا۔ اُسے ٹھیک وقت پر اپنے مطلب اور لوگوں کی مجبوریوں کی قیمت لگانا خوب آتا تھا، سچ پوچھو تو آج جو تم مجھے پَری زاد سے پی زیڈ صاحب بنا دیکھ رہی ہو، اس کے پیچھے کہیں نہ کہیں سیٹھ عابد سے کیے ہوئے اس سودے کا بھی ہاتھ ہے۔ مگر تم یہاں اس محفل میں کیسے، یہ سیٹھ رحمان تو بڑا کائیاں شخص دکھائی دیتا ہے، اور تم اس کی خاص مہمان ہو، یہ سب کیا ہے؟‘‘ لبنیٰ نے دُور کھڑے سیٹھ رحمان کی طرف دیکھا، جو مہمانوں کو کھانا لگنے کی اطلاع دے رہا تھا۔ ’’یہ سیٹھ بھی ایک کام یاب دکان دار ہے، اس نے مجھے تمہیں رجھانے کے لیے آج یہاں مدعو کیا ہے۔ تمہاری فرم سے کوئی ٹھیکہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اب میرا مصرف ان بڑے صنعت کاروں کے ہاں بس اتنا ہی رہ گیا ہے‘‘۔ میں نے دکھ سے لبنیٰ کی طرف طرف دیکھا۔ ’’اور فرض کرو تم مجھے رجھانے میں ناکام رہتیں، پھر... پھر کیا ہوتا؟‘‘ ’’کچھ زیادہ نہیں، میری بچی کھچی عزتِ نفس کو مجروح کیا جاتا اور پھر کسی اور سودے کے لیے پیش کر دیا جاتا، کیوں کہ میری ماں دنیا سے جاتے جاتے اتنے ادھار میری ذات کے لیے چھوڑ گئی ہے کہ اب میں چاہوں بھی تو ان زنجیروں سے خود کو آزاد نہیں کر سکتی‘‘۔ اتنے میں سیٹھ رحمان ہمارے قریب پہنچ گیا۔ ’’مُخل ہونے کی معذرت چاہتا ہوں، مگر کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ باتوں کے لیے تو ساری رات پڑی ہے، اور پھر مجھے تو لگتا ہے کہ شہہ پارہ بیگم ہم سے کہیں زیادہ آپ کی باتوں کی قدر دان ہیں، ورنہ اتنی لمبی گفتگو تو یہ کسی سے نہیں کرتیں۔ ہم تو بات کرنے کو ترس جاتے ہیں صاحب...‘‘۔ میں نے سیٹھ کی طرف دیکھا۔ ’’نہیں سیٹھ صاحب! اب میں چلوں گا، آپ کا کھانا شاید مجھ سے ہضم نہ ہو سکے۔ کل آپ اپنے مینیجر کو میرے دفتر بھیج دیجیے گا۔ یہ ٹھیکہ آپ ہی کو ملے گا اور یہ کیا، اس جیسے مزید جتنے سودے آپ کرنا چاہیں، میری طرف سے ہاں ہی سمجھیے گا۔ بدلے میں مجھے صرف کسی کی آزادی درکار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ آپ کے لیے گھاٹے کا سودا نہیں ہوگا۔ اگر منظور ہو تو اپنے مینیجر کو قیمت بتا کر بھیجیے گا‘‘۔ میں بات ختم کر کے وہاں سے چل پڑا اور سیٹھ رحمان ہکا بکا سا وہیں کھڑا رہ گیا۔ مُڑتے وقت میں نے لبنیٰ کی آنکھوں کی نمی، اپنی آنکھوں میں اُترتی محسوس کی تھی اور پھر ساری رات اس نمی نے میری پلکیں بھگوئے رکھیں۔ بظاہر باہر سے اُجلی اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چمک لیے یہ دنیا اندر سے کبھی کبھی کتنی تاریک اور سیاہ نکلتی ہے۔

اگلے روز سیٹھ رحمان کا مینیجر اپنے وقت پر آن پہنچا۔ واقعی سیٹھ رحمان ایک کام یاب سوداگر تھا۔ مگر نہ جانے کیوں پھر بھی اس کی لگائی ہوئی قیمت مجھے بہت کم محسوس ہوئی۔ لوگ عموماً جسموں کے سودے کرتے وقت ان کے اندر بسی روح کی قیمت لگانا بھول جاتے ہیں۔ کمالی پچھلے دو چار دن سے مجھ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتا تھا، مگر اس روز سیٹھ رحمان کے مینیجر کے جانے کے بعد اپنی چپ پر قابو نہیں رکھ پایا ’’اگر آپ بُرا نہ مانیں سَر! تو میں ایک بات کہنے کی جسارت کرنا چاہتا ہوں، عہدے اور رُتبے میں آپ مجھ سے بہت بلند ہیں، مگر عُمر میں، مَیں آپ سے بڑا ہوں۔ لہٰذا مجھے میرے تجربے کی رعایت دیتے ہوئے کچھ عرض کرنے دیں‘‘۔ میں نے اطمینان سے اس کی یہ لمبی تمہید سُنی۔ ’’جتنی دیر میں تم نے یہ تمہید باندھی ہے، تم اپنی بات ختم بھی کر سکتے تھے‘‘۔ کمالی میری بات سُن کر سٹ پٹا سا گیا۔ ’’جی سَر... میں بس اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نے سیٹھ رحمان کی بہت زیادہ قیمت لگا دی۔ میں جانتا ہوں، یہ آپ کا ذاتی پیسا ہے، اور اُسے خرچ کرنے کا حق بھی صرف آپ ہی کو ہے، مگر آپ کو ابھی سودے بازی نہیں آتی۔ میں جب آپ کو یوں بے دریغ دوسروں پر پیسا لٹاتے دیکھتا ہوں، تو نہ جانے کیوں بہت دُکھ ہوتا ہے۔ عُمریں لگ جاتی ہیں، یہ پیسا کمانے میں۔ اس طرح تو آپ خود کو بہت جلد برباد کر دیں گے۔ اگر جذبات میں مجھ سے کوئی گستاخی ہوئی ہے، تو مَیں معافی چاہتا ہوں، مگر میں نے آپ کو خبردار کرنا اپنا فرض سمجھا‘‘۔ کمالی بات ختم کر کے چپ ہوگیا۔ ’’تم نے ٹھیک کہا کمالی! مجھے سودے بازی نہیں آتی، اچھا سوداگر نہیں ہوں میں۔ انسانوں کی قیمت لگانا نہیں جانتا، کیوں کہ میں سمجھتا تھا کہ قیمت صرف چیزوں

کی لگائی جاتی ہے، انسان اور رشتوں کی نہیں۔ اچھا میرے ایک سوال کا جواب دو، عام طور پر انسان، پیسا کس لیے کماتا ہے؟'' کمالی نے بلا تامل جواب دیا ''اپنے خواب پورے کرنے کے لیے سر! اپنے لیے آسائشیں اور آسانیاں پیدا کرنے کے لیے، اور اپنے لیے خوشیاں خریدنے کے لیے، عزت اور رُتبے کے لیے'' ''ٹھیک کہا تم نے، مگر جب کسی کا کوئی خواب ہی باقی نہ بچا ہو، آسائشیں اسے بوجھ لگتی ہوں اور اس کی خوشی کسی ایک لمحے میں جامد ہو کر رہ گئی ہو، تب وہ شخص کیا کرے؟'' کمالی کچھ دیر خاموش رہا۔ ''پھر شاید وہ شخص اس دنیا کا ہی نہ ہو سر! کیوں کہ آسائشیں، رُتبے اور خوشی سے بھلا کون انکار کرسکتا ہے۔'' میں مُسکرایا۔ ''ہاں! کوئی دیوانہ ہی ہوگا، جسے ان چیزوں سے انکار ہو، مگر ابھی کچھ باقی ہیں دنیا میں۔ تمہیں سوداگر بننے میں ابھی کچھ وقت لگے کمالی۔ خیر چھوڑو، تم نہیں سمجھو گے، اور کمالی، تم نے بھی تو سیٹھ رحمان کے ساتھ ایک سودا کیا تھا۔ تمہارا سودا کیسا رہا...؟'' کمالی نے گڑبڑا کر میری طرف دیکھا۔ ''میں سمجھا نہیں، کیسا سودا...؟'' ''ہاں، وہی سودا، جو کنٹریکٹ سیٹھ رحمان کو دلوانے کی صورت میں تمہیں پانچ لاکھ روپے منافع ملنے کے بدلے طے ہوا تھا۔'' کمالی کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ ''وہ سر... وہ... میرا مطلب ہے...'' میں نے غور سے کمالی کی طرف دیکھا۔ ''گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے کمالی! میں نے ویسے بھی وہ ٹھیکہ سیٹھ رحمان ہی کو دینا تھا۔ بس میری اتنی بات یاد رکھنا، پیسا کبھی عزتِ نفس کا نعم البدل نہیں ہوسکتا۔ وقت ملے تو میری بات پر غور کرنا۔ اب تم جاسکتے ہو۔'' کمالی سر جھکائے میرے کمرے سے نکل گیا۔

اگلے دو ہفتے بہت مصروف گزرے، اس دوران میں اپنے بھائیوں کے نئے گھر بھی ہو آیا، بہنوں کی طرف بھی چکر لگالیا، خوب آؤ بھگت ہوئی میری، مگر ان میں سے کوئی بھی، یہ بات ذہنی طور پر تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا کہ میں یوں تنہا اتنے بڑے گھر میں پوری زندگی گزار دوں۔ سبھی کو میرا گھر بسانے کی جلدی تھی، مگر ان میں سے شاید یہ بات کوئی نہیں جانتا تھا کہ جب دل ہی جل جائیں، تو گھر نہیں بسا کرتے۔ میرا دل بھی جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ اب کوئی اُمید، کوئی آس باقی نہیں رہ گئی تھی کہ کبھی کوئی نظر میری طرف بھی اُٹھے گی۔ بظاہر میرے ارد گرد ایسی بہت سی نازنینائیں تھیں، جن میں سے مَیں، کسی ایک کی جانب بھی اشارہ کر دیتا، تو اس کے گھر والے بہ صد خوشی اسے میرے ساتھ رخصت کر دیتے، مگر یہ میرا نہیں، میری ظاہری شان و شوکت اور اس دولت کا کمال ہوتا، جسے ابھی تک خود میرے گھر والے بھی مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے اور چہ مگوئیاں ہوتی رہتی تھیں کہ آخر دس سال کے اندر اندر میرے ہاتھ الہ دین کا ایسا کون سا چراغ لگا ہوگا کہ جس نے میری کایا ہی پلٹ دی، ہمارا معاشرہ بھی کتنا دوغلا ہے۔ جس شخص کی غیر موجودگی میں اس کے رتبے اور دولت پر ناجائز ہونے کے شک میں ہزار باتیں بناتا ہے۔ اُسی شخص کے آنے پر اس کو پوری تعظیم کے ساتھ کھڑے ہو کر ملتا ہے۔ اُس سے ہزار سفارشیں کرواتا ہے اور ساتھ کھڑے ہو کر تصویریں بنانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ بہروز کریم ٹھیک ہی کہتا تھا، دولت ہزار عیبوں کا ایک پردہ ہے۔

کچھ روز بعد احمد صاحب چند طلبہ کے ساتھ میرے دفتر آئے اور بہت دیر بیٹھے رہے۔ وہ اپنے ساتھ اس سال کا یونی ورسٹی کا سالانہ رسالہ بھی لائے تھے، جس میں میری تین پُرانی نظمیں چَھپی تھیں۔ میں نے ان کے لاکھ انکار کے باوجود یونی ورسٹی کی بزمِ ادب کے لیے سال بھر کا چندہ ان کے حوالے کر دیا۔ ویسے بھی میری کمپنی سے شہر کی تقریباً ہر بڑی ادبی تحریک اور تنظیم کو عطیات جاتے رہتے تھے۔ شہر میں، مَیں کافی ادب دوست مشہور ہو چکا تھا، مگر میں خود ان ادبی پروگرامز میں جانے سے گریز کرتا تھا، کیوں کہ اب میں شاید، اپنے لفظوں اور شخصیت کے اس واضح تضاد سے اکتا چکا تھا۔ یا پھر اچھے لفظ اور اچھے خیالات صرف اچھی شخصیت کے ساتھ ہی جچتے ہیں۔ مجھ جیسا کوئی کتنے ہی اونچے خیالات کو لفظوں کی خوب صورت مالا میں پرو کر پیش کر دے، حرف بے وقعت ہی رہتے ہیں۔ میں خود کو مزید کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اگلے دن بڑے بھیا کسی کی سفارش کے لیے دفتر آئے، تو میں ان سے اپنے پرانے رجسٹر اور مسودوں کے بارے میں پوچھ بیٹھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ ابھی وہیں پرانے گھر کی دو چھتی والے ٹرنک ہی میں پڑے ہوں شاید، کیوں کہ بہت سا سامان نئے مکان میں منتقل ہونا باقی تھا۔ پُرانے گھر کا سودا ہو چکا تھا اور کچھ دن میں وہاں سے سارا سامان بھی اٹھوانا تھا۔ جانے میرے دل میں اچانک ہی میرے پرانے گھر اور محلے کے لیے ایک دم ہی ہوک سی کیوں اٹھی۔ میں نے کاغذات تلاش کرنے کے بہانے بھیا کے ساتھ ڈرائیور کو بھیج کر پُرانے گھر کی چابی منگوالی اور اُسی شام عصر کے وقت میری گاڑی میرے پرانے محلے کے سال خوردہ لکڑی والے بڑے گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ میں نے گاڑی محلے کے بڑے میدان سے پَرے ہی رُکوالی۔ سامنے کچھ بچے کنچے کھیل رہے تھے۔ میں بہت دیر وہیں کھڑا، انہیں یہ کھیل کھیلتے دیکھتا رہا۔ غریب محلے کے بچّوں کے کھیل بھی سدا غریبانہ ہی رہتے ہیں۔ کبھی میں بھی اپنی گلیوں اور اسی میدان میں باقی بچّوں کے ساتھ سارا دن کنچے اور گلّی ڈنڈے کا کھیل کھیلا کرتا تھا اور شام کو چُھپن چُھپائی، مگر زندگی میرے ساتھ ابھی تک چُھپن چُھپائی ہی کا کھیل کھیلتی آ رہی تھی۔ محلے کے پرانے مکینوں میں کوئی دکھائی نہیں دیا۔ زیادہ تر نئے چہرے نظر آ رہے تھے۔ غربت البتہ وہی پُرانی تھی۔ میں نے کبیر خان کو اپنے گھر کا دروازہ کھولنے کو کہا اور پھر اسے گاڑی کی جانب واپس بھیج دیا، کیوں کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میری آنکھوں میں اُترتی نمی دیکھ سکے۔ ہمارے کچھ جذبات اور احساسات بہت ذاتی ہوتے ہیں۔ ہم انہیں کسی کے ساتھ بانٹ نہیں سکتے۔ میں بہت دیر تک اپنے گھر کے چھوٹے سے صحن میں کھڑا اُن بیتے دنوں کو یاد کرتا رہا، جب میں دنیا کے ہر غم سے آزاد، اپنے چھوٹے قدموں سے اس صحن میں دوڑتا پھرتا تھا، باورچی خانے سے

اماں کی باجیوں کو ڈانٹنے اور سگھڑاپے کے گر سکھانے کی آوازیں آتی رہتیں۔ ابا صحن میں اپنا حقہ سنبھالے کھانستے اور اخبار پڑھتے رہتے۔ میں مٹی کے صحن میں اپنی پرانی ٹین کی بنی کھلونا موٹر کار کے لیے راستے بناتا رہتا اور دن میں سو سو مرتبہ اس زنگ لگی کار کو اماں کے دوپٹے سے چمکاتا رہتا، ایک لمحے ہی میں میرے آس پاس یہ سب کچھ اس شدت سے میری یاد کے جھروکوں سے باہر چھلکا کہ وہ سب لمحے پھر سے زندہ ہوگئے۔ حتیٰ کہ میں اس وقت ابا کے حقے کا کڑوا دھواں اور باورچی خانے سے آتی گرم پُھلکوں کی مہک بھی محسوس کرسکتا تھا۔ کاش مَیں ساری زندگی وہی پانچ چھے سالہ پَری زاد ہی رہتا، کبھی بڑا نہ ہوتا۔ جانے ہم اتنی جلدی بڑے کیوں ہو جاتے ہیں؟ ہر بچہ اپنی ماں کے لیے پَری زاد ہی تو ہوتا ہے، تو اگر میری بھولی بھالی ماں نے مجھ جیسے کا نام بھی پَری زاد رکھ دیا، تو ایسا کیا گناہ کیا۔ میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ اچانک مجھے اپنے کانوں میں ابا کی آواز بھی گونجتی محسوس ہوئی۔ ''پَری زاد... بیٹا... تم پَری زاد ہی ہوناں'' میں ایک جھٹکے سے اپنے خیالات کی دنیا سے واپس لوٹ آیا۔ کوئی مجھے واقعی پکار رہا تھا۔ جسے مَیں ابا کی آواز سمجھا تھا، وہ ہمارے محلے کے ایک بزرگ بشیر چچا کی آواز تھی، میں نے جلدی سے اپنی آنکھیں پونچھ کر پلٹ کر دیکھا۔ گھر کا دروازہ کُھلا دیکھ کر گلی سے گزرتے کچھ پرانے محلے دار گلی میں جمع ہو چکے تھے۔ یہ سب وہ لوگ تھے، جن کے ہاتھوں میں میرا بچپن کھیلا تھا۔ سبھی گھل مل گئے اور پُرانی یادوں کے سب دریچے وا ہوگئے۔ وہ سب ابا کے دوست اور ساتھی تھے اور پُرانی باتیں یاد کر کے سبھی بیک وقت خوش اور غم گین سے ہوگئے تھے۔ گویا یادِ ماضی صرف میرے لیے ہی عذاب نہیں تھی، اور بھی بہت تھے، جو اس عذاب سے دوچار تھے۔ وہ سب میری ترقی دیکھ کر حیران اور دل سے خوش نظر آ رہے تھے۔ یہ پرانے محلے دار بھی

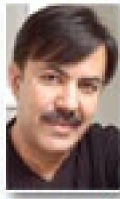
بڑے دل چسپ رشتے میں بندھے ہوتے ہیں۔ جب تک ساتھ رہتے ہیں، زیادہ تر ایک دوسرے سے خفا اور لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں، مگر انہی میں سے جب کوئی ایک بچھڑ کر کہیں اور چلا جاتا ہے اور عرصے بعد ملتا ہے، تو یہ سارے خون کے رشتوں سے بھی بڑھ کر اُسے یاد کرتے ہوئے یوں استقبال کرتے ہیں، جیسے وہ ہم سایہ نہیں، کوئی ماں جایا ہو۔ یہ انسانی رشتے ہمیشہ دور جا کر ہی خُوب صورت کیوں بن جاتے ہیں؟ فاصلے ہمارے رویوں میں اتنی بڑی تبدیلیاں کیسے لے آتے ہیں۔ یہ کیا گورکھ دھندا ہے؟ نکڑ والے منظور چچا کو اچانک کچھ یاد آ گیا۔ ''ارے ہاں پَری زاد بیٹا! وہ مرزا صاحب کا پوچھنے ضرور جانا۔ بہت بیمار رہتے ہیں آج کل، ضعیف بھی بہت ہو گئے ہیں۔ مرزا صاحب کا نام سنتے ہی میرا گال اچانک جلنے لگا۔ ان کا لگایا ہوا طمانچا آج تک میرے ذہن کے کسی نہاں خانے میں گونج رہا تھا اور تب ہی اچانک ہی وہ؟! فتِ جاں، ناہید یاد آ گئی۔ اس کا تو ماجد سے رشتہ ہو گیا تھا۔ جانے اب وہ کیسی ہو گی؟

محلے کے بچّے میری گاڑی کے گرد جمع تھے اور ڈرائیور انہیں بھگانے کے لیے مختلف طریقے آزما رہا تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ مرزا صاحب کے دروازے کے سامنے رُک گیا۔ پھر مجھے خود ہی اپنی حالت پر ہنسی آ گئی۔ اب تو وہ کب کی اپنے گھر کی ہو چکی ہے اور میں ہوں کہ آج بھی اس کے گھر کے سامنے کھڑا اپنے بے چین دل کو سنبھالنے کی ناکام کوشش میں مصروف ہوں۔ سب اس دشمن دل کے تماشے ہیں۔ میری دوسری دستک کے جواب میں اندر سے کسی کے قدموں کی آہٹ بلند ہوئی۔ میں ایک جانب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ آنے والی نے دروازہ کھولا، تو اس کی نظر مجھ سے پہلے دُور کھڑی میری کار پر پڑی، اور پھر میری نظر، اس کی نظر سے ملی تو جیسے سانس رکنے لگی۔ وہ ناہید ہی تھی۔ ناہید بھی گڑبڑا سی گئی۔ میں نے اسے سلام کیا تو وہ اٹکتے ہوئے بولی۔ ''آپ...! آپ پَری زاد ہیں ناں۔ مجھے ہم سائیوں نے بتایا تھا کہ آپ محلے میں آئے ہوئے ہیں، مگر میں بالکل بھی یہ توقع نہیں کر رہی تھی کہ آپ ہمارے گھر بھی آئیں گے۔'' ناہید کے بال اُلجھے، کپڑے مسلے ہوئے اور پیروں میں پُرانی چپّل تھی۔ اس کا جسم پہلے سے کافی فربہ لگ رہا تھا اور وہ طرح دار، شوخ، نازک اور نٹ کھٹ سی لڑکی، مجھے اس سامنے کھڑی عورت میں بہ مشکل ڈھونڈے سے جھٹے بخروں میں بٹی نظر آ رہی تھی۔ ناہید نے سٹ پٹا کر مجھے اندر آنے کی دعوت دی۔ ''آپ باہر کیوں کھڑے ہیں، اندر آ جائیں۔ ابا گھر پر ہی ہیں۔'' میں جھجکتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ یہ وہی صحن تھا، جہاں میں کبھی شام کو گھنٹہ بھر کے لیے ناہید کو ٹیوشن پڑھانے انگور کی بیل کے سائے میں کرسی ڈالے بیٹھا رہتا تھا اور دن کے باقی تئیس گھنٹے، اُسی ایک گھنٹے کی یاد میں گزار دیتا تھا۔ صحن میں چار پانچ چھوٹے چھوٹے بچّے شور اور اودھم مچا رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے گھڑے پر رکھا پیتل کا گلاس زور سے پکے فرش پر گرا دیا، تو شور مچ گیا۔ ناہید نے غصّے میں اس بچّے کو دو ہتڑ مارے اور شرمندگی سے چلائی۔ ''چپ کر جاؤ کم بختو! دیکھ نہیں رہے، گھر میں مہمان آئے ہیں۔ چلو، نکلو یہاں سے۔ باہر جا کر کھیلو''۔ بچّے منہ بسورتے صحن سے نکل گئے۔ اندر سے مرزا صاحب کھانستے ہوئے باہر صحن میں نکل آئے۔ ''کون آیا ہے، ناہید بیٹا...'' ناہید نے جلدی سے صحن میں

پڑی پُرانی کرسی میرے لیے سیدھی کی''پَری زاد؟ یہ ہیں ابا جی، ہمارے پرانے ہم سائے''۔ مرزا صاحب نے چونک کر اپنا چشمہ درست کیا اور مجھے غور سے دیکھا۔ ''ارے پَری زاد بیٹا! کیسے ہو تم، تمہارے بھائیوں سے پتا چلا تھا کہ تم پاکستان آ چکے ہو۔ اچھا کیا آ گئے، تمہیں دیکھے بہت عرصہ ہو گیا۔'' مرزا صاحب اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ ناہید میری موجودگی کی وجہ سے بہت اُلجھی ہوئی اور بے آرام سی دکھائی رہی تھی۔ پھر اچانک مرزا صاحب کے چہرے پر شرمندگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ ''ارے ہاں، یاد آیا۔ میں نے کبھی تمہارے ساتھ بڑی زیادتی کر دی تھی میاں۔ بعد میں حقیقت کھلی تو تم یہاں سے جا چکے تھے۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔'' میں نے جلدی سے کہا ''یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ بزرگوں کا حق ہوتا ہے۔ مگر یہ ماجد کہاں ہے، دکھائی نہیں دے رہا''۔ مرزا صاحب نے بُرا سا منہ بنایا ''ارے ہوگا کہاں... کہیں نوکری کی تلاش میں دربدر بھٹک رہا ہوگا۔ ناہید کی ماں کے انتقال کے بعد اسے تو موقع ہی مل گیا۔ مہینوں اپنے بیوی بچّوں کو یہاں میکے میں میری خدمت کے بہانے چھوڑ کر جانے کہاں غائب رہتا ہے۔ بہت سے کاروبار آزمائے اس نے، مگر کچھ جمانہیں۔ آج کل نوکری کے لیے دھکے کھاتا رہتا ہے۔'' ناہید چائے کا کپ لیے نمودار ہوئی اور اس نے باپ کو گھور کر دیکھا۔ ''بس کریں ابا جی، یہ وقت بھلا ان باتوں کا ہے؟'' مَیں کن اکھیوں سے ناہید کو دیکھتا رہا۔ یہ نازک شاخِ گل جیسی لڑکیاں شادی کے بعد اتنی جلدی اپنا رُوپ کیوں بدل لیتی ہیں، یا پھر شاید، ماجد جو اس کا محبوب تھا اور بطور شوہر اس کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا، اس کے لیے ناہید اب بھی اُتنی ہی دل کش اور خوب صورت ہو۔ کہتے ہیں حُسن جب ہمارے روزمرہ کے معمول میں شامل ہو جائے، تو عموماً اپنا اثر کھو دیتا ہے، یا پھر سدا کے لیے اپنے پہلے تاثر کے ساتھ ہماری یادداشت میں جامد ہو کر رہ جاتا ہے۔ میں نے پورے دس سال کے بعد ناہید کو دیکھا تھا، اس لیے شاید مَیں اس کے بڑھتے ہوئے وزن سے کچھ اُلجھن محسوس کر رہا تھا، لیکن کیا محبوب کے روپ بدل لینے سے ہماری محبت کا نظریہ بھی بدل جاتا ہے؟ یا پھر حسن پرستوں کا شیوہ ہی میر کی غزل اور خیام کی رباعی کو کسی سراپے میں ڈھلتے ہوئے دیکھنا ہوتا ہے۔ میں انہی خیالوں میں مگن چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہا تھا۔ ناہید سر جھکائے میرے قریب ہی کھڑی تھی، اتنے میں اچانک صحن کا دروازہ کھلا اور گرد اور دھول میں اٹا ایک تھکا ہارا سا شخص اندر داخل ہوا۔ ہم دونوں کی نظر ملی۔ ناہید کو میرے قریب کھڑے دیکھ کر اس شخص کے ماتھے پر تیوریاں سی پڑ گئیں۔ ناہید بھی کچھ گھبرا سی گئی اور جلدی سے اس کی جانب بڑھی ''ارے ماجد... تم آ ے... دیکھو، پَری زاد صاحب ہمارے گھر آئے ہیں۔ پہچانا نہیں تم نے انہیں۔'' ماجد نے کڑی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم.......



ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، مُلک کے معروف ومنفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز’’ خدا اور محبت‘‘ اور’’ بچپن کا دسمبر‘‘ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول’’ عبداللہ‘‘ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں’’ عبداللہ‘‘ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

’’ پری زاد‘‘ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر،’’ سنڈے میگزین‘‘ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

ماجد شدید غصّے کے عالم میں ناہید کو گھور رہا تھا۔ ناہید نے جلدی سے اسے سرگوشی میں کچھ کہا، تو اس بار ماجد میری طرف متوجّہ ہوا اور پھر اُس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔’’ ارے پَری زاد تم...... میرا مطلب ہے آپ پَری زاد ہی ہوناں...... معاف کرنا، میں تھکن کی وجہ سے پہچان نہیں سکا‘‘۔ شاید ماجد بھی میرے قیمتی اعلیٰ لباس اور باہر کھڑی نئی گاڑی سے مرعوب ہو کر فوراً تم سے آپ پر آگیا تھا۔ انسان نے مرعوبیت کے لیے کتنی ناپائیدار اشیاء کو پیمانہ بنا رکھا ہے۔ میں نے گہری نظروں سے ماجد کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر وقت کی دھول شاید کچھ زیادہ ہی تیزی سے جم رہی تھی۔ بہت تھکا ماندہ سا نظر آرہا تھا۔ کبھی یہی ماجد ہم سب محلّے کے لڑکوں کے لیے رشک کا باعث ہوا کرتا تھا اور میں تو خود کو اس پر رشک کے قابل بھی نہیں سمجھتا تھا۔ وہ اس ہستی کا محبوب تھا، جس کی پلک کا ایک اشارہ مجھے عُمر بھر کے لیے خاکستر کر گیا...... اور آج اتنے برسوں بعد وہ شعلہ جوالہ، میرے سامنے راکھ بنی کھڑی تھی اور اس کا وہ گل فام، غمِ دوراں کے پھیرے میں سب کچھ بھولا دکھائی دیتا تھا۔ کون خوش ہے بھلا اس ناشناس زمانے میں؟ جنہوں نے پایا، انہوں نے پا کر مٹی کر دیا اور جو پا نہیں سکے، وہ بھی ہمیشہ کے لیے خاک ہوئے، مجھ سے زیادہ دیر وہاں ٹھہرا نہیں گیا۔ میں نے آتے وقت اپنا کارڈ ماجد کو دے دیا کہ وہ اگلے روز میرے ایک فیکٹری منیجر سے مل لے۔ میں اپنی گاڑی میں جب گلی سے باہر نکل رہا تھا، تب میں نے بیک ویو مرر میں ناہید کو اپنے گھر کے دروازے میں کھڑا دیکھا۔ شاید وہ مجھ سے جاتے وقت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر، مَیں کیا بات کرتا اس سے؟ وہی معذرتیں، وہی’’ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا‘‘،’’ میں آپ کا دل نہیں دُکھانا چاہتی تھی‘‘’’ آپ دل کے بہت اچھے ہیں......‘‘ وغیرہ وغیرہ، کتنا مصنوعی لگتا ہے یہ سب کچھ۔ کچھ معذرتیں اور وضاحتیں تو پُرانے گھاؤ مندمل کرنے کے بجائے زخموں کا سینہ مزید کھول دیتی ہیں۔ میں بھی اپنے یہ کُھلے زخم لیے گھر واپس پہنچا، تو رات ڈھل رہی تھی۔ کمالی نہ جانے کب سے سوئمنگ پُول کے پاس کچھ فائلز گود میں لیے بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے ضروری کاغذات پر دستخط کر کے فائلز اُسے واپس کیں’’ صبح لے آتے کمالی، زندگی کو اتنا بوجھل کیوں کر رکھا ہے تم نے، جب تک میرے ساتھ کام کر رہے ہو، نفع نقصان ذہن سے نکال کر کام کیا کرو۔ میں نے تمہیں اُس دن بھی بتایا تھا کہ میرے نقصانات اور فوائد کا پیمانہ کچھ اور ہے۔ میں زندگی میں اتنی بار ہار چکا ہوں کہ اب جیت مجھے کسی بھی ہار سے کہیں زیادہ اُداس اور پریشان کر دیتی ہے، کل ٹینڈر بھر دینا، باقی اللہ مالک ہے۔ جاؤ، جا کر آرام کرو‘‘۔ کمالی سَر جُھکائے کھڑا رہا۔’’ مجھے آپ کو، کچھ اور بھی بتانا تھا سَر...... آج صبح میں نے سیٹھ رحمان کا دیا ہوا چیک واپس کر دیا ہے۔ آپ کے ایک جملے نے مجھے عزتِ نفس کا وہ سبق سکھایا ہے کہ اب کبھی میرے قدم نہیں ڈگمگائیں گے۔ آپ بھی میری اس خطا کو آخری سمجھ کر معاف کر دیں‘‘۔ مَیں نے اس کا کاندھا تھپتھپایا۔’’ بھول جاؤ کمالی، زندگی میں انسان کے پاس اور کچھ ہو نہ ہو، یہ بھول جانے کی نعمت ہونا بہت ضروری ہے‘‘۔ کمالی پلٹ کر جانے لگا، تو میں اچانک اس سے پوچھ بیٹھا۔’’ کمالی! تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے......؟‘‘ کمالی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ’’ہاں سَر! بڑا زوردار عشق چلا تھا نوجوانی میں اپنا، مگر انجام بہت بُرا ہوا آخرِ کار‘‘۔ میں نے گھبرا کے پوچھا’’ کیوں...... کیا ہوا تھا؟‘‘ کمالی نے لمبی سی سانس بھری۔’’ ہونا کیا تھا سَر جی، شادی ہوگئی میری اُس کے ساتھ، آج وہ میرے چار بچّوں کی ماں ہے۔ سارا عشق بھاپ بن کے اُڑ گیا، گھریلو روزمرّہ خرچوں، بچّوں کی فرمائشوں اور فیسوں نے کمر توڑ کے رکھ دی۔ ساری محبت ہوا ہوگئی‘‘۔ کمالی اپنے دُکھڑے سُنا کر چلا گیا اور میں بیٹھا سوچتا رہا کہ ہم نادان انسان ابھی تک یہ بھی طے نہیں کر پائے کہ محبت کو پالینا بڑا حادثہ ہے یا اس کا کھو جانا بڑا سانحہ؟ کیا شے ہے یہ محبت، ہم مبتلا ہوں یا غیر مبتلا، یہ محبت ہر پَل ہمارے آس پاس کن سوئیاں لیتی، ہماری سرگوشیاں سُنتی رہتی ہے تاکہ ہمارے خلاف پھر کوئی بھرپور سازش رَچا سکے۔ میری یہ حُسن پرستی بھی تو اُسی ستم گر کی ایک سازش تھی۔ لوگ باتیں بنانے لگے تھے کہ میرے آس پاس خُوب صُورت چہروں کا مجمع اکٹھا رہتا ہے۔ دفتر میں، باہر فیلڈ کے عملے میں، دبئی کے دفاتر اور کمپنیوں میں، ہر جگہ انتخاب اگر میرے فیصلے سے ہوتا، تو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کوئی حسین چہرہ ہی نکلتا، چاہے پھر میرا زندگی بھر اس چہرے سے کبھی آمنا سامنا ہی نہ ہو، مگر لوگوں کو یہ بات کیوں سمجھ نہیں آتی کہ جس طرح ہم میں سے کچھ صفائی پسند ہوتے ہیں، کچھ نفاست پسند، کچھ کو نازک اشیاء پسند آتی ہیں اور کچھ خوشبوؤں کے رسیا ہوتے ہیں۔ اسی طرح میں حُسن پسند تھا اور بس......

اگلے روز مجھے سائٹ ایریا والی فیکٹری کے منیجر نے بتایا کہ ماجد کو اس کی قابلیت کے اعتبار سے کسی دفتر میں کام پر لگا دیا گیا ہے اور تن خواہ بھی معقول طے ہوگئی ہے۔ رات ایک میٹنگ سے گھر آتے آتے بہت دیر ہوگئی۔ سڑکیں سنسان ہو چکی تھیں۔ رات کو جانے پہچانے رستے بھی کسی اجنبی کی طرح ہمارا استقبال کرتے ہیں، لوگ سمجھتے ہیں، دن پوشیدہ گوشوں کو اپنی روشنی سے اُجال کر اُن کی شناخت ظاہر کرتا ہے، مگر نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا تھا، جیسے لوگوں، جگہوں، چیزوں اور چہروں کی اصل پہچان رات کے اندھیرے ہی میں ہوتی ہے۔ ڈرائیور نے میری بوریت کے خیال سے گاڑی کا ایف ایم ریڈیو چلا دیا۔ یہ ایف ایم ریڈیو بھی ایک اچھا فرار ہے، لمبے راستوں کو مختصر کرنے کا۔ ایف ایم کا ڈی جے یا کمپیئر اگر پڑھا لکھا اور زندگی سے شناسا ہو تو ہماری تنہائی بانٹ لیتا ہے، اُس روز بھی وہ میزبان میری تنہائی بانٹنے کے لیے شعر و ادب کی باتیں کر رہی تھی۔ میں بے دھیانی میں بیٹھا اس کی میٹھی باتیں سُن رہا تھا کہ اچانک اپنی نظم کے دو بول سُن کر زور سے چونک اٹھا، میزبان کی آواز سنّاٹے میں گونج رہی تھی۔’’ جی ہاں، یہی ہے میری پسندیدہ نظم کا عنوان’’ گر کبھی تم کو مجھ سے نفرت ہو جائے...... تو ان راستوں سے نفرت مت کرنا...... جن پر کبھی ہم ایک ساتھ چلے تھے......‘‘ اُس رات کے اندھیرے میں، خود اپنی نظم اس ایف ایم کی میزبان کی زبانی سُن کر جانے کیوں میری پلکیں نم ہونے لگیں۔ میزبان کہہ رہی تھی۔’’ جی سامعین! یہ تھی میرے پسندیدہ شاعر، پَری زاد کی وہ نظم، جو میں اکثر گنگناتی ہوں، مگر مجھے اُن سے ایک گلہ بھی ہے۔ میں اُسی یونی ورسٹی کی ایک جونیئر طالبہ ہوں، جہاں پَری زاد نے دورانِ تعلیم کچھ نظمیں، غزلیں کہیں، مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ انہوں نے شاعری سے کنارہ کشی اختیار کر لی، اگر خوش قسمتی سے وہ یا ان کا کوئی جاننے والا اس وقت میرا پروگرام سُن رہے ہوں، تو ان سے میری اور اس پروگرام کے ہزاروں سامعین کی بس یہی ایک چھوٹی سی خواہش ہے کہ وہ لفظوں سے اپنا ناتا نہ توڑیں۔ اب آپ سے آپ کی میزبان

قراۃ العین بخاری اجازت چاہتی ہے۔ کل پھر رات گیارہ بجے آپ کے پسندیدہ پروگرام "بزمِ ادب" کے ساتھ حاضر ہوں گے، تب تک کے لیے اپنا بہت سا خیال رکھیے، شب بخیر"۔ میں پروگرام سُننے میں اس قدر مگن تھا کہ پتا ہی نہیں چلا کہ ہم کب گھر پہنچ گئے۔ رات بھی بستر پر کروٹیں بدلتے، اَن گنت سوچوں میں گزری۔ مجھے اپنے ایک اردو کے استاد کی بات ہمیشہ یاد رہتی تھی کہ لفظ اپنے خالق کا ہمیشہ پیچھا کرتے ہیں۔ اُس کی پہچان بن کر ہمیشہ کے لیے وقت کی کسی لہر میں امر ہو جاتے ہیں۔ مگر میں نہیں جانتا تھا کہ میری ٹوٹی پھوٹی شاعری اور بے بسی کے عالم میں لکھی چند نظمیں میری یونی ورسٹی کے سالانہ رسالے میں چھپ کر یوں امر ہو جائیں گی کہ اتنے برسوں بعد بھی میری شناخت بنی رہیں گی۔

اگلے روز دفتر پہنچا تو یونی ورسٹی سے احمد صاحب پہلے ہی آئے بیٹھے تھے اور کافی خفا بھی تھے، کیوں کہ میں کسی نہ کسی بہانے ان کی تمام تقریبات کے دعوت نامے ٹالتا آیا تھا۔ مگر اس روز ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ مجھ سے کوئی وعدہ لے کر ہی اٹھیں گے اور پھر ایسا ہی ہوا۔ اگلی شام یونی ورسٹی کی بزمِ ادب کی سالانہ انعامات کی تقریب تھی اور وہ پہلے ہی زبردستی کارڈ پر میرا نام بھی مہمانِ خصوصی کے طور پر درج کروا کے آئے تھے۔ میں نہ نہ ہی کرتا رہ گیا، لیکن وہ دھمکی دے گئے کہ اگر اس بار بھی میں نے تقریب میں شرکت نہ کی، تو وہ آئندہ کبھی مجھ سے بات نہیں کریں گے۔ اب میں انہیں کیسے بتاتا کہ اتنے بہت سے لوگوں کے سامنے اسٹیج پر بیٹھنے اور ان کے سامنے کچھ بولنے کے خیال ہی سے میرے پسینے چھُوٹنے لگتے ہیں۔ وہی چبھتی نظریں، جو مجھے اپنے آر پار ہوتی محسوس ہوتی ہیں، وہی دبی دبی سرگوشیاں، طنزیہ مسکراہٹیں، کاش احمد صاحب میرے اس دلِ ناکارہ کی حالت سمجھ سکتے، مگر یہ ہو نہ سکا اور اگلے روز ٹھیک شام 5 بجے اسٹیج کے ڈائس پر میرا نام پکارا گیا، تو میں نظریں جُھکائے مائیک کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اچھی بات یہ تھی کہ ہال میں تماشائیوں کی جانب روشنی مدھم سی تھی، اسی لیے مجھے طلبہ کے چہرے صاف دکھائی نہیں دے رہے تھے اور ویسے بھی اسٹیج کا فاصلہ پہلی رو کی کرسیوں سے کافی زیادہ تھا، اپنی سانس درست کرنے میں مجھے چند لمحے مزید لگ گئے۔ میری آواز خود مجھے اجنبی سی لگی۔ طلبہ اور دیگر عملہ انہماک سے میری بات سُن رہا تھا۔ "میں کوئی شاعر، مقرر یا لیڈر نہیں ہوں......بس، کچھ مہربانوں کی محبت مجھے یہاں تک کھینچ لائی ہے اور میری اس درس گاہ کا مجھ پر جو حق ہے، وہ مجھے ہمیشہ اس چار دیواری سے جوڑے رکھتا ہے۔ میں احمد صاحب اور ان تمام اساتذہ کا شکر گزار ہوں، جنہوں نے سالانہ شمارے میں میرا تعارف اور چند پُرانی نظمیں شامل کر کے، میرے کچھ بوسیدہ اشعار کو زندہ رکھا۔ یہ اشعار دراصل اشعار نہیں، میرے دل کی نثر ہیں۔ میری اپنے آپ سے کی گئی کچھ باتیں ہیں، جو کبھی صفحات پر آ گئیں تو آپ لوگوں سے بانٹ لیں۔ آپ لوگ اسے شاعری سمجھتے ہیں تو یہ آپ کا حسنِ ظن اور ظرف ہے، ورنہ حقیقت تو یہی ہے کہ میں نے کبھی شاعری نہیں کی۔" میں اپنی بات ختم کر کے پلٹنے لگا تو دُور اک قطار میں بیٹھی، سیاہ چشمہ لگائے ایک تتلی سی لڑکی کھڑی ہوگئی اور ناظرین کے لیے رکھا ہوا مائیک ہاتھ میں لے کر بولی۔ "سَر! میرا نام قراۃ العین ہے۔ میں اسی یونی ورسٹی میں فائنل ایئر کی طالبہ ہوں اور رات گئے ایف ایم ریڈیو پر "بزمِ ادب" کے نام سے ایک پروگرام بھی کرتی ہوں۔ میرے سُننے والوں کی ایک بڑی تعداد تک آپ کی شاعری میرے پروگرام کے توسط سے پہنچی ہے اور وہ سب آپ سے مزید کچھ نیا سُننے کی خواہش رکھتے ہیں، مگر آپ نے یونی ورسٹی کے بعد تازہ کچھ کہا ہی نہیں۔ کیا ہم امید رکھیں کہ آپ پھر سے اپنا ناتا حروف سے جوڑنے کی کوشش کریں گے؟" میں نے مختصر جواب دیا۔ "جی ضرور......اگر غمِ دوراں نے کچھ مہلت دی تو......"

ابھی اک رات قبل ہی میں نے اس لڑکی کا پروگرام سُنا تھا اور آج اس سے ملاقات بھی ہوگئی۔ کبھی کبھی وقت کی چالیں بھی کتنی تُلی تُلی ہوتی ہیں۔ تقدیر اپنا اسکرپٹ کیسے دھیمے انداز میں لکھنا شروع کرتی ہے، ہم معصوم انسانوں کو قطعاً خبر نہیں ہوتی کہ مقدر کا یہ مسوّدہ آگے چل کر ہم پر کیسی قیامتیں ڈھانے والا ہے۔ میں بھی آنے والے محشر سے بے خبر تقریب کے خاتمے کے بعد گھر روانہ ہوا تو کمالی سے رہا نہیں گیا۔ "سَر! آپ نے کبھی بتایا نہیں، آپ تو بہت مشہور شاعر ہیں۔ ساری یونی ورسٹی آپ کے لیے ہال میں جمع تھی"۔ میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ "یہ خود میرے لیے بھی ایک خبر ہے، اتنے برسوں بعد بھی میرے حرف میری شناخت ہیں۔ مجھے خود بھی حیرت ہے"۔ "اس میں حیرت کی کیا بات ہے سَر جی......یہ آج کل کی نوجوان نسل ان چیزوں میں بڑی دل چسپی رکھتی ہے۔ ایف ایم، انٹرنیٹ اور حتیٰ کہ سیل فون پر بھی ہر دَم ان چیزوں کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ یہ میر، درد، غالب اور اقبال کو بھی ہم سے زیادہ جانتے اور سمجھتے ہیں سَر۔ بظاہر بڑی لااُبالی ہے یہ نئی نسل، مگر اپنے مطلب کی چیز پڑھتی اور سُنتی ہے۔ چاہے کتاب کے ذریعے یا کسی اور طرح......" میں چُپ رہا۔ "ارے ہاں یاد آیا، وہ ایف ایم کی ڈی جے لڑکی نے آپ کا سیل نمبر مانگا تھا، رات کو اپنے پروگرام میں آپ کو براہِ راست شرکت کی دعوت دینا چاہتی تھی، میں نے آپ سے پوچھے بنا اسے نمبر تو دے دیا ہے، مگر خاص تاکید کی ہے کہ پہلے آپ سے خود بات کر کے اجازت طلب کرلے......" اور پھر رات گئے میرے موبائل فون پر ایک اجنبی نمبر جگمگانے لگا۔ تیسری کال پر مجبوراً مجھے فون اٹھانا پڑا۔ دوسری طرف وہی تھی۔ "معاف کیجیے گا سَر! شاید آپ کے مینیجر نے آپ کو میری درخواست نہیں پہنچائی۔ میں ڈی جے عینی ہوں۔ میں اپنے پروگرام میں آپ کو لائیو کال پر مدعو کرنا چاہتی ہوں......ہم آپ کے صرف دس منٹ لیں گے، اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو......؟" میں نے کچھ لمحے توقف کیا۔ "میرے پاس کہنے کے لیے کچھ خاص نہیں ہے، کیا پوچھنا چاہتی ہیں آپ......؟" وہ ممنونیت سے بولی۔ "کچھ عام سے سوال، آپ کی زندگی کے بارے میں، آپ کی کام یابیوں کے بارے میں، آپ کی ادب دوستی کے بارے میں۔ سُنا ہے، شہر کی سبھی بڑی ادبی تقریبات اور مستقبل کے منصوبوں میں آپ کا حصّہ ضرور ہوتا ہے۔ میں یہ سب کچھ اپنے سامعین تک پہنچانا چاہتی ہوں۔ آپ کی ترقی کا راز جاننا چاہتی ہوں، عام طور پر ادب سے جُڑے لوگوں کو یہ معاشرہ مادی ترقی سے بہت دُور سمجھتا ہے۔ یہ ادیب، شاعر عموماً مفلوک الحال دکھائی دیتے ہیں، مگر آپ نے صرف خیالی نہیں، حقیقی دنیا کو بھی فتح کر دکھایا ہے۔ میں یہ سب باتیں جاننا چاہتی ہوں۔" میں اس کی باتیں سُن کر اچنبھے میں پڑ گیا۔ "مگر آپ کو میرے بارے میں اتنا سب کچھ کیسے پتا ہے؟" وہ ہنس پڑی۔ جیسے بہت دُور کسی مندر میں ایک ساتھ بہت سی گھنٹیاں بج اٹھی ہوں۔ "احمد سَر نے بتایا، اور پھر میرے ریڈیو پروگرام کی وجہ سے شہر کی تقریباً سبھی بڑی ادبی

ہستیوں کے ساتھ ملاقات رہتی ہے میری۔ سبھی سے آپ کے بارے میں کچھ نہ کچھ سُننے کو ملتا ہے۔ سچ کہوں تو لوگ بہت متجسّس رہتے ہیں آپ کے بارے میں......" وہ اپنی دھن کی پکی لگتی تھی۔ میرے لاکھ ٹالنے کے باوجود، مجھ سے اپنے اگلے روز کے پروگرام کے لیے کچھ منٹ لینے میں کام یاب ہو ہی گئی اور میں اگلے دن تمام وقت اسی الجھن میں مبتلا رہا کہ رات، اس کے ساتھ کیا بات کروں گا؟ میں نے تو بہت زمانہ پہلے خود سے بات کرنا بھی چھوڑ دی تھی۔ شام تک یہ الجھن اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ میں نے اپنے پی اے کو عینی کا وہی فون نمبر ملانے کو کہا، جو گزشتہ رات میرے موبائل فون پر جگمگایا تھا۔ پی اے نے کال ملا کر میری طرف ٹرانسفر کی، تو دوسری جانب سے اس کی بے یقین اور کھلکھلاتی سی آواز سُنائی دی۔ "ارے سَر آپ......؟ کتنا حسین اتفاق ہے۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ آپ نے خود مجھے کال کی ہے، میں ابھی رات کے پروگرام کی تیاری ہی کر رہی تھی"۔ میں نے دھیرے سے کہا۔ "آپ سے ایک درخواست کرنی ہے، کیا ہم گزشتہ رات کیے ہوئے معاہدے کو کچھ دن کے لیے آگے بڑھا سکتے ہیں، اگر ممکن ہو تو؟" "جی سَر، کیوں نہیں......مگر کوئی خاص وجہ......؟" "پتا نہیں، وجہ شاید خاص ہے بھی اور نہیں بھی۔ دراصل میں بہت الجھن سی محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے اپنے بارے میں بات کرنا کبھی پسند نہیں رہا، آپ کچھ وقت دیں گی تو شاید میں خود کو تیار کر پاؤں، ورنہ میرے لیے بہت مشکل ہوگا"۔ دوسری جانب کچھ دیر کے لیے خاموشی چھائی رہی۔ "ٹھیک ہے

سَر! جیسے آپ کو مناسب لگے۔ مجھے آپ کی یہ بات بہت اچھی لگی کہ آپ نے پروگرام سے کافی دیر پہلے خود فون کر کے معذرت کر لی، ورنہ عام طور پر بڑے لوگ ہمیں اطلاع دینا بھی پسند نہیں کرتے، اپنی کسی غیر حاضری کی۔ مگر آپ کو یہ وعدہ تو بہرحال کرنا پڑے گا کہ آپ جب بھی خود کو ذہنی طور پر تیار کر پائے تو یہ معاہدہ پورا ضرور کریں گے"۔ میں ہنس پڑا۔ "ہاں، چلیں وعدہ نبھانے کا ایک اور وعدہ سہی۔ میری مشکل سمجھنے کا شکریہ"۔ میں نے فون کاٹ دیا، مگر کہیں دُور کوئی دوسری لائن جُڑ رہی تھی۔ میرا نادان دل سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی، ہر نتیجے سے بے خبر پھر سے دھڑکنا چاہتا تھا اور میں بڑی سختی اور بے رحمی سے اسے صرف ایک ہی بات ساری رات سمجھاتا رہا کہ کچھ دلوں کا مقدر صرف بہتّر کی گنتی پوری کرنا ہوتا ہے۔ وہ کچھ اور قلب ہوتے ہوں گے کہ جن کی تقدیر میں دھڑکنیں ہوتی ہیں۔ بڑے نادان ہیں وہ لوگ، جو اپنے دل کے ایک فرض کو دھڑکنے سے تشبیہ دیئے پھرتے ہیں۔ مگر یہ دل بھلا کب کسی کی سُنتے ہیں۔ منہ زور، آزاد، وحشی اور جنگلی گھوڑے بھلا کس لگام کے قابو آتے ہیں۔ میرا دل بھی بے لگام ہونے کو آیا تھا۔

اگلے روز نہ چاہتے ہوئے بھی میں سارا دن اس کے فون کا انتظار کرتا رہا اور پھر شام ڈھلے، جب تھک ہار کر میرا بے چین مَن اپنی بے وقوفی پر مُسکرا کر کچھ آرام پانے کو تھا، تبھی اچانک اس کا فون آ گیا۔ قسمت کی آنکھ مچولی، وقت کا انتخاب خوب چُن کر کرتی ہے اور پھر ان ٹیلی فون کالز کا دورانیہ اور تعداد بڑھتی گئی۔ ہم بہت عام سی باتیں کرتے تھے۔ دن بھر کی مصروفیت کی، شام کی چائے کی، رات کی چہل قدمی کی، مگر یہ باتیں میرے لیے کتنی خاص تھیں، یہ صرف میں ہی جانتا تھا۔ اُس دن یونی ورسٹی کی تقریب والی ملاقات کے بعد میری آج تک دوبارہ کبھی عینی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، نہ ہی میں نے دوبارہ کبھی اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار ہی کیا تھا۔ یہ ٹیلی فون کی آدھی ملاقات میرے لیے کسی بھی بالمشافہ ملاقات سے کہیں بڑھ کر تھی۔ میں دوبارہ عینی کے سامنے نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس نے ہال میں مجھے کافی فاصلے سے اور ملگجے اندھیرے میں دیکھا، میں اپنے اور اس کے درمیان یہ اندھیرا ہمیشہ حائل رکھنا چاہتا تھا۔ مجھے دن اور روشنی میں اس سے ملنے کی تمنا ہی بھلا کب تھی۔ میرا بس چلتا تو میں اللہ سے دعا کرتا کہ چوبیس گھنٹوں میں سے دن کے بارہ گھنٹوں کی روشنی بھی کشید کر لے، کیوں کہ مجھے اُجالے کبھی راس نہیں آتے تھے۔

اگلے روز میرے اسٹاف نے خُوب صُورت سجاوٹی کاغذ میں پیک شدہ ایک پارسل میری میز پر رکھ دیا۔ بھیجنے والے پتے میں قراۃ العین بخاری کا نام درج تھا۔ میں نے سب کے جانے کے بعد احتیاط سے کاغذ کی پرتیں کھولیں۔ اندر سے ایک خُوب صُورت سا نمائشی مجسمہ برآمد ہوا، جسے کمرے میں کہیں بھی شوپیس کے طور پر رکھا جا سکتا تھا۔ میں نے جلدی سے عینی کا نمبر ملایا۔ دوسری جانب سے اس کی کھنکتی ہوئی آواز ابھری۔ "میں جانتی تھی سر! آپ کا فون آتا ہی ہوگا۔ کہیے، کیسا لگا تحفہ؟" "بہت اچھا...... مگر موقع محل سمجھ نہیں سکا، میں اس تحفے کا۔ آپ نے تکلف کیا عینی......" وہ ہنسی۔ "ارے نہیں سَر! بالکل بھی تکلف نہیں ہے۔ یہ میرا مشغلہ ہے۔ فارغ وقت میں، مَیں مٹی اور پلاسٹر آف پیرس سے مجسمے بناتی ہوں۔ میری اپنی ایک چھوٹی سی آرٹ گیلری ہے، میرے گھر کے اندر، بس وہیں یہ مشق جاری رہتی ہے۔ کبھی آپ بھی آیئے ناں وقت نکال کر، میں آپ کو اپنا کام دکھاؤں گی۔" میں بولتے بولتے اٹک سا گیا۔ "ہاں کیوں نہیں، مگر آپ اور کیا کچھ کرتی ہیں، ایک ہی بار اپنے سارے ہُنر بتا دیں۔ کبھی کبھی حیرت در حیرت بھی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے دوستوں کے لیے......" میری بات سُن کر وہ شرما سی گئی۔ "نہیں نہیں، مجھ میں بھلا کیا ہُنر ہوگا۔ بس وقت کاٹنے کے بہانے تلاشتی ہوں"۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ مگر میرا بھولا مَن اس لڑکی کے ہُنر کا شکار ہوتا گیا۔ دل موہ لینا بھی تو ایک ہُنر ہے۔ شاید دنیا کا سب سے بڑا ہُنر۔ اور میں اس کی اس کاری گری سے خود کو بچا نہیں پا رہا تھا۔ مگر پھر ایک دن ہمیشہ کی طرح بجتی، بگڑنے لگی۔ شام ہی سے میری طبیعت عجیب بے چین اور اُداس سی تھی، مجھے ایک بار پھر اپنے آس پاس سب کچھ بنا مقصد اور بے فائدہ دکھائی دے رہا تھا۔ دل کو چُپ سی لگی ہوئی تھی کہ اچانک عینی کا فون آ گیا۔ "کہاں غائب رہتے ہیں سَر آپ، بہت دنوں سے آپ سے ایک بات کہنا چاہ رہی ہوں، مگر آپ کی مصروفیت کا خیال آڑے آ جاتا ہے"۔ میں نے گہری سانس لی۔ "میری مصروفیت بس ایک فرار ہے، آپ کہیں، کیا کہنا چاہتی ہیں؟" وہ کچھ دیر چُپ رہی۔ "دراصل میں آپ کا ایک مجسمہ بنانا چاہتی ہوں۔ پھر میں اُسے ساری دنیا کو دکھاؤں گی"۔ جانے کیوں پل بھر ہی میں، میرے اندر بہت کچھ ٹوٹ گیا۔ مجھے لگا کہ ساری دنیا کی طرح وہ لڑکی بھی آج میرا مذاق اُڑانے کے موڈ میں ہے۔ اس نے مجھے دُور سے ہی سہی، مگر دیکھ تو رکھا تھا۔ ضرور اس نے در پردہ میرے چہرے کی تضحیک کا یہ طریقہ نکالا ہے۔ میرا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہوگیا۔ "مجسمے خوب صورت چہروں کے بنائے جاتے ہیں مس عینی...... اور میں؟ بہرحال، مجھے آپ سے اس مذاق کی امید ہرگز نہیں تھی۔ آپ بھی دوسروں کی طرح ہی نکلیں۔" میں نے فون بند کر دیا۔ وہ ہیلو ہیلو کرتی رہ گئی، مگر میں نے اگلے پورے ہفتے اس سے بات نہیں کی۔ دفتر کے نمبر پر فون آیا بھی، تو اسٹاف سے کہہ دیا کہ مصروفیت کا بہانہ کر دے۔ اس نے کچھ خط بھی بھیجے، مگر میں نے پڑھے بنا ایک طرف رکھ دیئے اور پھر آٹھویں دن وہ خود میرے دفتر آ گئی۔ مَیں آفس میں داخل ہوا تو وہ پہلے سے میرے انتظار میں بیٹھی تھی۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی سیاہ چشمہ اس کے گورے چہرے پر پہرہ جمائے بیٹھا تھا۔ وہ بولی، تو اس کی آواز رندھی سی گئی، جیسے وہ بہت دیر روتی رہی ہو۔ "آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟" میں چلّا اٹھا۔ "آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟ میری صُورت کا مذاق ہی اڑانا تھا تو کوئی اور طریقہ اپنا لیتیں، مگر یہ مجسمہ......" وہ رو پڑی۔ "میں آپ کا مذاق اڑانے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی، بہت عزت کرتی ہوں میں آپ کی۔ آپ نہیں جانتے آپ میرے لیے کیا ہیں۔ میں نے تو بنا دیکھے ہی آپ کا ایک مجسمہ اپنے مَن میں بنا رکھا ہے۔" میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ "آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟" اس نے اپنی آنکھوں سے چشمہ اتارا۔ "میں دیکھ نہیں سکتی...... نابینا ہوں مَیں......" ایک زوردار جھماکا سا ہوا اور میرے اردگرد تمام کمرے میں اس کی بے نور آنکھوں کا اندھیرا پھیلتا چلا گیا۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ’’خدا اور محبت‘‘ اور ’’بچپن کا دسمبر‘‘ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ’’عبداللہ‘‘ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز فلم کے شعبے میں ’’عبداللہ‘‘ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

’’پری زاد‘‘ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ’’سنڈے میگزین‘‘ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

پیاس کہتی ہے، اب ریت نچوڑی جائے
اپنے حصّے میں سمندر نہیں آنے والا

میں سکتہ زدہ سا بیٹھا اسے دیکھتا رہا اور وہ روتی رہی۔ قسمت کے کھیل واقعی نرالے ہوتے ہیں۔ میرا بے وقوف دل مجھ سے آنکھ نہیں ملا پا رہا تھا۔ صدیوں بعد جس ایک نظر پراُسے اپنے ہونے کا گمان ہوا تھا، وہ نظر تو سدا کی بے نور تھی۔ اور میں نہ جانے کن خوش فہمیوں کا شکار ہو چلا تھا۔ ’’میں آپ سے معافی بھی نہیں مانگ سکتا...... جانے غصّے میں کیا کچھ کہہ گیا۔ میرے اندر کا چور تھا، جو چُپ نہیں رہ سکا‘‘۔ عینی نے سر اٹھایا۔ ’’آپ ایسا کیوں سمجھتے ہیں، میں نے آپ کو ہمیشہ آپ کے لفظوں کے آئینے میں دیکھا ہے۔ اور میں نہیں مانتی کہ اتنی خوب صورت سوچ رکھنے والا شخص بدصورت ہوسکتا ہے، دوبارہ ایسی بات کبھی نہ کہیے گا‘‘۔ میں نے دکھ سے اس کی طرف دیکھا۔ ’’میرے کہنے یا نہ کہنے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی۔ سچ وہی ہے، جو میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ اس داغ دار چہرے کا مجسمہ بنا تو جو بات آج تک صرف میرے اردگرد والوں کے علم میں ہے، کل سارے شہر میں پھیل جائے گی، اور لوگ مذاق اڑائیں گے کہ یہ پَری زاد کو کیا سوجھی؟‘‘ عینی نے اپنا چشمہ دوبارہ اپنی آنکھوں پر جمایا اور کھڑی ہوگئی۔ ’’میں دیکھ نہیں سکتی، اپنی انگلیوں کی پوروں سے چیزیں چُھو کر انہیں مٹی کے مجسموں کے قالب میں ڈھالتی ہوں، مگر آپ کو دیکھنے کے لیے مجھے اپنی پوروں کی مدد کی ضرورت بھی نہیں پَری زاد...... آپ کے لفظ خود آپ کا تعارف ہیں‘‘۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ’’دل کے بہلانے کو، یہ خیال اچھا ہے۔ مگر میری تم سے اب بھی یہی درخواست ہے کہ یہ خیال اپنے دل سے نکال دو قراۃ العین‘‘۔ وہ پلٹنے سے پہلے ایک لمحے کے لیے رُکی۔ ’’میں اپنی گیلری میں آپ کا انتظار کروں گی پَری زاد......‘‘ وہ پلٹ کر چلی گئی اور میرے کمرے میں صرف اس کی خوشبو رہ گئی۔ آج میں نے پہلی بار اسے آپ نہیں، تم کہا، اور اس نے پہلی بار مجھے سَر یا صاحب نہیں، صرف پَری زاد کہہ کر پکارا تھا۔ یہ طرزِ تخاطب اور القابات بھی تو ہمارے اندر کے بدلتے رویوں اور رشتوں کا ایک اظہار ہوتے ہیں۔ دل کی میٹھی بولیاں اپنے القاب خود طے کرتی ہیں۔

اگلی شام میں جھجکتے قدموں کے ساتھ عینی کے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ گھر کے نچلے حصّے میں عینی اور اس کی ماں رہتی تھیں، جب کہ اوپر والا حصّہ انہوں نے کسی چھوٹے خاندان کو کرائے پر دے رکھا تھا۔ عینی کے والد کافی عرصے پہلے خالقِ حقیقی سے جاملے تھے اور اب یہی کرایہ اُن ماں بیٹی کی گزر بسر کا ذریعہ تھا۔ گھر کے پچھلے حصّے میں عینی نے اپنے لیے ایک چھوٹی سی آرٹ گیلری بنا رکھی تھی۔ مجسمہ سازی شروع کرنے سے پہلے عینی نے اپنی نازک مہکتی انگلیوں سے میرے چہرے کو مختلف زاویوں سے ٹٹول کر دیکھا۔ ٹھنڈک اور بے پناہ سکون کا ایک سمندر اس کے پوروں کے لمس سے میرے سارے وجود کی گہرائیوں تک سرایت کرگیا۔ میری جھلستی، تپتی روح کو جیسے خنک برف کا نخلستان ساٹل گیا۔ میری تمام عُمر کی ریاضتوں کا حاصل۔ وہ اس کے ہاتھوں کا مہربان لمس...... عینی نے کام شروع کردیا۔ میں چُپ چاپ بیٹھا دیکھتا رہا، اُس نے مجھے بتایا کہ اُسے مجسمہ بنانے میں تین چار دن لگیں گے۔ میرا جی چاہا کہ میں اس سے کہوں کہ تین چار صدیاں کیوں نہیں......؟؟ میری زندگی میں وہ پہلی مہ وش تھی کہ جس خوش ادا کی اتنی قربت اور نزدیکی مجھے شرمندہ اور پریشان نہیں کررہی تھی، کیوں کہ اتنے قریب موجود ہوتے ہوئے بھی دوسروں کی طرح اُس کی نظریں میرے چہرے کے آر پار نہیں ہورہی تھیں۔ نہ ہی مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر کوئی مخصوص طنزیہ مسکراہٹ ابھرتی تھی۔ عام طور پر جیسے ہی کوئی میری طرف نظر بھر کر دیکھتا، میری نظر اگلے ہی پل خود بخود جھک جایا کرتی، لیکن عینی کے کول چہرے کو گھنٹوں دیکھتے ہوئے مجھے ذرا سی بھی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی، کیوں کہ مجھے اس سے نظر ملنے کا ڈر نہیں تھا۔ کتنی بڑی آزادی تھی یہ میرے لیے۔ یہ کوئی مجھ جیسوں سے پوچھے۔

ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتے میں اگلے دن اور پھر شام ہونے کا انتظار کرتا رہا، جب مجھے دوبارہ عینی کی گیلری پہنچنا تھا۔ صبح سے دوپہر بھی نہیں ہوئی تھی کہ مجھے پہروں کی طوالت پر شبہ ہونے لگا۔ یہ دن کو چار پہروں میں کیوں تقسیم کردیا گیا ہے؟ پہلا پہر، دوپہر، سہ پہر اور پھر شام۔ کیا ضرورت تھی، بھلا وقت کو اتنے حصّوں میں بانٹنے کی، بس صبح ہوتی اور شام ہوجایا کرتی، تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس جیسے نہ جانے کتنے مزید بے سروپا خیالات میرے ذہن میں جالے بُن رہے تھے، جب اچانک پی اے نے انٹرکام پر مجھے بتایا کہ میڈم شہ پارہ مجھ سے ملنے آئی ہیں۔ میں شہ پارہ کو اپنے دفتر پا کر کچھ حیران سا تھا۔ میرے لیے وہ آج بھی وہی پرانی لبنیٰ تھی۔ وہ کچھ پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ ’’میں تم سے ایک درخواست کرنے آئی ہوں پَری زاد...... میرا فلمی کیریئر سیٹھ رحمان کی وجہ سے برباد ہوگیا۔ میں بہت پیچھے رہ گئی ہوں۔ کیا تم میری سفارش کسی بڑے پروڈیوسر سے کرسکتے ہو؟ بڑی دھاک ہے تمہاری شہر میں، تم کہو گے تو میں پھر سے اپنے قدم جمانے میں کام یاب ہوجاؤں گی‘‘۔ میں نے الجھن سے اس کی طرف دیکھا۔ ’’لیکن میں تو کسی بڑے پروڈیوسر سے واقف بھی نہیں ہوں لبنیٰ......‘‘ وہ مایوس ہوگئی ’’ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔ جانے میں کس پریشانی میں بنا سوچے سمجھے یہاں چلی آئی۔ تمہارا کاروبار اور فلمی دنیا بالکل جدا ہیں‘‘۔ وہ واپس جانے کے لیے پلٹی۔ میں نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ ’’ٹھہرو لبنیٰ! تم چاہو تو میں خود تمہاری فلم میں سرمایہ کاری کرسکتا ہوں۔ کتنے میں بن جاتی ہے ایک معیاری فلم......؟‘‘ وہ خوشی سے بے یقین ہوگئی۔ ’’سچ، تم خود پروڈیوس کرو گے میری فلم۔ واہ...... اس سے اچھی بات بھلا اور کیا ہوسکتی ہے، مگر اس کاروبار میں آج کل نقصان کا زیادہ خطرہ رہتا ہے پَری زاد، میں ڈرتی ہوں کہیں تمہاری رقم ہی نہ ڈوب جائے۔ تمہیں کوئی تجربہ بھی تو نہیں ہے فلم پروڈکشن کا......‘‘ میں نے مسکرا کر اس کی زلفِ پریشاں کے خم کو دیکھا۔ ’’چلو اس بہانے رقم ڈوبنے کا قیمتی تجربہ تو حاصل ہوجائے گا ناں! تمہاری فلم کے بدلے یہ تجربہ بھی سہی۔ ویسے بھی میں نے سُنا ہے کہ فلمیں دل سے بنائی جاتی ہیں، دماغ سے نہیں، تو پھر دل کی سودوں میں نفع و نقصان کی فکر بھلا کیسی؟ دل کا ملوث ہونا ہی خسارے کی نشانی ہے‘‘۔ لبنیٰ کی آنکھیں بھر آئیں اور اس نے فرطِ جذبات میں میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ’’نہیں، میں تمہارا نقصان نہیں ہونے

دوں گی پَری زاد...... میں بہت محنت کروں گی، بہت زیادہ۔ میری زندگی کی سب سے یادگار پرفارمینس ہوگی اس فلم میں، میرے پاس ایک کہانی ہے، اگر تمھیں پسند آگئی، تو میں رائٹر سے کہانی پر کام کرنے کا کہہ دوں گی، مگر تمھیں وقت نکالنا ہوگا اس فلم کے لیے۔ میں تمہاری موجودگی میں بہت سہارا محسوس کروں گی"۔ لبنیٰ چلی گئی اور میں شام کو کسی معمول کی طرح عینی کی گیلری پہنچ گیا۔ اسے گیلی مٹی گوندھتے دیکھ کر نہ جانے مجھے ہر بار ایسا کیوں لگتا تھا، جیسے مٹی بھی اپنی قسمت پر رشک کرتی ہوگی کہ کس کے ہاتھوں اس کا بُت بننے جا رہا ہے۔ اس شام ہم دونوں نے خوب باتیں کیں۔ سب لڑکیاں ایک جیسی باتیں کرتی ہیں، مگر اس کا اندازِ بیاں کس قدر جدا تھا۔ وہ جب رنگوں، خوشبوؤں، ڈھلتی شاموں اور راتوں کے طلسم کا ذکر کرتی، تو میں دم بخود سا بیٹھا اُسے دیکھتا رہتا۔ رات کو ساڑھے آٹھ بجے میں عینی کے گھر سے نکلا تو ہوا تیز چل رہی تھی۔ آسمان پر بادلوں کے جھنڈ حیرت سے اس نئے پَری زاد کی طرف دیکھ کر سرگوشیاں کر رہے تھے، راستے ہی میں چند بوندوں نے ٹپک کر میری گاڑی کی ونڈ اسکرین سے گاڑی کے اندر جھانکا اور مجھے دیکھ کر ایک دوسرے کو اشارے کرتی، ہنستی ہوئی برستی بارش میں اپنی دوسری سہیلیوں سے جاملیں۔ کبیر خان حسبِ معمول چوکنا سا ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا اردگرد پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اتنے میں لبنیٰ کا نمبر میرے سیل فون پر جگمگانے لگا۔ "پَری زاد...... کہاں ہو تم؟" "اجنبی شہر کے اجنبی راستے...... اور میں"۔ وہ ہنس پڑی "اسٹوڈیو آسکتے ہو ابھی۔ مجھے تمھیں کسی سے ملوانا ہے"۔ میں نے کبیر خان کو اسٹوڈیو چلنے کو کہا۔ ہم ویران سے فلم اسٹوڈیو کے گیٹ پر پہنچے تو چند عجیب سے حلیے والی عورتیں اور مرد ہمیں اندر گھومتے نظر آئے۔ عجیب سی اُداسی اور ویرانی چھائی ہوئی تھی سارے ماحول پر، جیسے کوئی سوگ برپا ہو۔ ہم ڈائریکٹر کے کمرے میں داخل ہوئے، تو وہاں پہلے سے کچھ لوگ موجود تھے۔ کبیر کا حلیہ اور کاندھے سے لٹکا پسٹل دیکھ کر وہ سب کچھ جزبز سے ہوگئے۔ میں نے کبیر کو باہر انتظار کرنے کو کہا۔ مگر میں جانتا تھا کہ وہ دروازے کے باہر ہی جما کھڑا رہے گا۔ نئی جگہ اور نئے ماحول میں وہ سائے کی طرح میرے ساتھ رہتا تھا۔ لبنیٰ نے ڈائریکٹر اور باقی لوگوں سے میرا تعارف کروایا۔ ایک جانب کونے میں ایک بوڑھا شخص

ہارمونیم سامنے رکھا بیٹھا تھا اور اس کی آڑ میں سمٹی سمٹائی ایک شرمیلی سی لڑکی، چھوئی موئی سی بنی بیٹھی تھی، جو اس دفتر کے ماحول سے بالکل میل نہیں کھا رہی تھی۔ باقی لوگوں کی چبھتی ہوئی نظریں لڑکی کے جسم کے آر پار ہو رہی تھیں، مگر میرے آتے ہی ڈائریکٹر نے فالتو عملے کو باہر بھیج دیا، تو لڑکی کے جسم کا تناؤ کچھ کم ہوگیا، مگر ابھی تک وہ وہیں دبکی بیٹھی تھی۔ لبنیٰ نے مجھے بتایا کہ وہ عمر رسیدہ شخص استاد بنّے خان ہے، مشہور موسیقار اور اس کے پہلو میں سمٹی ہوئی لڑکی سنبل ہے، استاد بنّے خان کی بیٹی اور آج وہ دونوں لبنیٰ کی آنے والی فلم کی دُھنوں پر کام کرنے کے لیے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ ڈائریکٹر ایک پکّی عمر کا تیز طرار سا بندہ تھا، جسے فلم ملنے کی بے حد خوشی تھی، لیکن کہیں اندر سے کوئی بے یقینی بھی اسے کھائے جا رہی تھی۔ "بس پَری زاد صاحب! کیا بتاؤں آپ کو، کبھی یہی فلم اسٹوڈیو تھا کہ چوبیس گھنٹے کام کی شفٹ چلتی رہتی تھی، کہیں ندیم صاحب، تو کہیں محمد علی صاحب۔ کہیں شاہد تو کہیں وحید مراد، کوئی نہ کوئی شوٹنگ جاری رہتی تھی۔ یہ جو فوارہ آپ نے نیچے دیکھا ہے ناں، یہاں تو بہ یک وقت تین تین گانے شوٹ ہوا کرتے تھے۔ بس پھر نہ جانے کیا ہوا، سب برباد ہوتا چلا گیا۔ اب تو سال بھر میں ایک آدھ فلم بنتی ہے، اس کا بھی کچھ پتا نہیں چلتا۔ سیکڑوں کاری گر اور ان کے خاندان بے روزگار ہوگئے"۔ وہ مزید بنا رُکے یونہی بولتا رہتا، اگر لبنیٰ اسے اشارہ کرکے روک نہ دیتی۔ لبنیٰ ہی کے کہنے پر ڈائریکٹر نے مجھے فلم کی کہانی سنائی، بنیادی پلاٹ محبت کی کہانی پر مرکوز تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دنیا میں صرف تین یا چار کہانیاں ہی پائی جاتی ہیں۔ باقی ساری کہانیاں انہی کہانیوں سے جنم لیتی ہیں اور مجھے یہ پڑھ کر ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی تھی، تین چار کی جگہ اگر صرف ایک محبت کی کہانی ہوتی، تو بھی اس کائنات کے لیے کافی تھی۔ درمیان میں ڈائریکٹر ہمیں گانے کی سچویشن اور مقام بھی بتاتا رہا اور کہانی کے اختتام کے بعد استاد بنّے خان اپنا ہارمونیم اٹھائے کمرے کے وسط میں بیٹھ گئے۔ سنبل بھی استاد کے ساتھ سمٹ کر بیٹھ گئی اور استاد نے راگ چھیڑ دیا۔ لڑکی کی آواز واقعی سُریلی تھی اور گلے میں بلا کا لوچ تھا۔ وہ گانے کے دو بول دہراتی اور پھر گھبرا کر میری طرف اپنی ہرنی جیسی آنکھیں اٹھا کر

دیکھتی کہ میں دل چسپی لے رہا ہوں یا نہیں۔ فن کو ہمیشہ ستائش کی تمنا رہتی ہے اور شاید فن کار کو اپنے قدر دانوں کی نظریں پڑھنے کا فن آتا ہے۔ "جب بارش کی پہلی بوند گرے...... تم چلے آنا...... میرا سندیسہ ملے نہ ملے...... تم چلے آنا......" باہر برستی بارش کے جلترنگ کے ساتھ مل کر استاد بنّے خان کے سُر اور سنبل کی رسیلی آواز ایک عجیب سا ماحول پیدا کر رہے تھے۔ استاد نے مجھے بتایا کہ اس کی بیٹی نے بی۔ اے کرلیا ہے، مگر اب وہ اسے اپنے آبائی فن سے متعارف کروانا چاہتا ہے۔ یہ ان کی خوش قسمتی ہے کہ شہ پارہ بیگم نے انہیں اپنی نئی فلم میں موقع دینے کا وعدہ کیا ہے، مگر یہ سب میری منظوری پر منحصر ہے۔ استاد کسرِ نفسی کا پیکر تھا اور اس کی اور بیٹی کی خستہ حالی، ان دونوں کی حالت بھی پوری طرح بیان کر رہی تھی۔ مجھے وہ ایک وضع دار شخص لگا، جسے یقیناً کسی بہت بڑی مجبوری نے یوں بیٹی کو فلم انڈسٹری کے ماحول میں بطور گلوکارہ متعارف کروانے پر اکسایا ہوگا۔ جب استاد نے لجاجت سے مجھ سے پوچھا کہ کیا مجھے ان باپ بیٹی کا فن پسند آیا، تو میرے لب کپکپا سے گئے۔ "یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔ مجھے تو ٹھیک طرح سے سُننا بھی نہیں آتا۔ میں بھلا آپ کے فن کی جانچ کیسے کرسکتا ہوں۔ آپ کی ریاضت اور محنت نے آپ کو اس مقام پر پہنچایا ہے۔ کوئی ہنرمند ہی آپ کو صحیح داد دے سکتا ہے"۔ استاد بنّے کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ لبنیٰ نے موضوع بدل دیا۔ "آپ بھی کن باتوں میں پڑ گئے ماسٹر جی...... پَری زاد صاحب کی یہ پہلی فلم ہے"۔ استاد بنّے نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگایا "ہاں، پر ادب والے ہیں۔ شاید اسی لیے آج اس مقام پر ہیں"۔ میں نے لبنیٰ سے دبے لفظوں میں دوبارہ کہا کہ وہ فلم سے متعلق تمام فیصلوں کی مختار ہے۔ مجھے ان بکھیڑوں سے دور ہی رکھے، مگر وہ نہیں مانی اور اگلی رات کے لیے پھر سے فلم کی دوسری بیٹھک رکھ دی گئی۔ ہم لوگ چائے پی کر رخصت ہوئے تو گیٹ کے قریب میں نے استاد بنّے اور سنبل کو سڑک کنارے انتظار کرتے دیکھا۔ میں نے شیشہ نیچے کرکے پوچھا تو پتا چلا کہ رکشے یا ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ ان کے لاکھ انکار کے باوجود میں نے انہیں گاڑی میں بٹھالیا۔ بارش تیز تر ہوچکی تھی۔ ہماری گاڑی اندرون شہر کی چند تاریک گلیوں سے ہوتی ہوئی ایک پرانے محلّے کے بوسیدہ سے لکڑی کے پھاٹک نما گیٹ پر جا کھڑی ہوئی۔ استاد نے بہت اصرار کیا کہ میں ایک کپ چائے پی کر جاؤں، مگر میں نے معذرت کرلی۔ اس کی بیٹی نے بھی دبے لفظوں میں مجھے گھر آنے کا کہا۔ میں نے پھر کبھی آنے کا وعدہ کرلیا۔ وہ دونوں ہماری گاڑی نکلنے تک وہیں کھڑے رہے۔

اگلی شام میں ٹھیک چار بجے عینی کی گیلری میں اس کے سامنے بیٹھا تھا، جیسے ایک پڑھاکو بچہ ٹھیک وقت پر اپنی جماعت میں پہنچ کر سبق سُنانے کے لیے اپنی باری کا انتظار کرتا ہے۔ میں نے عینی کو فلم کے بارے میں بتایا تو خوشی سے چلائی۔ "فلم...... واہ...... پَری زاد میں آپ کی فلم کی آرٹ ڈائریکٹر بنوں گی۔ ساری سجاوٹ میری طے کردہ ہوگی، ہر سیٹ پر میری بنائی ہوئی مورتیاں ہوں گی، ٹھیک......؟" "ہاں ہاں، ٹھیک ہے، مگر پہلے میرا مجسمہ تو مکمل کردو۔ کہیں اس فلم کے جھمیلے میں ہمارا کام ہی نہ رہ جائے"۔ وہ میری بات سُن کر زور سے ہنس پڑی۔ سنّاٹے میں یک لخت بہت سے جھرنے پھوٹ پڑے۔ میں سحر زدہ سا بیٹھا اسے کام کرتے دیکھتا رہا۔ زندگی بس اسی دورانیے کا نام ہوتی، تو کتنا اچھا ہوتا، مگر ہر اچھے وقت کی طرح یہ پل بھی پل بھر میں کٹ گئے اور مجھے اٹھنا پڑا۔ واپسی پر میں نے ڈرائیور کو گاڑی اسٹوڈیو کی طرف موڑنے کا کہا تو کبیر اپنے چہرے کے تاثرات چُھپا نہیں پایا۔ "صاب! اجازت دو تو ایک بات

بولے۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''ہاں بولو......؟'' وہ اگلی سیٹ پر اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ذرا سا کسمسایا ''صاب! یہ فلم اسٹوڈیو کا علاقہ محفوظ نہیں ہے۔ ہزار دوست، ہزار دشمن ہوتا ہے بندے کا......'' میں نے چونک کر کبیر کی طرف دیکھا۔ وہ تبھی اپنی زبان کھولتا تھا، جب اسے ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ میری وجہ سے شہر میں بہت سوں کی ترقی رک چکی تھی۔ ہر بڑا ٹینڈر میرے نام کھل رہا تھا۔ میری دولت کا مقناطیس اپنے جوبن پر تھا، جو مایا کا کوئی بھی ذرہ اپنے سے دور جانے نہیں دیتا تھا اور یقیناً یہ بات بہت سوں کو کھلتی بھی ہوگی۔ گاڑی اسٹوڈیو کے احاطے میں داخل ہوئی تو حسبِ معمول چند آوارہ کتوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ڈائریکٹر کے کمرے میں نشست جمی ہوئی تھی۔ استاد بنّے اور سنبل نے تیار کردہ دُھنوں پر کچھ گیت گنگنائے۔ مگر مجھے شاعری کچھ عامیانہ سی لگی۔ لبنیٰ نے میری بے چینی بھانپ لی۔ ''پَری زاد...... تم خود کیوں گیت نہیں لکھتے اپنی فلم کے لیے'' ۔ سنبل نے شاعری کے ذکر پر چونک کر میری طرف دیکھا، میں نے

جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں نہیں، مجھے فلمی شاعری کا بالکل تجربہ نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ ہم کسی مستند فلمی شاعر سے گیت لکھوالیں'' ۔ سنبل نے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور جھجک کر بولی۔ ''اگر آپ لوگ اجازت دیں تو ہمارے محلے میں ہی ایک بہت اچھے شاعر رہتے ہیں۔ دنیاداری سے ناتا نہیں، مگر ضرورت مند بھی ہیں، ہو سکے تو......'' وہ کہتے کہتے چپ ہوگئی۔ ڈائریکٹر نے منہ بنایا ''دیکھ لیں گے اُسے بھی، کون سا ساحر لدھیانوی یا مجروح سلطان پوری چھپا بیٹھا ہے اس کے اندر'' ۔ لبنیٰ شاعری میں دیر کی وجہ سے کچھ پریشان سی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے بنّے خان سے کہا کہ ہم ابھی چل کر مل لیتے ہیں اس شاعر سے، ڈائریکٹر بوکھلا سا گیا۔ ''ارے کیا بات کرتے ہیں سر جی...... آپ کیوں جائیں گے، وہ خود آئے گا یہاں'' ۔ میں نے اس کی سُنی اَن سُنی کر دی۔ ہم اسٹوڈیو سے باہر نکل رہے تھے کہ اچانک چند لوگ ''شاہ جی...... شاہ جی'' کہتے ہوئے ایک خوش لباس شخص کی طرف لپکے، استاد بنّے نے بھی آگے بڑھ کر سلام کیا۔ وہ شخص بہت گرم جوشی اور عزت سے بنّے خان سے ملا۔ گاڑی آگے بڑھی، تو بنّے خان نے مجھے بتایا۔ ''یہ سید نور صاحب ہیں...... پاکستان کی فلم انڈسٹری اب بس انہی کے دم قدم سے قائم ہے۔ آج کل بڑی اچھی فلم بنا رہے ہیں، مجاجن'' ۔ گاڑی بنّے خان کے اندھیرے محلے میں پہنچی تو میں بھی باپ بیٹی کے ساتھ نیچے اتر آیا۔ چند گلیاں گزرنے کے بعد وہ دونوں ایک چھوٹے سے کچے مکان کے آگے رُک گئے۔ دستک کے جواب میں اندر سے کسی نے لرزتی آواز میں کہا ''اندر آجایئے صاحب، مزاروں کے دروازوں پر دستک نہیں دی جاتی'' ۔ میں، سنبل اور بنّے کے ساتھ اندر داخل ہوا تو چھوٹے سے برآمدے کے سامنے بنے واحد کمرے کے اندر لالٹین کی کمزور سی روشنی نے مٹیالا اُجالا پھیلا رکھا تھا۔ بنّے اور سنبل کو دیکھ کر میزبان کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی ''کبھی ہم خود کو، کبھی گھر کو دیکھتے ہیں......'' بان کی جھلنگا سی چارپائی پر لیٹا وہ کمزور سا نوجوان اٹھ بیٹھا۔ ''معاف کیجیے گا، کمرے میں ایک ہی کرسی ہے لہٰذا......'' وہ نہ جانے کیا کہہ رہا تھا، مگر میری نظریں اس کے چہرے سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ وہ بھی میری چبھتی نظریں محسوس کر کے میری جانب متوجہ ہوگیا۔ اور پھر اس کی حالت بھی مجھ جیسی ہی ہوگئی اور وہ بے تابی سے کھڑا ہوگیا اور لپک کر مجھے شانے سے پکڑ کر سرسراتی آواز میں بولا ''پَری زاد...... یہ، یہ تم ہی ہو ناں......'' میری آنکھیں نم ہونے لگیں ''کیوں......؟ یہ چہرہ دیکھ کر بھی نہیں پہچانا کیا، صرف لباس و حلیہ بدلا ہے میرا۔ مقدر وہی لیے پھر رہا ہوں ناساز......'' وہ روتے ہوئے مجھ سے لپٹ گیا۔ کہاں چلا گیا تھا یار! اپنے دوست کو بھی بُھلا دیا'' ۔ بنّے خان اور سنبل حیرت زدہ اور پریشانی سے ہم دونوں کو گلے مل کر روتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ہاں وہ ناساز ہی تھا۔ میرے کالج کے دور کا واحد دوست، جس نے میرے اندر بُجھی شاعری کی چنگاری کو ہوا دے کر شعلے میں تبدیل کر دیا تھا۔ سنبل نے جھجکتے ہوئے ناساز سے کہا ''آپ انہیں جانتے ہیں، یہی فلم کے پروڈیوسر ہیں پَری زاد...... اور میں نے ان ہی کی فلم کے لیے نغمہ نگاری کرنے کو کہا تھا آپ سے......'' ناساز حیرت سے مجھے ٹٹول ٹٹول کر دیکھتا رہا۔ ''یہ کیا انقلاب ہے پیارے، سب فتح کر لیا کیا میرے شہ سوار؟ تُو تو واقعی فاتح نکلا'' ۔ میں نے مُسکرا کر اس کی طرف دیکھا ''نہیں...... اب بھی ہار رہا ہوں، بس سونا چاندی جمع ہوتا جا رہا ہے زادِ راہ کے طور پر، دل اتنا ہی ویران اور ناکارہ ہے اب تک'' ۔ وہ زور سے ہنسا ''یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا......'' بنّے خان اور سنبل ہمیں باتوں میں مصروف دیکھ کر گھر سے چائے وغیرہ کا انتظام کرنے چلے گئے۔ ناساز کے گھر کی حالت دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس کے پاس شاید چائے کے پورے برتن بھی نہ ہوں۔ وہ پہلے سے بہت زیادہ کمزور اور لاغر لگ رہا تھا۔ وہ غور سے میری داستان سُنتا رہا۔ اس کے آس پاس دواؤں کا ایک انبار سا لگا ہوا تھا۔ ''یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے ناساز...... کالج کا سب سے خوش پوش اور زندہ دل لڑکا یوں بستر سے لگا پڑا ہے۔ سب خیر تو ہے نا......'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''یاد ہے، کالج کے دور میں ہم نے چُھپ کر ہاسٹل میں وی سی آر پر فلم دیکھی تھی ''نمک حرام'' اس میں وہ شاعر والا گیت ہم دونوں کتنا گنگنایا کرتے تھے۔ ''میں شاعر بدنام...... میں چلا...... محفل سے ناکام...... میں چلا......'' تو بس یار...... یہ شاعر جو ہوتے ہیں ناں، یہ محفل سے ناکام ہی چلے جاتے ہیں'' ۔ میں نے اسے غور سے دیکھا ''اور یہ پھولوں جیسی لڑکی سنبل، یہ اس شاعرِ ناکام کی کیا لگتی ہے؟'' اس نے ایک لمبی سی سرد آہ بھری۔ ''پگلی ہے، مزاروں کے در کھٹکھٹاتی رہتی ہے۔ اب دیکھو، تمہیں پکڑ لائی ہے اور یہ تم ہی تھے کہ آگئے، کوئی روایتی فلم پروڈیوسر ہوتا تو کبھی نہ آتا'' ۔ اتنے میں باہر صحن کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے ناساز کو لیٹے رہنے کا اشارہ کیا اور خود باہر نکل کر دروازہ کھولا تو سنبل چائے کے لوازمات لیے کھڑی تھی۔ ''آپ نے یہ سب تکلف کیوں کیا؟ میں کوئی مہمان تو نہیں ہوں سنبل'' ۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ''آپ اسے بچالیں پَری زاد صاحب، آپ ہی اسے بچا سکتے ہیں۔ ہمارا واحد سہارا اب آپ ہیں......'' میں نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ ''ایسا کیوں کہہ رہی ہیں آپ؟ کیا ہوا ناساز کو......'' سنبل کی آنکھیں چھلک پڑیں ''اسے کینسر ہے، اور ڈاکٹر کہتے ہیں کہ آخری اسٹیج پر ہے اس کا کینسر......'' میرے پیروں تلے زمین یک دم سرک گئی۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، مُلک کے معروف ومنفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پرمبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین'' روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

سنبل چائے رکھ کر کمرے سے باہر نکلی، تو میں نے ناساز کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''چلو میرے ساتھ، اب میں تمہیں یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ دنیا کے کسی کونے میں بھی، جہاں تمہارا علاج ممکن ہو، تمہیں وہاں پہنچانا اب میری ذمّے داری ہے۔ اٹھو، جلدی کرو۔'' ناساز نے مجھے کھینچ کر دوبارہ بٹھا دیا ''بہت دیر ہو چکی ہے پَری زاد...... اب مجھے یہیں رہنے دو۔ یہ کمرا، یہ تنہائی اب یہی میری سنگت ہے، اور پھر یہاں وہ پگلی بھی تو ہے ناں...... مجھے ان سب کے ساتھ رہنے دو''۔ میں نے غصّے سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ''اب میں تمہاری کوئی بات نہیں سُنوں گا، ساری زندگی دوسروں کو جینے کا درس دیتے رہے اور آج خود زندگی سے بھاگ رہے ہو، ایسا کیوں کر رہے ہو میرے یار......؟'' ناساز نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔ ''زندگی خود مجھ سے دامن چُھڑوانے کی فکر میں ہے پیارے، میں ہی ڈھیٹوں کی طرح اس کے دامن سے لپٹا ہوا ہوں۔ ہاں، اب اگر مَر بھی جاؤں تو کوئی غم نہیں۔ میرے جانے کے بعد تم سنبل کا خیال رکھو گے ناں پَری زاد......'' میں نے واپس پلٹنے سے پہلے لمحہ بھر کے لیے اسے دیکھا ''کچھ نہیں ہوگا تمہیں۔ میں تمہیں کچھ ہونے نہیں دوں گا میرے شاعر بدنام بکل تیار رہنا۔ تمہیں ڈاکٹر کو دکھانا ہے''۔ ناساز نے ہنس کر میری طرف دیکھا اور شرارت سے بولا۔ ''تشخیص بجا ہے، کہ مجھے عشق ہوا ہے...... نُسخے میں لکھوان سے ملاقات مسلسل''

اگلے روز عینی کی گیلری میں بھی میرا دھیان ناساز کی طرف ہی لگا رہا۔ عینی نے حتمی طور پر چند زاویے درست کیے اور مجسمے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ ''بس جناب، ہوگیا مکمل''۔ اس کی آواز سے جوش ٹپک رہا تھا ''بتائیں ناں پَری زاد۔ کیسا بنا ہے آپ کا اسکلپچر......؟'' میں اپنے خیالات کی دنیا سے چونک کر پلٹا۔ اور پھر میری نظر عینی کے بنائے مجسمے پر پڑی تو آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ گئیں۔ میں بے اختیار اٹھ کر مجسمے کے قریب آگیا۔ میری آنکھیں نم ہونے لگیں، اتنا بے داغ، خُوب صورت، مردانہ وجاہت سے بھرپور چہرہ، ایسا چہرہ تو میں نے کبھی آئینے میں نہیں دیکھا تھا۔ عینی میری حالت سے بے خبر اپنی دھن میں بولے جارہی تھی ''میں اپنی پوروں کی آنکھوں سے آپ کو ایسا دیکھتی ہوں پَری زاد...... بتائیں ناں، کتنا قریب تر ہے یہ آپ سے، آپ چُپ کیوں ہیں، بولتے کیوں نہیں، کیا میں نے بہت بُرا بنایا ہے۔ کچھ تو بولیں، پلیز......'' وہ پریشان سی ہوگئی۔ میری آواز کی لرزش خود میرے لیے بھی اجنبی تھی ''نہیں، تم نے دنیا کا سب سے خُوب صورت چہرہ تراشا ہے۔ مگر میں ایسا نہیں ہوں۔ پیاری لڑکی میں تو وہ ہوں، جسے دیکھ کر آئینے بھی آنکھیں پھیر لیتے ہیں، سرسراتی ہوائیں گھبرا کر تھم جاتی ہیں، سورج مدہم پڑ جاتا ہے اور چاند کی چاندنی تپتی کرنیں برسانے لگتی ہے۔ وہ تڑپ کر میرے قریب آگئی'' ایسا کیوں کہتے ہیں آپ، میری انگلیوں کی پوریں کبھی جھوٹ نہیں بولتیں، یہ میرے مَن کی تصویر مٹّی کے قالب میں ڈھالتی ہیں، سچ بتائیں، اس چہرے کے خدوخال آپ کے چہرے جیسے نہیں ہیں کیا......؟'' میری آواز بھرّا گئی۔ ''ہاں بلاشبہ، خدوخال، نقوش، آنکھیں سب میرے چہرے سے مشابہ ہیں، مگر جو نُور، حُسن و وجاہت تمہاری پاکیزہ انگلیوں کی کاری گری نے اس مجسمے میں منتقل کردی ہے، میرے پاس ایسی کوئی روشنی، کوئی حُسن نہیں''۔ وہ رو پڑی۔ کاش میں اسے یہ بات سمجھا سکتا کہ دنیا اس کے کول مَن کی آنکھوں سے نہیں دیکھتی۔ دنیا بڑی ظاہر پرست ہے۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ آج میں اتنا اُداس کیوں ہوں۔ میں نے اسے اپنی اور ناساز کی دوستی کے بارے میں بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ کس خطرناک بیماری میں مبتلا ہے۔ عینی نے ناساز سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور میں شام ڈھلے اس کے گھر سے واپسی پر اُسے بھی اپنے ساتھ ناساز کے گھر لے آیا۔ ناساز نے عینی کو میرے ساتھ دیکھا، تو حسبِ عادت مصرع اس کے ہونٹوں سے پھسل گیا ''سُنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں......'' میں نے اُن دونوں کا تعارف کروایا۔ ناساز نے شرارت سے میری طرف دیکھا ''سو، اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں......'' میں نے اسے گھور کر دیکھا ''باز آجاؤ، عینی تم ہی اسے سمجھاؤ کہ اپنی ضد چھوڑ کر ہمارے ساتھ چلے۔ دنیا کی کوئی بھی بیماری لاعلاج نہیں ہوتی۔ کوشش کرنا تو ہمارا فرض ہے''۔ عینی اور ناساز بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ناساز نے فلم کے لیے لکھے اپنے نغمے عینی کو سنائے۔ کچھ دیر بعد سنبل بھی آگئی اور حسبِ معمول دو لڑکیوں کے اکٹھے ہوتے ہی باقی ساری باتیں پس منظر میں چلی گئیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں ایسی گم ہوئیں کہ باقی سب بھول گئیں۔ کہتے ہیں، دو لڑکیاں جب پہلی بار ملتی ہیں تو عموماً ڈھائی تین گھنٹے کی تعارفی ملاقات کے بعد ایک دوسرے سے ان کا پہلا سوال ہوتا ہے ''ویسے تمہارا نام کیا ہے......؟'' وہ دونوں بھی برآمدے میں بیٹھی شاید ایک دوسرے سے یہی سوال کر رہی تھیں۔ ناساز سرک کر میرے قریب آگیا ''تم تو بڑے چُھپے رستم نکلے پَری زاد پیارے...... ایسی پری ساتھ لیے پھرتے ہو کہ جس کی پہلی جھلک ہی دھڑکنیں روک دے۔ اور پھر بھی کہتے ہو کہ دل ابھی ویران ہے''۔ میں نے دُکھ سے باہر بیٹھی عینی کی طرف دیکھا۔ ''وہ دیکھ نہیں سکتی، اس لیے میرے ساتھ ہے، ورنہ دوسروں کی طرح یہ رشتہ بھی تضحیک یا ہمدردی کے قالب میں ڈھل جاتا۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ میں خود اسے دھوکا دے رہا ہوں۔ اس کے ساتھ چل کر میں نہ صرف خود کو بلکہ اس معصوم، اَن جان لڑکی کو بھی لوگوں کے مذاق کا باعث بنا رہا ہوں''۔ ناساز میری بات سُن کر خاموش سا ہوگیا ''میں باقی ساری دنیا کی طرح یہ کہہ کر تمہارے زخموں پر نمک نہیں چھڑکوں گا کہ دولت ہر مرض کا علاج ہے، لیکن تمہیں ایک مشورہ ضرور دوں گا کہ اگر تم اپنے اندر کی اس آواز کو دبا نہیں سکتے، تو پھر اپنا چہرہ بدل ڈالو۔ آخر کب تک خود کو اسے اَن دیکھے عذاب کی بھٹی میں جھونکے رکھو گے؟'' میں نے چونک کر ناساز کی جانب دیکھا ''کیا مطلب؟'' ''مطلب یہ کہ آج کل کیا ممکن نہیں، صرف جیب میں دمڑی ہونی چاہیے، جو ماشاء اللہ اب تمہارے پاس بہت ہے۔ کہیں بھی بیرون ملک جا کر پلاسٹک سرجری کروالو۔ آج کل تو ساری دنیا کو چہرہ بدلنے کا خبط سوار ہے۔ اچھے خاصے لوگ علاج کے بہانے اپنے چہرے کی نوک پلک سنوارنے کے لیے پلاسٹک سرجری کروالیتے ہیں۔ تو پھر اگر تم بھی اپنی جون بدل لو گے، تو بھلا کون سی قیامت آجائے گی۔ اتنے میں وہ دونوں اندر چلی آئیں اور ناساز نے بات بدل دی۔

رخصت ہوتے وقت ناساز نے عینی سے کہا ''سُنو لڑکی، آج میں تمہیں وہ بات بتاتا ہوں، جو آج سے پہلے تمہیں شاید کسی نے نہ بتائی ہو۔ تمہاری آنکھیں دنیا کی سب سے خُوب صورت آنکھیں ہیں۔ اور میرا دل کہتا ہے کہ جلد ہی یہ آنکھیں اس دنیا کے سارے رنگ دیکھ سکیں گی''۔ عینی کی پلکیں نم ہوگئیں اور ہم وہاں سے پھر ملنے کا وعدہ کر کے چلے آئے۔ لیکن میرا دھیان ساری رات ناساز کی پلاسٹک سرجری والی بات میں اُلجھا رہا۔ کیا ایسا ہوسکتا ہے، پیدائش سے لے کر آج تک مجھے جن عذابوں کا سامنا رہا ہے، وہ سب اُلجھنیں، کرب اور عذاب ایک ہی جھٹکے میں ختم ہو جائیں گے کیا؟ مگر عُمر بھر کی شناخت

بدلنا تو کچھ آسان نہیں۔ جو لوگ اس پَری زاد کو جانتے ہیں، وہ ایک نئے اور اُجلے چہرے والے پَری زاد کو قبول کرنے میں کتنا وقت لیں گے۔ ساری رات نہ جانے ایسے کتنے بے سروپا خیالات میرے خالی دماغ میں کھنکھناتے رہے۔

جانے کب صبح ہوئی اور کب سورج نے میری کھڑکی کے شیشوں سے جھانک کر دھوپ کا سلام بھیجا۔ دفتر پہنچا تو کمالی میرے ہی انتظار میں بیٹھا تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی شکوہ کیا۔ ''یہ کیا سَر جی! آپ نے اتنی بڑی فلم شروع کر دی، اور مجھے خبر بھی نہیں ہونے دی''۔ کمالی کے ہاتھ میں صبح کا اخبار دیکھ کر میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''تو یہ خبر چَھپ گئی، یہ اخبار والے جانے اتنی جلدی کیسے اُڑتی چڑیا کے پَر گن لیتے ہیں۔ ابھی تو صرف منصوبہ ہی بنا تھا''۔ کمالی نے جوش میں اندرونی صفحہ کھولا ''شہ پارہ بیگم کا پورا انٹرویو چَھپا ہے سَر! ساری فلم انڈسٹری ہلا کر رکھ دی ہے آپ نے۔ کبھی مجھے بھی بہت شوق تھا فلموں میں کام کرنے کا۔ آہ، مگر اب تو فلم دیکھنے کی مہلت بھی نہیں ملتی''۔ میں کسی اور خیال میں گم بیٹھا تھا۔ کمالی اپنی دُھن میں بولے گیا ''اس دن آپ نے مجھ سے پوچھا تھا نا سَر کہ شادی کے اتنے سال بعد بچّوں اور گھر بار کے مسائل کے ہجوم میں ہماری محبت کہاں کھو جاتی ہے، تو بات صرف محبت کی نہیں ہے۔ ہم وقت کے ساتھ ساتھ اپنے دل کی باقی حسرتیں اور خواہشیں بھی مٹی کر دیتے ہیں اس غمِ دوراں کی آندھی میں۔ اب یہی فلم ایکٹر بننے والی خواہش ہی لے لیں میری۔ کاش! میں شادی کے چکّر میں اس آرزو کا گلا نہ گھونٹتا''۔ کمالی باقاعدہ غم گین ہو گیا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ''جانتے ہو کمالی، دنیا کا سب سے ناکام آدمی کون ہوتا ہے، وہ، جو اپنے ماضی کے کیے گئے فیصلوں کو یاد کر کے حال میں خود کو کوسے۔ تم نے اُس وقت وہی فیصلہ کیا، جو تمہارے دل نے بہتر جانا۔ تب تمہاری محبت ہی تمہاری ہر خوشی کا حاصل تھی۔ اگر اُس وقت تم فلم انڈسٹری جوائن کر لیتے تو شاید آج ایک نام ور آرٹسٹ کہلاتے، مگر یقین کرو، اپنی محبت کھو دینے کی کسک تمہیں آج زیادہ غم گین رکھتی۔ جسے تم نے پالیا، بس وہی تمہارا نصیب ہے، باقی سب سراب ہے''۔ کمالی نے اثبات میں سر ہلایا ''شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر، مگر پھر یہ پایا ہوا نصیب اپنی کشش کیوں کھو دیتا ہے۔ لاحاصل ہی ہمیشہ پُرکشش کیوں رہتا ہے؟'' میں نے لمبی سانس بھری ''شاید اس لیے کہ انسان سدا کا ناشکرا ہے۔ اور رہی بات محبت کی، تو ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے، اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ کب رفتہ رفتہ ہماری محبت، شفقت میں بدل جاتی ہے۔ محبت، محبت، نہیں رہتی، ایک گہری شفقت بن جاتی ہے''۔ کمالی نے حیرت سے میری طرف دیکھا ''شفقت...... میں سمجھا نہیں سر''۔ ''ہاں کمالی، شفقت، ہماری محبت کہیں کھوتی نہیں ہے۔ بس کسی اور جذبے میں ڈھل جاتی ہے۔ اور ہم باقی ساری زندگی اس شفقت ہی کو محبت سمجھتے ہوئے گزار دیتے ہیں۔ شاید اسی لیے ہماری زندگی میں کسی نئی محبت کے لیے جگہ ہمیشہ خالی رہتی ہے۔ اور یوں ہماری زندگیوں میں نئی محبتوں کا ڈاکا ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ جاؤ کمالی، اپنی بیوی بچّوں کو اپنا پورا وقت دیا کرو۔ کیوں کہ کبھی کبھی شفقت کا قرض محبتوں کے اُدھار سے کئی گنا زیادہ ہوتا ہے''۔ کمالی چُپ چاپ دفتر سے نکل گیا۔

دوپہر کو لبنیٰ کا فون آیا، تو مَیں نے اسے خوش خبری سُنائی کہ ناساز نے فلم کے سارے گیت لکھ کر استاد بنّے خان کے حوالے کر دیے ہیں۔ میوزک بھی تقریباً مکمل ہو چکا تھا، لہٰذا اگلے ہفتے فلم کی ساری موسیقی ترتیب دے دی گئی۔ سنبل نے مجھے بتایا کہ اس نے مہینوں بعد ناساز کی آنکھوں میں خوشی کی سچی لہر دیکھی، جب اس نے اپنی شاعری پر سنبل کی آواز کا جادو جگتے سُنا۔ لبنیٰ کی خواہش تھی کہ فلم کے گانے کینیڈا یا یورپ کے کسی حسین مقام پر فلم بند کیے جائیں۔ فلم کی کاسٹنگ مکمل ہو چکی تھی اور اب صرف شوٹنگ کا مرحلہ شروع ہونا باقی تھا۔ میں دن بھر غیر محسوس طور پر طب کے رسالوں اور انٹرنیٹ پر دنیا کے بہترین پلاسٹک سرجنز کی تفصیلات کھوجتا رہتا تھا۔ میرے دفتر کی الماریوں اور میز کے خفیہ دراز اب ایسی معلومات سے بَھرے رہتے تھے، مگر یہ سب کچھ میں اس طرح چُھپ کر کر رہا تھا، جیسے کوئی چور، چوری کرتا رہا۔ پہلے مجھے ہمیشہ یہ خوف اور فکر دامن گیر رہتی تھی کہ لوگ میری صُورت کا مذاق اُڑائیں گے اور اب جب ایک راستہ دکھائی دیا تھا تو یہ ڈر دامن سے لپٹا تھا کہ لوگ کیا کہیں گے......؟ ہماری زندگی کے نوّے فی صد معاملات کی اُلجھن اسی ایک جملے ہی میں تو پنہاں ہے کہ زمانہ کیا کہے گا......؟ کتنی حیرت کی بات ہے کہ ہم زیادہ تر اُن ہی لوگوں کی باتوں کی فکر میں گُھلے جاتے ہیں، جن کی وجہ سے درحقیقت ہماری زندگی اجیرن ہوتی ہے۔

اگلی شام میں عینی کے گھر پہنچا، تو وہ اپنی کسی سہیلی کے ساتھ ریڈیو اسٹیشن کے لیے نکل چکی تھی۔ میں واپس پلٹنے لگا، تو اس کی والدہ نے مجھے چائے کے لیے روک لیا، کمرے میں چاروں جانب میڈیکل رپورٹس اور آنکھوں سے متعلق دنیا کے کچھ مشہور اسپتالوں کے کتابچوں کا انبار سا لگا تھا۔ عینی کی والدہ نے بتایا کہ عینی سات سال کی عُمر تک بالکل ٹھیک تھی، پھر نہ جانے کیا ہوا کہ دھیرے دھیرے اس کی بینائی جاتی رہی۔ اُس وقت عینی کے والد زندہ تھے اور انہوں نے اپنی سی ہر ممکن کوشش کر دیکھی، مگر عینی کی بینائی واپس نہ آسکی۔ پھر کئی سال بعد بات یہاں تک پہنچی کہ اگر عینی کے گروپ سے مشابہت رکھتا ہوا لینز (قرنیہ) مل جائے تو عینی کی بصارت واپس آسکتی ہے۔ عینی کی والدہ نے دنیا بھر کے طبّی اداروں کو اپنی بیٹی کے کیس کی تفصیلات بھجوا رکھی تھیں اور اب مہینوں سے اس جواں ہمت خاتون کا کام بس یہی تھا کہ وہ عینی کے آنکھوں کے قرنیے کی تلاش کے لیے دنیا بھر میں خط و کتابت کرتی رہتی تھیں۔ میں نے انہیں تسلّی دی کہ اللہ نے چاہا تو جلد ہی ان کی تلاش، رنگ لائے گی۔ عینی کے گھر سے نکلتے وقت میرے دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ اگر عینی کی بینائی میری سرجری سے پہلے واپس آگئی تو وہ مجھے دیکھ کر کیا سوچے گی۔ اس کے مَن نے میری جو شبیہ تراشی تھی، مجھے دیکھتے ہی وہ ایک چھناکے سے ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو جائے گی۔ کاش! اس ساری دنیا میں کسی کی آنکھیں ہی نہ ہوتیں اور ہم سب اپنی انگلیوں کی پوروں سے ایک دوسرے کو دیکھا کرتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ مگر جہاں ''کاش'' آجائے، وہاں آخر میں صرف ایک ''آہ'' رہ جاتی ہے۔ میں نے بھی ایک لمبی آہ بھری۔ کچھ بھی ہو، مجھے کسی بھی صورت عینی کی بصارت واپس آنے سے پہلے اپنی سرجری کروانی ہوگی، مجھے اپنے چہرے کو عینی کے بنائے ہوئے مجسمے کی شبیہ میں ڈھالنا ہوگا تاکہ جب وہ اپنی آنکھوں سے دنیا دیکھے تو میں اُسے اُسی طرح نظر آؤں، جیسا وہ مجھے محسوس کرتی ہے۔ گاڑی تیزی سے سڑکوں پر دوڑ رہی تھی اور میرے اندر میرے اپنے ہی متضاد خیالات کی ایک ایسی یلغار جاری تھی، جس نے مجھے پوری طرح نڈھال کر کے رکھ دیا۔ وہ پوری رات عجیب کرب میں گزری اور پھر تنگ آ کر میں نے انٹرنیٹ سے جمع شدہ معلومات کے مطابق پلاسٹک سرجری کے تمام اداروں کو ای میلز کر دیں، جن میں اپنی تازہ ترین تصاویر اور باقی تمام جزئیات بھی تحریر کیں۔ دوسرے دن ہی سے مجھے مختلف اداروں سے جوابات موصول ہونا شروع ہو گئے اور تین دن بعد ان جوابات کے انبار میں سے مجھے اپنے مطلب کے ادارے کا انتخاب کرنا آسان ہو گیا۔ ٹورنٹو کے ایک طبّی ادارے نے پلاسٹک سرجری کے لیے جو لوگو ڈیزائن کیا تھا، اس پر لکھی ایک سطر نے مجھے اسے چُننے پر مجبور کر دیا۔ جس کی تحریر کچھ یوں تھی ''ہم چاہے تقدیریں نہ بدلیں، پَر چہرے بدل دیتے ہیں''۔

میں نے پائن ہل (Pine Hill) نامی اس پلاسٹک سرجری کے ادارے کی تمام تفصیلات اکٹھی کیں اور پھر اس کے سربراہ پال جونز کو ساری تفصیل لکھ بھیجیں۔ چوبیس گھنٹے کے اندر پال کا جواب آ گیا کہ ان کا ادارہ بنیادی طور پر آگ میں جُھلس جانے والوں یا کسی حادثے کے نتیجے میں اپنے اصلی خدوخال کھو دینے والوں کی پلاسٹک سرجری کرتا ہے۔ اور میرا کیس ان کے ادارے کے دائرۂ کار میں نہیں آتا۔ میں نے پال کو دوسری میل بھیجی کہ کیا ان کا ادارہ محبت کرنے والوں کے خواب پورے نہیں کر سکتا؟ میں بھی تو تقدیر نہیں، صرف چہرہ بدلنے کے خواہش مندوں میں شامل ہوں۔ اور اگر وہ چاہتے ہیں کہ میں

اپنی محبت کا کوئی ثبوت پیش کروں تو میں اپنے چہرے کھلسا کر ان کے ادارے کی شرط پر پورا اُترنے کو تیار ہوں۔ میں نے رات گئے یہ میل پال کو بھیجی اور وہیں کرسی پر بیٹھے بیٹھے تھک کر آنکھیں موندلیں، صبح سویرے پرندوں کے شور سے میری آنکھ کھلی تو پال کی میل میرے اِن باکس میں نمایاں تھی۔ میں نے جلدی سے اسے کھولا اور تحریر پر نظریں دوڑائیں۔ وہ میل، پال نے ادارے کے آفیشل میل اکاؤنٹ سے نہیں کی تھی، بلکہ اپنے ذاتی پتے سے بھیجی تھی ''یہ میل میں اپنے ذاتی پتے سے بھیج رہا ہوں۔ تمہاری میل نے مجھے چونکا کر رکھ دیا ہے۔ مشرقی لوگوں کے جذباتی ہونے کے بارے میں تو بہت کچھ سُنا تھا، مگر تمہاری جذباتیت تو دنیا سے جدا ہے، ٹھیک ہے لڑکے، اگر تمہاری یہی ضد ہے، تو میں تمہارے بارے میں کچھ سوچوں گا، لیکن یہ سب کچھ میری ذاتی حیثیت میں ہوگا۔ کیوں کہ میرا ادارہ بہرحال اپنے اصولوں کا پابند ہے۔ میں تمہیں چند ضروری ٹیسٹ لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ پہلے تم اپنے مُلک کے کسی مستند طبّی ادارے سے یہ ابتدائی ٹیسٹ کروا کر مجھے بھیج دو۔ پھر جب تمہارے آنے کی ضرورت پڑی، تو میں تمہیں اطلاع کردوں گا۔ تب تک خدا کے لیے کوئی الٹی سیدھی حرکت مت کرنا۔ تمہارا مخلص، ڈاکٹر پال جونز۔'' میں نے میل پڑھ کر ایک لمبی اطمینان کی سانس بھری۔ گویا میری سمت طے ہوچکی تھی۔ اور سفر چاہے کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو۔ سب سے پہلے اس کی سمت طے ہونا بے حد ضروری ہے۔ بہت عرصے بعد میں نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ انسان زندگی میں بہت سے بوجھ ڈھوتا ہے، مگر ان میں سب سے بھاری بوجھ شاید خود ہماری اپنی سوچ، فکر کا ہوتا ہے۔ دفتر پہنچا تو لِنّی اور ڈائریکٹر پہلے سے میرے انتظار میں بیٹھے تھے۔ لِنّی نے شکوہ کیا کہ میں فلم کے مراحل میں پوری دل چسپی نہیں لے رہا ہوں، جب کہ وہ چاہتی ہے کہ ہر شعبے پر میری ذاتی نگرانی اور گرفت رہے۔ میں نے ان دونوں کو تسلّی دی کہ ہم بہت جلد گانوں کی فلم بندی کے لیے کینیڈا روانہ ہونے والے ہیں۔ دونوں کے چہرے کِھل اٹھے، میں نے سوچ لیا تھا کہ میں یہاں سب کو فلم کے گانوں کی فلم بندی کا بتا کر یونٹ کے ساتھ کینیڈا چلا جاؤں گا، جہاں تین چار مہینے علاج کے لیے رکنے کا کوئی دوسرا بہانہ ڈھونڈنا ہوگا۔ شاید چھ ماہ بھی لگ جائیں، مگر مجھے کسی طور یہ معرکہ سر کرنا ہی تھا۔

اس وقت، مَیں چاہتے ہوئے بھی سرجری کے بعد کے حالات پر کوئی سوچ بچار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہم انسان بہت کوتاہ نظر اور تنزدہن ہوتے ہیں۔ جن فیصلوں میں ہمارے دل کی مرضی شامل ہوتی ہے۔ ان کے اثرات سے نظریں چُرانے میں ذرّہ برابر بھی تامل نہیں کرتے، میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ ایک بار اپنی مرضی کی سرجری کروالوں، بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ میں نے ایک دُور دراز کے بڑے اسپتال سے ڈاکٹر پال کے بتائے ہوئے طبّی تجزیے بھی کروالیے تھے اور اب مجھے ان کی رپورٹس آنے کا شدت سے انتظار تھا۔ مجسمہ بن جانے کے بعد عینی کے گھر جانے کا کوئی خاص بہانہ نہ ہونے کے باوجود میں ہفتے میں ایک آدھ چکر اس کے گھر کا ضرور لگالیتا تھا۔ کچھ گلیاں اور کوچے اپنی سمت بلانے کے بہانے خود تراش لیتے ہیں۔ جانے وہ مَن موہنی سی لڑکی کس طرح چند دنوں ہی میں میرے دل کے ہر خانے پر اپنا قبضہ جما بیٹھی تھی۔ حالاں کہ میں نے تو اس دل کے کواڑ سدا کے لیے بند کر کے چابی کسی دریا میں پھینک دی تھی۔ یا پھر شاید مجھ جیسوں کے دل ہمیشہ کسی مخلص اور مہربان ساتھی کی دستک ہی کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ شام کو دفتر سے اٹھتے وقت اچانک فون پر سنبل کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''آپ جلدی سے شوکت خانم اسپتال پہنچیں۔ آپ کے دوست کی طبیعت بگڑ گئی ہے''۔ میں سب چھوڑ چھاڑ کر کبیر کے ساتھ اسپتال کی طرف بھاگا۔ راہ داری میں کمرے کی طرف جاتے ہوئے میرے قدموں سے جان نکلتی جارہی تھی۔ ناساز کا رنگ سرسوں کی طرح پیلا پڑ چکا تھا۔ اس نے آہٹ پر آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھ کر خشک سوکھے پتے جیسے ہونٹوں سے بہ مشکل مُسکرایا۔ رستہ روک رہی ہے، تھوڑی جان ہے باقی...... جانے ٹوٹے دل میں کیا ارمان ہے باقی...... جانے بھی دے اے دل...... سب کو میرا سلام...... میں چلا، مَیں شاعرِ بدنام...... مَیں چلا محفل سے ناکام...... مَیں چلا......'' میں نے لپک کر اس کا ہاتھ تھام لیا ''کہیں نہیں جارہے ہو تم، سُنا تم نے، میں اس شاعر کو کہیں نہیں جانے دوں گا''۔ اس کے سرہانے کھڑی سنبل اور استاد بنّے کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ وہ بہ مشکل آنکھیں کھول کر بولا ''دیکھا پَری زاد پیارے، یہ تو واقعی اُسی فلم کا سین بن گیا یار۔ لگتا ہے، جیسے میری کہانی ڈائریکٹر نے تیس چالیس سال پہلے فلمادی تھی، مگر یار، میں بہت تکلیف میں ہوں۔ یہ جان تو نکلتے نکلتے جان نکال دیتی ہے''۔ میں نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا ''چُپ ہوجاؤ، خود کو نڈھال مت کرو''۔ ''نہیں پیارے، بولنے دو مجھے۔ بس آخری تھکن ہے، اس کے بعد تو آرام ہی آرام ہے''۔ ناساز نے سنبل کی طرف دیکھا ''یہ کہانی بھی اُدھوری رہ گئی پَری زاد۔ میرے جانے کے بعد ان باپ بیٹی کا پورا خیال رکھنا۔ اور جب تمہاری فلم ریلیز ہو تو اس کے ٹائٹل میں میرا نام......'' ناساز بولتے بولتے اچانک خاموش ہوگیا۔ میں نے گھبرا کر اس کا چہرہ تھپتھپایا ''ناساز...... چُپ کیوں ہوگئے، بولتے کیوں نہیں...... تم ہم سب کو اتنا بڑا دھوکا دے کر نہیں جاسکتے، بولو، بے وفا، دغا باز...... کچھ تو بولو...... بات کرو......'' میری چیخیں سارے اسپتال میں گونج رہی تھیں۔ استاد بنّے نے اسپتال کے عملے کی مدد سے مجھے ناساز کے بے جان جسم سے دُور کردیا۔ میں چیختا چلاتا رہ گیا۔ استاد بنّے نے دبوچ کر مجھے گلے لگالیا ''چُپ کر جاؤ...... ناساز اب کبھی نہیں بولے گا، وہ مرچکا ہے''۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ’’خدا اور محبت‘‘ اور ’’بچپن کا دسمبر‘‘ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ’’عبداللہ‘‘ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ’’عبداللہ‘‘ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

’’پری زاد‘‘ ایک اچھوتے، حسّاس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ’’سنڈے میگزین‘‘ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

ناساز کے جانے کے بعد میرا دل ہی اٹھ گیا، کسی کام میں مَن نہیں لگ رہا تھا میرا، بس سارا دن اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔ ناساز کا چہرہ آنکھوں کے سامنے سے ہٹتا ہی نہیں تھا۔ کچھ لوگ اپنی تقدیر میں صرف درد ہی لکھوا کر لاتے ہیں۔ سُکھ کی سیاہی شاید ان کی باری آنے سے پہلے ہی خشک ہو جاتی ہے۔ اور پھر ایسی ہی ایک اُداس شام، جب میں اپنے اندھیرے کمرے میں بیٹھا قسمت کے اس ہیر پھیر سے متعلق ہی سوچ رہا تھا، تو عینی آ گئی۔ ’’کیوں سزا دے رہے ہیں خود کو، ہم میں سے کوئی بھی ناساز کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا، اس کا جانا طے تھا، سو وہ چلا گیا۔ مگر ہم سب ابھی یہیں ہیں، ہماری خاطر ہی سہی، خود کو سنبھالیں‘‘۔ میں نے اپنی نم آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ ’’اگر سب کا جانا طے ہی ہے، تو پھر ہم سب ایک ساتھ ہی کیوں نہیں چلے جاتے، یہ باریاں کیوں لگا دی گئی ہیں‘‘۔ عینی میرے قریب بیٹھ گئی۔ ’’باریاں اس لیے لگائی گئی ہیں کہ ہم جانے والوں کے بعد ان کے اپنوں کا دھیان رکھیں۔ آپ شاید بھول رہے ہیں کہ وہ سنبل اور استاد بنّے خان کی ذمّے داری آپ پر ڈال گئے ہیں۔ کیا انہیں یونہی تنہا چھوڑ دیں گے پری زاد‘‘۔ کیا ستم ہے کہ ہوا کے سب رستے، سب درزیں بند کر دینے کے بعد، زندگی ہمیں سانس لینے پر بھی مجبور کرتی ہے، کیوں کہ جینا تو ہے۔ ہاں، جینا تو پڑے گا، مزید ستم سہنے کے لیے، نئے گھاؤ جھیلنے کے لیے۔

اگلے ایک ہفتے میں شہر کی ایک نئی بستی میں استاد بنّے خان کے لیے ایک گھر کا انتظام کر دیا گیا، جہاں وہ اپنی موسیقی کی اکیڈمی اور کلاسز بھی شروع کر سکتے تھے۔ کمالی نے اس سارے معاملے میں بہت پُھرتی دکھائی اور دو ہفتوں بعد ہی میوزک اکیڈمی کا اشتہار بھی شہر کے بڑے اخباروں کے پہلے صفحے پر لگ گیا، مجھے یقین تھا کہ اب ان باپ بیٹی کو اپنی گزر بسر کے لیے کسی کے آگے سوال دراز کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میری اس عرصے میں خود سے خود کی ملاقات بہت کم ہو پائی تھی، مگر جیسے ہی زندگی میں کچھ ٹھہراؤ آیا اور میں نے جانے کتنے دن بعد آئینہ دیکھا، تو مجھے ایک دم ہی ڈاکٹر پال کی یاد آ گئی۔ میں نے اپنی ای میل کھولی تو ڈاکٹر پال کی تین میلز آ چکی تھیں، جس میں اس نے میرے کروائے گئے طبّی تجزیوں کے بارے میں پوچھا تھا۔ میں نے اگلی صبح ہی رپورٹ لے کر اُسے ای میل کر دی۔ کمالی اس عرصے میں فلم یونٹ سے مسلسل رابطے میں تھا، اور مجھے وقتاً فوقتاً پیش رفت سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ کینیڈا میں فلم بندی کے انتظامات بھی وہ مکمل کر چکا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کینیڈا روانگی سے قبل عینی سے اپنے دل کی بات کہہ دوں گا۔ میں اس سے کہہ دوں گا کہ اب اس زندگی کے تپتے صحرا میں تنہا چلتے چلتے میرے پاؤں اتنے آبلہ پا ہو چکے ہیں کہ خود میرے قدموں کے چھالے مجھے دُہائی دیتے ہیں کہ انہیں اب کسی ہم سفر کے ساتھ کی چھاؤں درکار ہے۔ میں اس سے پوچھوں گا کہ کیا وہ میری عُمر بھر کی ہم سفر بننا قبول کرے گی، کیا وہ مجھے اس اعزاز کے قابل سمجھتی ہے، کیا وہ میری تمام زندگی کی محرومیاں ختم کر کے مجھے اپنا سکتی ہے......؟ میں نے راستے میں گاڑی رکوا کر پھول والے سے عینی کے لیے ایک گل دستہ بنوانے کا سوچا، لیکن پھر بہت دیر تک وہاں کھڑا پھولوں کا انتخاب کرتا رہا، دنیا کے سارے پھول پنکھڑیوں سے جُڑ کر بنتے ہیں، مگر جب خود کسی پنکھڑی جیسی کو گلاب پیش کرنا ہو تو کوئی چناؤ کیسے کرے۔ ہر پھول اس کے سامنے ہیچ لگتا تھا۔ ہر رنگ اس کے آگے پھیکا پڑ جاتا تھا۔ مجبوراً مجھے کچھ پھیکے رنگوں والے کم صورت گلابوں ہی پر اکتفا کرنا پڑا۔ مدمقابل جب ’’گلاب تر‘‘ ہو تو پھولوں کو بھی ہار ماننا ہی پڑتی ہے۔

میں بہت دیر اس کے گھر کے دروازے پر کھڑا رہ کر اپنی الجھتی سانسیں درست کرتا رہا۔ ایسے لگ رہا تھا، جیسے حُسن کی عدالت میں یہ میری پہلی پیشی ہے۔ دوسری گھنٹی کے جواب میں اندر سے قدموں کی آہٹ اُبھری اور میں سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ گل دستے پر میری گرفت سخت ہو گئی اور پھر دروازہ کُھلا تو میرا ہاتھ ہوا ہی میں بلند رہ گیا۔ اندر سے نکلنے والا نوجوان میرے لیے قطعی اجنبی تھا۔ ’’جی فرمایئے، کس سے ملنا ہے آپ کو؟‘‘ میں اُسے دیکھتا رہ گیا، لمبا قد، کِھلتی رنگت، بکھرے بکھرے سے بال، گہری سیاہ آنکھوں میں عجیب سی کشش آمیز چمک، وہ مردانہ وجاہت کا پیکر تھا۔ وہ خوبرو، بااعتماد اور مغرور سا دہ لڑکا مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ میرا گل دستے والا ہاتھ میکانکی طور پر خود بخود پیچھے چلا گیا۔ میں نے گڑبڑا کر اس سے پوچھا ’’تم کون ہو......؟‘‘ وہ لڑکا ہنس پڑا۔ ’’لو، وہ بھی ہم سے پوچھتے ہیں......؟ جناب ہم اپنا تعارف خود آپ ہیں۔ ڈاکٹر عدنان کہتے ہیں مجھے، یہ میری خالہ کا گھر ہے اور میں آج ہی یہاں نازل ہوا ہوں۔ اب آپ بتائیں کہ آپ کون ہیں؟‘‘ میں نے اپنے ڈولتے دل کو سنبھالا۔ ’’میں عینی کا دوست ہوں، پری زاد نام ہے میرا‘‘۔ عدنان نے غور سے مجھے دوبارہ دیکھا اور پہلے لفظ کو کافی لمبا کرتا ہوا بولا ’’اچھا......تو آپ ہیں پری زاد...... گریٹ...... سر کھا لیا ہے، اس پاگل لڑکی نے صبح سے آپ کا ذکر کر کر کے۔ سچ بتاؤں، تو میں آپ سے جیلس ہو رہا تھا‘‘۔ میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا وہ زور سے ہنس پڑا۔ بُرا مت مانیے گا، مذاق کی عادت ہے میری۔ اندر آئیں ناں۔ باہر کیوں کھڑے ہیں۔ خالہ اور عینی اندر ہی ہیں‘‘۔ میں چُپ چاپ اس کھلنڈرے سے لڑکے کے پیچھے اندر داخل ہو گیا، پھر ہاتھوں میں پکڑا گل دستہ نہ جانے کب میرے ہاتھ سے کمرے کے گل دان میں منتقل ہو گیا۔ کچھ دیر بعد عینی بھی آ گئی، وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ ’’ارے آپ آ گئے پری زاد......دیکھیں، کون آیا ہے۔ میرے بچپن کا ساتھی۔ میرا سب سے بہترین دوست، میرا کزن عدنان۔ سچ بتائیں، اس نالائق کو دیکھ کر ذرا بھی نہیں لگتا ناں کہ یہ ڈاکٹر ہو گا۔ حرکتیں تو ابھی تک وہی گلی کے آوارہ لڑکوں جیسی ہیں اس کی‘‘۔ عدنان نے زوردار قہقہہ لگایا ’’تو گلی کا لڑکا ہی تو ہوں۔ تمہاری گلی کا ایک آوارہ، جو گھنٹوں دوپہر میں تمہارا کالج سے واپسی کا انتظار کیا کرتا تھا۔ یاد ہے ناں نجی......‘‘ وہ دونوں زور سے ہنس پڑے، جانے کیوں ٹھیک اُسی لمحے میں نے خود کو وہاں بے حد اجنبی سا محسوس کیا، کل تک یہی در و دیوار مجھے کتنے مانوس، کتنے مہربان سے محسوس ہوتے تھے، اور آج ایک اجنبی کے آ جانے سے میں خود بیگانہ سا ہو رہا تھا۔ عینی نے مجھے بتایا کہ عدنان نے طب کی تعلیم کے بعد آنکھوں کی فیلڈ میں اسپیشلائز کیا ہے اور اب اس کی پوسٹنگ اسی شہر میں ہو چکی ہے۔ عدنان کی باتوں سے میں نے محسوس کیا کہ وہ خود بھی پوری تن دہی سے عینی کی آنکھوں کے علاج کی کوئی صورت نکالنے میں جُتا ہوا ہے۔ عدنان اور عینی ایک دوسرے سے بہت بے تکلّف محسوس ہوتے تھے اور دونوں ایک دوسرے پر وار کرنے کا کوئی موقع جانے نہیں دے رہے تھے۔ جب تک عینی کی ماں رات کے کھانے کے انتظام کے لیے باورچی خانے میں مصروف رہیں، دونوں بچپن کی باتیں یاد کر کے ہنستے رہے۔ عینی نے عدنان کو ٹوکا ’’بس بس...... رہنے دو یہ تابع داری کی باتیں، خوب جانتی ہوں میں کہ جناب کڑی دوپہروں میں کس کے لیے دھوپ چاٹا کرتے تھے۔ کیا نام تھا اس عینکی کا۔ ہاں، نگہت اور وہ دوسری چھپکلی، مہ وش اور وہ تیسری......‘‘ عدنان نے جلدی سے اسے روکا۔ ’’اوہو، بس بھی کرو، وہ بچپنا تھا میرا......اور ایسی دو چار معاشقے نما دوستیاں تو سبھی کرتے ہیں لڑکپن میں۔ کیوں پری زاد صاحب، ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں میں، آپ نے بھی کی ہوں گی۔ کچھ خواب تو پالے ہوں گے، اس عُمر میں آپ نے بھی......‘‘ میں نے غور سے عدنان کی طرف دیکھا۔ ’’نہیں ڈاکٹر صاحب! خواب پالنے کے لیے نیند کے کچھ خوب صورت

"پالنے" بھی ضروری ہوتے ہیں۔ میں تو آج تک نیند کا وہ "پالنا" ہی ڈھونڈ رہا ہوں۔ نیند آجائے تو شاید کبھی خواب بھی پال سکوں"۔ عدنان نے چونک کر میری طرف دیکھا "واہ، میری پیاری کزن یونہی آپ کی اتنی تعریفیں کرتے نہیں تھکتی، بڑی گہری بات کہہ دی آپ نے"۔ میں اٹھ کھڑا ہوا "اب میں اجازت چاہوں گا۔ ان شاء اللہ پھر ملاقات ہوگی"۔ وہ دونوں بوکھلا سے گئے۔ عینی جلدی سے بولی "ارے، آپ کہاں چل دیے، امّی نے کھانا لگا دیا ہے اور آپ نے تو آنے سے پہلے فون پر کہا تھا کہ آپ کو مجھ سے کوئی بہت ضروری بات کرنی ہے، بتائیں ناں......؟" عدنان نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے جلدی سے بات بنائی "ارے ہاں، یاد آیا۔ فلم کا یونٹ کینیڈا جا رہا ہے۔ شاید میں بھی جاؤں، سوچا تم سے بھی پوچھ لوں"۔ عینی خوشی سے چلائی "واہ زبردست! کاش میں بھی ساتھ چل سکتی، مگر اب یہ صاحب جو تشریف لے آئے ہیں، میرے دشمنِ جاں...... یہ مجھے کہاں جانے دے گا اب"۔ میں نے چونک کر عینی کی طرف دیکھا "کیوں؟" عدنان نے جلدی سے دخل دیا۔ "پری زاد صاحب! آپ ہی سمجھائیں اس لڑکی کو۔ میں نے امریکا کے ایک بڑے طبّی ادارے سے عینی کی آنکھوں کے میچنگ لینز کی بات کی ہے، وہ لوگ نوّے فی صد پُر امید ہیں کہ وہ یہ آپریشن کر سکتے ہیں اور انہیں مشابہت والا قرنیہ بھی مل جائے گا، کیوں کہ آج کل باہر کے ملکوں میں عموماً سزائے موت کے قیدی یا بسترِ مرگ پر پڑے مریض اپنے اعضاء مرتے وقت دان کر جاتے ہیں یا اپنے بیوی بچّوں کی آئندہ کفالت کے لیے بھاری رقم کے عوض بیچ دیتے ہیں۔ میں نے عینی کے میچنگ لینز کے لیے ایسے کئی اداروں میں رجسٹریشن کروا رکھی ہے اور وہ لوگ قرنیہ ملتے ہی ہمیں اطلاع کر دیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ ایسے وقت میں عینی کی غیر موجودگی کی وجہ سے ہمیں دیر ہو جائے"۔ عینی نے حتمی لہجے میں کہا۔ "خواب دیکھنا چھوڑ دو مائی ڈیئر کزن ڈاکٹر عدنان! پہلے تو یہاں سے امریکا جانے کے لیے ہی لاکھوں روپے چاہیے ہوں گے، اور پھر ڈونیشن اور آپریشن کا خرچ الگ۔ کہاں سے آئیں گے اتنے روپے......؟ اور تم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ میں صرف اپنی جمع کی ہوئی رقم ہی سے اپنا آپریشن کرواؤں گی۔ اور ہم دونوں یہ بات بہت پہلے طے کر چکے ہیں۔ سو نو مور بحث اوکے......" وہ دونوں بچّوں کی طرح بحث کرتے رہے۔ میں نے عینی سے اجازت چاہی اور بھاری قدموں سے وہاں سے اٹھ آیا۔

سارے راستے ان دونوں کی نوک جھونک میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ عدنان کو عینی سے بے تکلف ہوتے دیکھ کر ایک عجیب سی بے چینی میرے رگوں میں پھیلتی جا رہی تھی۔ مگر خود عینی بھی تو اس کے ساتھ اتنی ہی بے تکلفی سے پیش آ رہی تھی۔ جنہیں ہم چاہتے ہیں، وہ کسی اور سے بے تکلف ہو کر بات کریں تو ہمارے خون کی گردش کیوں تھمنے لگتی ہے۔ کانٹوں جیسی چُبھن اور کسک ہمارے وجود کو کیوں چھلنی کرنے لگتی ہے؟ کیا اسی کو رقابت کہتے ہیں۔ ساری رات میں اپنے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ یہ رقابت تو محبت سے بھی زیادہ جان لیوا آزار ہے۔ اگلے روز ٹیلی فون کی ہر گھنٹی پر میں چونک چونک جاتا۔ مگر عینی تو جیسے عدنان کے آنے کے بعد بہت زیادہ مصروف ہو گئی تھی۔ مجھے چڑچڑاہٹ سی ہونے لگی اور میرا عملہ اس کا نشانہ بننے لگا۔ کمالی نے یہ بات نوٹ کر لی اور تیسرے دن ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا کہ مجھے کوئی پریشانی ہے۔ میں اُسے کیا بتاتا، مجھے تو خود پتا نہیں تھا کہ میرے اندر کیا چل رہا ہے۔ مگر چوتھے روز جب میرے پی اے نے جب مجھے اطلاع دی کہ "مس قرۃ العین آپ سے ملنے آئی ہیں" تو ایک لمحے میں ساری بے چینیاں، ساری بے تابیاں جانے کہاں ہوا ہو گئیں اور میں تیزی سے ملاقاتی کمرے کی طرف لپکا، مگر وہ تنہا نہیں آئی تھی۔ عدنان بھی اس کے ساتھ تھا۔ میری آہٹ سنتے ہی وہ ناراضی سے بولی "کہاں غائب ہیں آپ، تین دن سے، نہ کوئی فون نہ کوئی خیر خبر۔ میں آپ سے سخت ناراض ہوں۔ جان لیں اچھی طرح"۔ میں نے مصروفیت کا بہانہ کیا، مگر وہ روٹھی رہی، عدنان نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ "بڑی ضدی ہے یہ بچپن سے سر۔ مجھ سے پوچھیے؟" میں نے گہری نظروں سے اس حُسنِ ناراض کو دیکھا، سفید لباس اور سیاہ دوپٹے میں وہ نور کا ایک ہالہ لگ رہی تھی۔ "چلو کچھ جرمانہ طے کر دو، میری غیر حاضری کا"۔ آخر کار، بات یوں بنی کہ مجھے اُن دونوں کو رات کے کھانے پر شہر کے ایک مشہور اوپن ائر ریستوران میں مدعو کرنا پڑا۔ عدنان نے جاتے وقت عینی کے کمرے سے نکلتے ہی جلدی سے مجھے بتایا کہ عینی کے لیے میچنگ لینسز کا انتظام ہو گیا ہے۔ مگر عینی جانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ عدنان نے دبے لفظوں میں مجھ سے رات کو عینی کو منانے کی درخواست کی۔ وہ اپنا آبائی گھر بیچ کر عینی کا علاج کروانا چاہتا تھا۔ ان کے جانے کے بعد پھر سے وہی ہزار خدشے، ہزار وسوسے، مجھے یوں لگ رہا تھا، جیسے میری محبت ریت کے ذرّوں کی طرح میری مُٹھی سے نکلتی جا رہی ہے۔ رات کو ریستوران کی ٹیبل پر وہ دونوں مجھ سے پہلے موجود تھے۔ کتنے مکمل لگتے تھے، وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ، جیسے دو ہنسوں کا جوڑا ہو۔ کوئی ہم تینوں کو وہاں ایک ساتھ بیٹھے دیکھتا، تو اسے میرا وجود ہی اضافی لگتا۔ عدنان کی کوئی فون کال آئی تو وہ اٹھ کر ذرا فاصلے پر چلا گیا۔ عینی نے میری خاموشی محسوس کر لی۔ "آپ اتنے چپ چپ سے کیوں ہیں پری زاد...... آج دن کو بھی میں نے محسوس کیا تھا کہ آپ گم صُم سے ہیں"۔ "نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، تم عدنان کی بات مان کیوں نہیں لیتیں۔ وہ تمہارے ہی بھلے کی بات کر رہا ہے"۔ عینی نے لمبی آہ بھری "اچھا...... تو ڈاکٹر صاحب کا جادو آپ پر بھی چل گیا"۔ میں نے دھیرے سے کہا۔ "ہاں، وہ ہے ہی ایسا جادوگر۔ آج کل چاروں طرف مجھے اسی کا سحر محسوس ہوتا ہے"۔ عینی ہنس دی۔ "ہاں، ٹھیک کہا آپ نے، پتا ہے پری زاد، میں نے سات سال کی عُمر کے بعد عدنان کو نہیں دیکھا، جانے اب کیسا دکھتا ہوگا۔ پہلے تو ہر وقت مٹی میں اَٹا رہتا تھا۔ بڑی مار پڑتی تھی اُسے خالہ سے۔ آپ کو ایک بات بتاؤں پری زاد۔ میری زندگی کی بہت بڑی خواہش تھی کہ جب بھی میری بینائی واپس آئے،

میں سب سے پہلے عدنان ہی کو دیکھوں۔ ہاں، مگر اب اس فہرست میں ایک اور ہستی بھی شامل ہو چکی ہے، اور وہ آپ ہیں پری زاد...... اب میں عدنان کے ساتھ آپ کو بھی پہلی نظر میں دیکھنا چاہتی ہوں"۔ میرا دل چاہا کہ اس سے کہوں کہ کہاں ہیرے اور کوئلے کو ایک ہی صف میں کھڑا کر رہی ہو۔ دیکھے جانے کے قابل صرف عدنان ہے۔ اتنے میں عدنان بھی واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ "جی پری زاد صاحب! کچھ آیا اس پگلی کی عقل میں یا نہیں۔ اسے سمجھائیں کہ اپنوں کے خلوص کو یوں ٹھکرایا نہیں کرتے"۔ عینی نے احتجاج کیا۔ "ایسی بات نہیں ہے، تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ تمہارے پاس تمہارے آبائی گھر کے علاوہ اور ہے ہی کیا۔ اور پھر ہم دونوں کے بچپن کی اور خالہ کی کتنی یادیں وابستہ ہیں اُس گھر سے، میری نظر میں وہ سب یادیں میری بینائی سے بہت زیادہ اہم ہیں۔ بس، ہو گیا فیصلہ۔ تم وہ گھر کبھی نہیں بیچو گے۔ اور اگر کبھی تم نے ایسا کیا تو ساری زندگی مجھ سے بات مت کرنا"۔ عدنان نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا، میں نے دخل اندازی کی "تم دونوں خوامخواہ جھگڑ رہے ہو۔ عینی پر میری دوستی کے بھی کچھ قرض باقی ہیں اور مَیں اسی دوستی اور رشتے کے حق سے آج یہاں یہی کہنے آیا ہوں کہ عینی کے علاج کا تمام خرچہ میں برداشت کروں گا، کیا میرا اتنا بھی حق نہیں ہے"۔ "نہیں پری زاد! ایسا مت کہیں، میں آپ سے رقم نہیں لوں گی۔ میں نے زندگی بھر ایک یہی خودداری کا بھرم ہی تو کمایا ہے۔ کیا آپ دونوں مجھ سے میری عُمر بھر کی یہ واحد کمائی بھی چھین لینا چاہتے ہیں۔ کیا فائدہ ایسی بینائی کا کہ جس کے ملنے کے بعد بھی میری نظر تمام عُمر جھکی رہے۔ پلیز، آپ ایسا نہ کریں"۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ "ٹھیک ہے، اگر تمہاری یہی مرضی ہے، تو یوں ہی سہی، مگر پھر تمہیں میری بھی ایک بات ماننا ہوگی۔ مَیں عُمر بھر تمہاری خودداری کا یہ بھرم قائم دیکھنا چاہتا ہوں، لیکن تمہارا علاج بھی اسی قدر ضروری ہے، لہٰذا میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ فی الحال عدنان کا آبائی گھر مَیں خرید لوں گا۔ مکان کی رقم سے عدنان تمہارا علاج مکمل کروائے گا، لیکن تم دونوں کے بچپن کی یادوں کا مسکن وہ گھر، میرے پاس عدنان کی امانت کے طور پر رہے گا۔ عدنان جب بھی رقم جمع کرے گا، مجھ سے اپنا مکان واپس لے سکتا ہے"۔ عینی نے بے چینی سے پہلو بدلا "لیکن......" "کوئی اگر، مگر، لیکن نہیں سنوں گا مَیں، بس طے ہو گیا۔ تم لوگ جانے کی تیاری کرو، آج کل ویسے بھی اچھے ڈاکٹروں کا کال پڑا ہے۔ مجھے یقین ہے عدنان کچھ ہی برس میں اپنا مکان واپس حاصل کر لے گا"۔ عدنان نے خوشی سے ہاتھ پر ہاتھ مارا "یہ ہوئی ناں بات۔ مجھے یقین تھا اس مسئلے کا آپ ہی کوئی نہ کوئی حل نکالیں گے۔ آپ واقعی کمال ہیں پری زاد صاحب......"

اس وقت تو عینی خاموش رہی، لیکن رات گئے اس کا نمبر میرے موبائل فون پر جگمگانے لگا ''پَری زاد! میں آپ کے فیصلے سے مطمئن نہیں ہوں، میں جانتی ہوں آپ میری خاطر یہ سب کچھ کر رہے ہیں''۔ میں نے بات مذاق میں ٹالی۔ ''نہیں بے وقوف لڑکی! تمھیں نہیں پتا کہ پراپرٹی کی قیمتیں آج کل آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ عدنان کا گھر لے کر میں نے کوئی گھاٹے کا سودا نہیں کیا۔ دیکھ لینا، عدنان رقم چُکا نہ سکا، تو دس گنا زیادہ قیمت پر بیچ دوں گا۔ تم نے پَری زاد کو بے وقوف سمجھ رکھا ہے کیا؟'' وہ ہنس پڑی۔ ''آپ ہمیشہ گھاٹے کا سودے ہی کرتے ہیں۔ اچھا ٹھیک ہے، لیکن آپ کو میری شرط یاد ہے ناں۔ جب کبھی میں دنیا دوبارہ دیکھوں، تو میری پہلی نظر کے فریم میں آپ کو ضرور موجود رہنا ہوگا۔ بولیں، قبول ہے تو ٹھیک، ورنہ ابھی منع کرتی ہوں عدنان کو کہ گھر کے کاغذات نہ بنوائے آپ کے لیے''۔ میں نے جلدی سے حامی بھری۔ ''ٹھیک ہے ضدی لڑکی، مگر دیکھو، اب مزید کوئی بہانہ مت کرنا۔ جیسا تم چاہتی ہو، ویسا ہی ہوگا''۔ میں نے عینی کو تو تسلی دے دی، مگر خود میرا چین وسکون ہمیشہ کے لیے ہَوا ہو گیا۔ ساری رات میں یہی سوچ کر لان میں ٹہلتا رہا کہ آنکھیں مل جانے کے بعد عینی جب مجھے دیکھے گی، تو اس کا ردِعمل کیا ہوگا۔ صبح سویرے عدنان اپنے گھر کے کاغذات بنوا کر لے آیا۔ میں نے رقم کا چیک عدنان کے حوالے کیا، تو خوشی سے اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ عدنان اٹھ کر جانے لگا تو میں نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ ''سنو عدنان......'' وہ پلٹا تو میں نے اس کے گھر کے کاغذات اس کے ہاتھ میں تھما دیے۔ ''یہ گھر تمہارا تھا، اور ہمیشہ تمہارا ہی رہے گا۔ میں نے صرف عینی کو منانے کے لیے یہ گھر خریدنے کا ڈراما کیا تھا۔ عینی کی آنکھیں واپس آجائیں، اس سے زیادہ مجھے کچھ اور نہیں چاہیے، البتہ یہ مکان والا راز عینی کے لیے ہمیشہ راز ہی رہے گا''۔ عدنان کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ ''میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں پَری زاد صاحب! میں دن رات محنت کر کے آپ کی ایک ایک پائی واپس کردوں گا۔ یقین جانیے، یہ رقم مجھ پر ہمیشہ قرض رہے گی''۔ میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ہمارا بھی اس لڑکی پر کچھ حق ہے ڈاکٹر صاحب، کچھ قرض ہم پر بھی واجب ہیں ابھی''۔ عدنان جاتے جاتے ایک بار پھر پلٹا۔ ''آپ کو میں ہر لمحے کی خبر دیتا رہوں گا۔ ہم اگلے ہفتے ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے، مگر عینی کی آنکھوں کی پٹی کُھلنے سے پہلے آپ کو بھی امریکا پہنچنا ہوگا، ورنہ وہ ضدی لڑکی آپریشن ہی نہیں کروائے گی۔ بہت مان دیتی ہے وہ آپ کو۔ اس نے آپریشن کے لیے ''ہاں'' بھی صرف آپ کے کہنے ہی پر کی ہے''۔ میں نے عدنان کی آنکھوں میں تارے سے جگمگاتے دیکھے۔ اور یہ ستارے مجھے ہر بار اس کی آنکھوں میں تب دکھائی دیتے تھے، جب وہ عینی کا ذکر کرتا تھا۔ ''آپ جانتے ہیں پَری زاد صاحب۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جس دن عینی پہلی بار یہ رنگین دنیا دیکھے گی، میں اُسی دن اُسے شادی کے لیے پروپوز کردوں گا۔ میں جانے کب سے اس دن کا انتظار کر رہا ہوں''۔ میرے سَر پر جیسے ساری عمارت دھڑام سے گر گئی۔ میں نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ ''کیا...... میرا مطلب ہے کیا عینی کو بھی اس بات کی خبر ہے؟'' عدنان نے جیسے خوابوں کی بستی سے جواب دیا۔ ''ہاں، وہ بھی جانتی ہے کہ میں ہمیشہ سے اُسے اپنا ہم سفر بنانا چاہتا ہوں، مگر وہ یہ نہیں جانتی کہ میں کس دن یہ پروپوزل اس کے سامنے رکھوں گا۔ میری مرحومہ ماں اور میری خالہ کی بھی ہمیشہ ہی سے یہی خواہش تھی۔ بس اب وہ دن بھی قریب ہے۔ چلتا ہوں، بہت سے کام اُدھورے پڑے ہیں''۔ عدنان پلٹ کر چلا گیا۔

میرا سَر بُری طرح چکرا رہا تھا، میں وہیں کرسی ہی پر ڈھیر ہو گیا۔ کچھ دیر میں کمالی کسی کام سے اندر آیا تو میری حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ ''آپ ٹھیک تو ہیں سر......؟'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''کمالی! میں گھر واپس جا رہا ہوں۔ مجھے ڈسٹرب مت کرنا''۔ میں دروازے تک پہنچ کر رُک گیا۔ کمالی ابھی تک گم صم سا کھڑا تھا۔ ''کمالی! تم نے کہا تھا کہ کبھی تم نے بہت ٹوٹ کر کسی سے محبت کی تھی، تو کیا اس محبت کا کوئی رقیب بھی تھا؟'' کمالی نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''نہیں سر! خوش قسمتی سے رقابت کا زہر میں نے کبھی نہیں پیا۔ مگر سُنا ہے کہ محبت کی اصل روح تبھی ظاہر ہوتی ہے، جب کوئی رقیب درمیان میں پڑتا ہے''۔ میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کمالی سے پوچھا۔ ''رقیب کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے کمالی؟'' ''رقیب کے ساتھ رقابت کرنی چاہیے سر۔ رقیب پر رحم کھانے والا دراصل اپنی محبت کے ساتھ مخلص نہیں ہوتا''۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''لیکن محبت تو محبت ہوتی ہے، کوئی جنگ نہیں''۔ کمالی مسکرا دیا ''محبت میں رقابت سے بڑی جنگ بھلا اور کیا ہوگی، اس دنیا میں سَر...... اور آپ نے سُنا تو ہوگا کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے''۔ میں دفتر سے باہر نکلا تو رقابت کا زہر میرے پورے وجود میں اپنے پنجے گاڑنا شروع کر چکا تھا۔ جانے کب دن ڈھلا اور کب رات ہوئی۔ میرا سارا جسم جل رہا تھا۔ کبیر نے رات گئے جب گھر کے دروازوں اور گیٹ کو تالا لگانے کی اجازت چاہی تو میری آنکھیں اس پر جم گئیں۔ ''کبیر خان تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو......؟'' کبیر نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''ہم جان لے سکتا ہے اور جان دے بھی سکتا ہے صاحب......''۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ’’خدا اور محبت‘‘ اور ’’بچپن کا دسمبر‘‘ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ’’عبداللہ‘‘ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ’’عبداللہ‘‘ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

’’پری زاد‘‘ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ’’سنڈے میگزین‘‘ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:
sundaymagazine@janggroup.com.pk

کبیر خان کچھ دیر تک میرے جواب کا انتظار کرتا رہا ’’آپ حکم کرو صاب...... کبیر خان کا جان بھی حاضر ہے، آپ کے لیے‘‘۔ میں اپنے خیالات سے چونکا ’’ہاں...... فی الحال کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی کچھ خیال آ گیا تھا، تم جاؤ، رات بہت ہو گئی ہے۔ تمہاری گھروالی راہ دیکھتی ہو گی تمہاری‘‘۔ کبیر کچھ کہتے کہتے رُک گیا اور اُلجھن زدہ سا وہاں سے چلا گیا۔ یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ میرے اندر یہ کیسی عجیب سی ایک جنگ چِھڑنے لگی تھی۔ جیسے میرا وجود دو حصّوں میں تقسیم ہوتا جا رہا ہو۔ میرے اندر ایک نیا ’’پَری زاد‘‘ جنم لینے لگا تھا، جو مجھے رقیب سے رقابت کے سبق سکھا رہا تھا۔ وہ سارا دن میرے اندر بولتا رہتا۔ یہ کیا کرنے جا رہے ہو احمق انسان، خود اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھودنے کا انتظام خوب کیا ہے تم نے، اب تمہاری رقم سے عدنان عینی کی آنکھوں کا علاج کروائے گا اور پھر جب وہ لڑکی تمہیں اس شہزادے کے پہلو میں کھڑا دیکھے گی، تو فیصلہ کس کے حق میں ہو گا، یہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ ٹھیک ہی کہا تھا عدنان نے، وہ بہت مان دیتی ہے مجھے، مگر صرف مان، عزت اور تعظیم۔ اور میں نہ جانے کیا سمجھ بیٹھا تھا۔ جس تبسّم کو میں اپنے مقدر کی پھوار سمجھا تھا، وہ تو اس کی عادت نکلا۔ چار دن اس نے مجھ سے ہنس کر بات کیا کرلی اور ذرا سا اپنا وقت مجھ پر صرف کیا کر دیا، میں تو اس کی محبت کا حق دار سمجھ بیٹھا تھا خود کو، احمقوں کی جنت کا سردار تھا میں۔ کتنا بڑا دھوکا کھایا تھا، اپنے اس سدا کے غدار دل کے ہاتھوں میں نے۔ میں وہ منافق تھا، جسے سو بار ایک ہی سوراخ سے ڈسا گیا۔ جی چاہ رہا تھا کہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنا سینہ چیر کر اس بے وفا قلب کو باہر نکالوں اور اپنے قدموں تلے اُس وقت تک روندتا رہوں، جب تک کہ زندگی کی آخری رمق بھی ختم نہ ہو جائے۔

اگلے دن میں گھر سے نکلا تو جانے کہاں کہاں بھٹکتا رہا اور پھر ایک ہوٹل کا بورڈ دیکھ کر ڈرائیور کو گاڑی اُس طرف موڑنے کو کہہ دیا۔ میں کچھ دیر تنہا بیٹھنا چاہتا تھا اور کبھی کبھی تنہائی ہمیں صرف لوگوں کے ہجوم ہی میں ملتی ہے۔ ویرانوں میں تو ہم اپنے سامنے مزید نمایاں ہو جاتے ہیں اور مجھے ایسی تنہائی چاہیے تھی، جہاں خود مجھے بھی میرا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لابی میں بیٹھے بیٹھے دو گھنٹے گزر گئے۔ یہ پانچ اور سات ستارہ ہوٹل بھی عجیب ہوتے ہیں۔ ایک دنیا ایک خلقت وہاں آتی جاتی رہتی ہے، مگر کسی کو کسی سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے، مگر عموماً مُسکرانے کی وجہ نامعلوم رہتی ہے، اچانک لابی میں ایک شور سا اٹھا اور کچھ لوگ ایک جانب لپکے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو لبنٰی اپنے اسٹاف کے ساتھ لابی میں داخل ہو رہی تھی۔ میڈم شہ پارہ کے مداح اس سے آٹو گراف لینے میں مصروف تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ لبنٰی کی ساکھ بطور ہیروئن پھر سے بحال ہو چکی تھی۔ جانے یہ آٹو گراف لینے والے مداح بعد میں اس آٹو گراف کو سینت سنبھال کر بھی رکھتے ہوں گے یا پھر وقت گزرنے کے بعد یہ یادیں بھی ردّی کی ٹوکری کی نذر ہو جاتی ہیں۔ لبنٰی کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ سب سے معذرت کر کے میری طرف چلی آئی ’’ارے پَری زاد، تم......؟ کیا کوئی میٹنگ وغیرہ ہے؟‘‘ ’’نہیں، خود سے چُھپنے کے لیے یہاں آ بیٹھا تھا‘‘۔ میرا جواب سُن کر وہ خاموش سی ہو گئی۔ ’’کیوں جلاتے رہتے ہو خود کو ہمیشہ؟ کب تک جلتے رہو گے۔ یہ دنیا تمہارے اندر کی دنیا سے بہت مختلف ہے۔ پلیز، خود کو اس دنیا کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرو‘‘۔ میں دھیرے سے مسکرایا ’’گویا منافقت کا درس دے رہی ہو‘‘۔ ’’نہیں، پَری زاد نہیں۔ مگر یہ دوغلا پن ہماری فطرت بن چکا ہے۔ کمالی صاحب مجھے بتا رہے تھے کہ تم ہمارے ساتھ کینیڈا نہیں جا رہے، کیا کوئی پریشانی ہے......؟‘‘ میں نے بات ٹالی ’’نہیں، تم لوگ پہنچو، مَیں بعد میں آجاؤں گا اور سنو، مجھے یقین ہے کہ یہ فلم تمہارے کیریئر کی بہترین فلم ہو گی۔ لیکن وعدہ کرو، سُپر ہٹ ہو جانے کے بعد پہلا آٹو گراف میرے لیے ہو گا‘‘۔ وہ ہنستے ہنستے رو پڑی۔ ’’مت کیا کرو ایسی باتیں۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہے۔ اور اگر میرا بس چلے تو ساری دنیا کو تم سے آٹو گراف لینے بھیج دوں۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ میں تمہاری کتنی احسان مند ہوں پَری زاد......‘‘ میں نے شکوہ کیا۔ ’’پھر وہی احسان کی بات؟ کتنی بار تمہیں سمجھاؤں کہ دوستی میں احسان نہیں ہوتا‘‘۔ لبنٰی کی آنکھیں ابھی تک نم تھیں۔ ’’تم نہیں جانتے پَری زاد! مجھ جیسے لوگ جو زندگی میں اَن گنت سمجھوتے کر کے یہاں تک پہنچتے ہیں۔ ان کے لیے کسی کا یہ بے لوث رویہ دنیا کے کسی بھی احسان سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو ہمارے ضمیر کو عُمر بھر کچوکے لگاتا رہتا ہے کہ بدلے میں ہم اپنے محسن کے لیے کچھ بھی نہیں کرپائے اور یہ احساس بڑا بے سکون کر دینے والا ہوتا ہے‘‘۔ لبنٰی کے جانے کے بعد بھی میں بہت دیر تک بے مقصد وہیں بیٹھا رہا۔ میں نے اپنا موبائل فون خاموش کر دیا تھا۔ بے خیالی میں نظر پڑی تو کمالی اور عینی سمیت بہت سے لوگوں کی کالز دکھائی دیں۔ عجیب عذاب تماشے ہے یہ سیل فون بھی، ہر وقت ہر کسی کی دسترس میں رکھتا ہے، کسی مضبوط شکنجے جیسا۔

دفتر پہنچا تو پی اے نے بتایا کہ عینی بی بی کا درجنوں بار فون آ چکا ہے۔ اس نے بنا پوچھے فون ملا دیا۔ وہ مجھ سے روٹھی ہوئی تھی۔ ’’کہاں چلے جاتے ہیں آپ یوں بنا بتائے۔ چار پانچ دن بعد میری روانگی ہے اور آپ ہیں کہ مجھے وقت ہی نہیں دے رہے۔ یاد رکھیں پَری زاد، اگر آپ وقت پر نیویارک نہ پہنچے تو میں آپریشن نہیں کرواؤں گی اور اسے دھمکی مت سمجھیے گا‘‘۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ کچھ تلخ سا ہو گیا۔ ’’نہ ہوا کرو میرے لیے اتنا پریشان۔ مجھ جیسے بے مول انسان کی اتنی فکر نہ کیا کرو۔ اور بہت لوگ ہیں یہاں تمہاری توجہ کے قابل‘‘۔ عینی روہانسی ہو گئی۔ ’’کیوں، کیا مجھے آپ کے لیے فکر کرنے اور پریشان ہونے کا حق بھی نہیں ہے۔ ٹھیک ہے میں کہیں نہیں جا رہی‘‘۔ اس نے فون رکھ دیا اور پھر شام تک وہ بڑی مشکل سے مانی۔ جب انسان خود ہی سے روٹھا ہوا ہو تو اسے کسی دوسرے کو منانا کتنا

مشکل ہو جاتا ہے۔ اس بات کا احساس مجھے اُس روز ہوا۔ تیسرے دن فلم یونٹ کینیڈا روانہ ہو گیا۔ میری بے چینی بھی اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ میرے اندر پلتا نیا پَری زاد مجھے دن بھر کچوکے لگاتا رہتا تھا۔ رقیب سے رقابت اور دشمن سے دشمنی کی جاتی ہے اور تمہاری محبت کو تم سے چھین کر لے جانے والا تمہارا دشمن نہیں تو اور کیا ہے۔ اب بھی وقت ہے پَری زاد، عینی کی آنکھوں کا آپریشن کروانے میں اتنی جلدی نہ کرو۔ پہلے اس عدنان نامی کانٹے کو نکل جانے دو۔ کاش عینی کو کبھی بینائی ہی نہ مل پائے۔ پَری زاد کے لیے تو اس کی کومل روح کی چاندنی ہی کافی ہے، عُمر بھر اُجالا کرنے کے لیے۔ اس کی بینائی کی ضرورت تو اس رقیب کو ہے اور رقیب کی خواہش پوری کرنے والا احمق بھلا اس دنیا میں کون ہو گا۔ میں نے اس تکرار کی گونج سے، درد سے پھٹتے سر کو تھام لیا۔ اُسی وقت کبیر خان کسی کام سے دفتر میں داخل ہوا تو میرا زرد چہرہ اور پسینے سے شرابور وجود دیکھ کر گھبرا گیا۔ ”کیا ہوا صاب...... سب خیر تو ہے؟“ اور شاید ٹھیک وہی لمحہ تھا، جب میں اپنی برداشت کی حدیں پار کر گیا۔ ”کبیر خان...... ادھر تمہارے علاقے میں اگر کوئی تم سے تمہاری محبت چھین کر لے جائے تو تم کیا کرتے ہو......؟“ ”ہم اس کو قتل کر دیتا ہے صاب...... ہمارا علاقے میں محبت اور غیرت کا نام پر مار دینا عام بات ہے“۔ میں نے اپنی آنکھیں زور سے بھینچ لیں۔ ”کوئی میری محبت چھین کر لے جا رہا ہے کبیر خان۔ اس کو بھی ختم کر دو“ کبیر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھک گیا۔ ”تم صرف اس کا نام بولو صاب...... چوبیس گھنٹے میں وہ اس دنیا سے چلا جائے گا“۔ میں نے ایک کاغذ کے رقعے پر عدنان کا نام اور پتا لکھ کر کبیر کے حوالے کر دیا۔ ”یہ لڑکا آج کل زیادہ تر عینی بی بی کے گھر ہی پر رہتا ہے۔ دھیان رہے۔ یہ کام تب ہونا چاہیے، جب وہ لڑکا تنہا ہو“۔ کبیر نے سر جُھکا دیا۔ ”آپ فکر مت کرو صاب۔ ہم سمجھ گیا“۔ کبیر کسی اچھے وفادار کی طرح زیادہ سوال جواب کیے بغیر ہی واپس چلا گیا۔

میرے سینے پر رکھا ایک بھاری پتھر ہٹا تو ضمیر کے بوجھ کی دوسری بڑی اور اس سے بھی بھاری سِل پورے وجود کو کچلنے لگی۔ یہ ہم جیسوں کا ضمیر اتنا زندہ کیوں رہتا ہے؟ یہاں تو لوگ پل بھر میں سیکڑوں گھر اُجاڑ دیتے ہیں اور پلٹ کر ذرا دیر رک کر دیکھتے بھی نہیں۔ میں تو پھر بھی صرف اپنے دل کا آنگن آباد کرنا چاہتا تھا۔ کب چاہا تھا، میں نے کہ ایسا ہو، مگر ایسا ہو رہا تھا، تو اس میں میرا قصور کیا تھا؟ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ ضمیر ہمیں گناہ کرنے سے روکتا نہیں۔ صرف گناہ کا مزہ کرکرا کر دیتا ہے۔ میں تو وہ بے ہنر تھا کہ نہ نیکی کو نیکی کی طرح ادا کر سکا اور نہ گناہ کو گناہ کی طرح نبھا پایا، کیوں کہ چاہے گناہ ہو یا پھر ثواب، دونوں کے لیے بہر حال ظرف کی ضرورت پڑتی ہے۔ شام کو دفتر سے نکلنے سے پہلے مجھے عینی کا پیغام ملا کہ وہ بیرونِ ملک روانگی سے قبل اپنے مجسموں کی ایک نمائش رکھ چکی ہے، جس کا آج ہی افتتاح ہے۔ لہٰذا میں دفتر سے سیدھا شہر کی بڑی آرٹ گیلری پہنچ جاؤں۔ مجھے لگا، جیسے عدنان کو راستے سے ہٹانے میں قدرت خود میری مدد کرنا چاہتی ہے۔ عینی بہت دیر تک اپنی مصروفیت میں اُلجھی رہے گی اور کبیر خان کو وار کرنے کا موقع بھی مل سکتا تھا۔ میرے سارے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ جُرم کی اپنی ایک کشش ہوتی ہے اور جب کوئی نادان جرم کرنے کی ٹھان لے تو پھر یہ نشہ سر چڑھ کر بولتا ہے اور شاید دنیا کے ہر گناہ کے پیچھے یہی فلسفہ کار فرما رہتا ہے۔

آرٹ گیلری لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ کمالی بھی دفتر میں عینی کی دعوت پر میرے ساتھ چلا آیا تھا۔ وہاں پہنچ کر پتا چلا کہ تقریب کا مہمانِ خصوصی بھی مجھے ہی مقرر کیا گیا ہے۔ میں نہ نہ کرتا رہ گیا، مگر جھٹ فیتہ کاٹنے والی قینچی میرے ہاتھ میں تھما دی گئی۔ فیتہ کٹا تو تالیوں کی گونج میں ہم اس ہال میں داخل ہو گئے، جہاں عینی کے بنائے ہوئے بہت سے فن پارے رکھے گئے تھے۔ میں نے چور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا، مگر مجھے عدنان کہیں دکھائی نہیں دیا۔ نہ ہی میرے دل کے چور نے مجھے اس بات کی اجازت دی کہ میں عینی سے اس کے بارے میں پوچھ سکوں۔ اس لڑکی کی انگلیوں کا ہُنر سارے ہال میں بکھرا ہوا تھا اور اس کے فن کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ لوگوں نے جی بھر کر اُسے داد دی۔ مغرب کے بعد باقاعدہ تقریب کا آغاز ہوا، تو میں نے کبیر خان کو ہال سے باہر جاتے دیکھا۔ میں اپنے ہی خیالوں میں گم کھڑا تھا کہ ایک بنی ٹھنی سی لڑکی ایک پختہ عمر عورت کے ساتھ میرے قریب آ کھڑی ہوئی۔ ”کیسے ہیں پَری زاد صاحب، کبھی غریبوں کو بھی یاد کر لیا کریں۔ آپ نے تو شہ پارہ کے بعد کسی اور فلمی ہیروئن کو دیکھا تک نہیں“۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ کمالی نے جلدی سے تعارف کروایا۔ ”سر یہ میڈم زارا ہیں۔ شہ پارہ کی ٹکر کی ہیروئن ہیں“۔ زارا نے انکساری سے سر جھکایا ”کہاں جی...... شہ پارہ کی ٹکر کی ہوتی تو آج میں بھی پَری زاد صاحب کی کسی فلم میں کاسٹ ہوتی، مگر انہوں نے تو ہمیں پوچھا تک نہیں“۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں شاید اس کی بات اطمینان سے سنتا، مگر اس وقت میرا سارا دھیان کبیر اور عدنان کی طرف لگا ہوا تھا۔ میں نے جان چُھڑوانے کے لیے کہا ”اگر میں نے کوئی دوسری فلم بنائی، تو آپ کو ضرور موقع دوں گا۔ فی الحال میں کسی اور اُلجھن میں ہوں۔ معاف کیجیے گا“۔ کمالی نے میرے ہٹنے کے بعد جانے بات سنبھالنے کے لیے اس حُسنِ بے پروا کو کیا کہا۔ میں ہٹ کر ایک جانب کھڑا ہو کر بظاہر ایک فن پارہ دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد کمالی ہاتھ میں ایک تعارفی کارڈ لیے میری طرف آ گیا۔ ”سر! یہ زارا نے اپنا کارڈ دیا ہے اور اس کے پیچھے اپنا ”خاص“ نمبر بھی لکھ دیا ہے۔ اس نے اور اس کی ماں نے خواہش ظاہر کی ہے کہ کبھی آپ ان کے ساتھ بھی ڈنر وغیرہ کریں“۔ میں نے کارڈ دیکھ کر بے پروائی سے کمالی کے حوالے کر دیا۔ وہ کچھ حیران ہوا۔ ”تم جانتے ہو کمالی! مجھے ایسے لوگوں سے ملنے کا کبھی کوئی شوق نہیں رہا۔ حُسن جب خود اپنی قیمت لگانے پر تُل جائے تو بہ یک وقت اس سے زیادہ گراں اور ارزاں جنس زمانے میں کوئی دوسری نہیں ہوتی“۔ کمالی مُسکرایا ”یہ آپ ہی ہیں، جو اس جنس کو ارزاں سمجھ رہے ہیں سر، ورنہ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت بھی شہر بھر کے امراء اسی زارا کے ساتھ لنچ یا ڈنر پر ذرا سا وقت گزارنے کے لیے جانے کیا کیا جتن کرتے ہیں۔ میں تو یہ کہوں گا سر کہ جب حُسن اپنی قیمت لگانے پر آ جائے تو اس سے مہنگی چیز دنیا میں کوئی نہیں ہوتی“۔ میں نے سر جھٹکا ”وہ حُسن ہی کیا جو بِک جائے“۔ ”ٹھیک کہتے ہیں سر آپ، مگر بات اگر سودے بازی کی ہو تو حُسن کے پاس دان کرنے کے لیے سب سے بڑا عطیہ حُسن ہی تو ہوتا ہے۔ شاید آپ جسے بہت مقدس جنس سمجھتے ہیں، زارا جیسی ادا فروش کے ہاں وہی سب سے آسان سودا ہے۔ اپنی اپنی سوچ کی بات ہے سر۔ کسی کے لیے دولت کے انبار، ردّی کاغذ کے ٹکڑوں جیسے ہیں، تو کسی کے لیے حُسن اور ادا اس ردّی کا نعم البدل“۔ اتنے میں دوسرے ہال سے اسپیکر پر تقریب شروع ہونے کا اعلان کیا گیا۔ سارے مہمان اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ میں پہلی رو میں اپنے نام والی نشست پر بیٹھا تو اچانک میری نظر اسٹیج کے پیچھے اپنے کاموں میں مصروف عدنان پر پڑی۔ میں نے بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھا تو کبیر خان مجھے ہال کے دروازے پر جما کھڑا نظر آیا۔ میری اُس سے نظر ملی، تو اس نے آنکھوں آنکھوں میں مجھے مطمئن رہنے کا اشارہ کیا۔

جیسے کہہ رہا ہو کہ آپ فکر نہ کریں صاب۔ آپ کا غلام موجود ہے یہیں۔ میں نے عینی کو سختی سے منع کیا تھا کہ وہ کسی صورت بھی مجھے اسٹیج پر آ کر کچھ کہنے کو نہیں کہے گی، کیوں کہ میری طبیعت اس وقت اجازت نہیں دے رہی، لہٰذا تقریب کے اناؤنسر نے سب سے پہلے میری طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے میری طرف سے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور پھر ایک ایک کر کے تقریب میں موجود متعلقہ فن کے ماہرین کو ڈائس پر بلایا جاتا رہا اور وہ عینی کے فن کے بارے میں اپنی رائے دے کر پلٹتے رہے۔ میں اپنے خیالوں میں گم بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب کوئی میرے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ ''کن خیالوں میں گم ہیں پری زاد صاحب؟'' میں عدنان کی آواز سُن کر اچھل ہی تو پڑا۔ مجھے لگا، جیسے اس نے میرے خیالات پڑھ لیے ہوں۔ مگر وہ اپنی دُھن میں بولے گیا''۔ آپ جانتے ہیں پری زاد! عینی بہت خوش ہے، جانے کیا کیا منصوبے بناتی رہتی ہے سارا دن کہ جب اس کی بینائی واپس آجائے گی، تو وہ ایک بار پھر سے میرے ساتھ اپنے بچپن کا اسکول، محلہ، گلی، سڑکیں اور گھر دیکھنے جائے گی اور ہر وہ جگہ، جہاں سے اس کی کوئی یاد جڑی ہے، لیکن ہر جگہ آپ ہمارے ساتھ ہوں گے۔ اس معصوم لڑکی نے اپنی زندگی کے کتنے سال اندھیروں میں کاٹ دیئے۔ میں نے بھی تہیہ کر لیا ہے کہ میرے رب کی مہربانی سے جب عینی کی بصارت واپس آجائے گی، تو اس کے نصیب کے ہر اندھیرے کو روشنی میں بدل دوں گا۔ اور یہ سب آپ کی وجہ سے ممکن ہو گا پری زاد صاحب۔ اصل میں یہ آپ ہی ہیں، جو ہم دونوں کی زندگی میں ضیا بن کر آئے ہیں''۔ میں گم صُم سا عدنان کی باتیں سُن رہا تھا کہ اسٹیج پر سب سے آخر میں عینی کا نام پکارا گیا، ہال میں تالیوں کی گونج کے دوران وہ دھیرے دھیرے چلتی اپنی کسی ساتھی کے سہارے ڈائس تک پہنچی تو سناٹا سا چھا گیا۔ وہ بولی تو میرے آس پاس صرف اس کے لفظ اپنے سُر بکھیرنے لگے۔ ''آج میری زندگی کا بہت بڑا دن ہے۔ اس لیے نہیں کہ آج میرے فن پاروں کی نمائش ہوئی اور ملک کے نام ور فن کاروں نے میرے فن کو سراہا۔ یہ مدح سرائی تو مجھ جیسی ہر نئی آرٹسٹ کا خواب ہوتی ہے۔ مگر ان سب باتوں سے بڑھ کر بھی ایک خوشی ہے۔ ایک اعزاز ہے میرے

لیے کہ میرے محسن میرے آئیڈیل نے آج میری زندگی کے اس اہم ایونٹ کا افتتاح اپنے ہاتھوں سے کیا۔ آج میں آپ سے اپنی ایک اور اہم خوشی بھی بانٹنا چاہتی ہوں۔ تین دن بعد میری یو ایس اے روانگی ہے، چند ماہ بعد جب میں واپس آؤں گی تو شاید اُس وقت مجھے اس سفید چھڑی کے سہارے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہو گی اور یہ سب بھی میرے اسی محسن کی بہ دولت ہے۔ ہماری زندگی میں کچھ لوگ ایسے بھی آتے ہیں، جن سے قدرت ہمارے نصیب کے سارے تار جوڑ دیتی ہے۔ میری زندگی میں پہلے ایسے دو لوگ تھے، میری ماں اور میرے بچپن کا ساتھی عدنان، جنھوں نے قدم قدم میرا حوصلہ بڑھایا اور مجھے جینے کی راہ دکھائی۔ مگر اب کوئی اور بھی ہے، جو میری خوشیوں کا ضامن ہے، جس کے ہوتے ہوئے، مجھے پورا یقین ہے کہ غم کبھی میرے آس پاس بھی بھٹک نہیں سکتا، کیوں کہ کچھ لوگوں کا وجود ہی ہمارے اندر روشنی بھر دینے کے لیے کافی ہوتا ہے اور آج آپ لوگ جو میرے ارد گرد یہ خوشیوں کی بہار دیکھ رہے ہیں یہ سب اسی عظیم ہستی کی دین ہے۔ وہی جو میرے محسن، میرے آئیڈیل اور دنیا میں سب سے زیادہ محترم ہیں میرے لیے...... ''سارا ہال عینی کی تقریر ختم ہونے پر تالیوں سے گونج اٹھا اور بہت دیر تک شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دی، لیکن ہال کے اس شور سے کہیں زیادہ شور اور چیخ و پکار خود میرے اندر مچی ہوئی تھی۔ مجھے اپنا آپ بہت چھوٹا، بہت حقیر محسوس ہو رہا تھا۔ میرے اندر لگے آئینے میں دوسری جانب کھڑا پری زاد مجھ سے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا ''تم ایک خود غرض انسان ہو پری زاد...... کیا یہی تمہاری نام نہاد محبت ہے کہ خود اپنے ہاتھوں اپنی چاہت کی خوشیوں کا گلا گھونٹنے چلے ہو۔ کتنے کم ظرف ہو تم اور کتنی اعلیٰ ظرف ہے وہ کہ تمہیں اتنا مان دیتی ہے، مگر تم؟ تم اس مان کے قابل کہاں، تم بھی وہی عام دنیادار نکلے پری زاد...... خود غرض اور مطلب پرست، جتنا تمہارا تن میلا ہے، اتنا ہی تمہارا من گدلا، یہی تمہاری اصلیت اور یہی تمہاری اوقات ہے پری زاد''۔ میرے اندر کی آوازیں اتنی بلند ہونے لگیں کہ میں نے گھبرا کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور ٹھیک اُسی لمحے اس کی ملائم آواز سنائی دی۔ ''پری زاد...... کہاں چُھپے بیٹھے ہیں آپ! میں آپ کو سارے ہال میں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟'' میں نے گھبرا کر عینی کی طرف دیکھا۔ تقریب ختم ہو چکی تھی اور لوگ ایک ایک کر کے عینی کو کام یاب نمائش پر مبارک باد دے کر واپس پلٹ رہے تھے۔ ''ہاں، ہاں میں ٹھیک ہوں۔ یونہی بس ذرا بھیڑ میں جی گھبرا رہا تھا۔ تم بتاؤ، تم خوش تو ہو ناں!! آج تم نے یہ معرکہ بھی سر کر ہی لیا''۔ عینی ہنس پڑی، وہ بہت ہلکی پھلکی سی لگ رہی تھی۔ ''جناب! یہ سارے معرکے آپ کی وجہ سے سَر ہو رہے ہیں۔ پتا ہے، عدنان تو مجھے کہتا ہے کہ آپ میری زندگی میں میرا لکی چارم بن کر آئے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں اسے آپ کی شاعرانہ گفتگو میں، خوش نصیبی کا ستارہ''۔ عدنان کے ذکر پر جیسے مجھے سب کچھ دوبارہ یاد آ گیا اور میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''مگر یہ عدنان ہے کہاں، دکھائی نہیں دے رہا؟'' عینی مسکرائی ''پتا نہیں، کہہ رہا تھا، مجھے کوئی سرپرائز دینا چاہتا ہے۔ شاید اسی سلسلے میں باہر گیا ہے۔ بس آتا ہی ہو گا''۔ میرے ہوش اُڑ گئے۔ عدنان تنہا باہر نکل چکا تھا۔ میں نے جلدی سے گھڑی پر نظر ڈالی، رات کے دس بج رہے تھے۔ میں نے عینی کو وہیں رُکنے کا کہا اور جلدی میں باہر کی جانب لپکا۔ میرے سارے خدشے شاید آج ہی درست ثابت ہونا تھے۔ میری گاڑی کے قریب میرا ڈرائیور اور گھر کا دوسرا گارڈ مستعد کھڑے تھے۔ میں نے ہڑبڑائے ہوئے لہجے میں ان سے پوچھا ''کبیر خان کہاں ہے؟'' ڈرائیور نے ادب سے جواب دیا کہ وہ کسی کام کا کہہ کر باہر نکلا ہے۔ میرے ساتھ جانے کے لیے اس نے گھر سے دوسرا گارڈ طلب کر لیا تھا۔ اسی گارڈ نے مجھے بتایا کہ کبیر خان کسی پرائیویٹ گاڑی میں باہر نکلا ہے۔ میرے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ یقیناً کبیر خان عدنان کے پیچھے گیا تھا تاکہ موقع پا کر اسے ختم کر دے۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے کبیر کا نمبر ڈائل کیا۔ گھنٹی بجتی رہی، مگر اس نے فون نہیں اٹھایا۔ میں نے جلدی سے دوبارہ نمبر ملایا میرے اندر سمندر کی تیز لہروں جیسا شور ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ''فون اٹھاؤ کبیر خان، ورنہ آج ہم دونوں کے ہاتھوں ایک گناہِ کبیرہ سرزد ہو جائے گا۔ فون اٹھاؤ کبیر...... خدا کے لیے فون اٹھاؤ......'' میں نے خود کلامی کرتے ہوئے پانچویں مرتبہ کبیر کا نمبر ڈائل کیا۔ تیسری گھنٹی پر اس نے فون اٹھا لیا۔ میری آواز کانپ گئی۔ ''تم کہاں ہو کبیر خان! جلدی واپس لوٹ آؤ''۔ دوسری جانب ٹریفک کا بہت شور تھا۔ ''ہم شکار کے پیچھے آیا ہے صاب، تم فکر مت کرو، وہ اس وقت ٹھیک ہمارا نشانے پر ہے''۔ میں نے چیخ کر کہا ''نہیں، کبیر خان! ایسی غلطی مت کرنا۔ میرا حکم ہے کہ فوراً واپس آجاؤ''۔ دوسری جانب کبیر کو میری آواز ٹھیک سنائی نہیں دی۔ ''بہت شور ہے صاب۔ ہم کام ختم کرتے ہی واپس آتا ہے...... وہ لڑکا دوسرا گاڑی میں ہمارا نشانے پر ہے۔ بس ایک منٹ اور......'' کبیر کی آواز کٹ گئی...... میں اتنی زور سے چلایا کہ ساری پارکنگ میری آواز سے گونج اٹھی۔ ''تم اس لڑکے کو نہیں مارو گے کبیر خان! یہ میرا حکم......'' میری آواز درمیان ہی میں گھٹ گئی۔ دوسری جانب کے شور میں مجھے ایک دھماکے کی آواز سنائی دی۔ شاید کسی نے فائر کیا تھا۔ میرے ہاتھ سے فون زمین پر گر گیا۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف ومنفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ’’خدا اور محبت‘‘ اور ’’بچپن کا دسمبر‘‘ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ’’عبداللہ‘‘ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ’’عبداللہ‘‘ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

’’پری زاد‘‘ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ’’سنڈے میگزین‘‘ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

میں سر پکڑ کر وہیں زمین پر بیٹھ گیا، کچھ لمحوں کے لیے ہر طرف اندھیرا سا چھا گیا۔ پھر اچانک مجھے یوں لگا، جیسے قریب پڑے میرے سیل فون سے ابھی تک کبیر خان کی آواز آرہی ہو۔ میں نے جلدی سے فون اٹھایا، دوسری طرف وہی تھا ’’کیا ہوا صاب...... اس طرف بہت شور تھا، ابھی بولو......‘‘ میں نے چلّا کر کبیر سے پوچھا ’’کیا تم نے اسے مار دیا کبیر......؟‘‘ ’’نہیں صاب...... اِدھر سگنل پر وہ بالکل نشانے پر تھا، مگر چوک پر کوئی حادثہ ہوگیا، اس لیے رش جمع ہوگیا، مگر ہم اس کے پیچھے ہے، ایک سنسان سڑک پر......‘‘ میری آواز بیٹھ گئی ’’نہیں کبیر خان، نہیں، تم واپس آ جاؤ‘‘۔ کبیر نے احتجاج کیا ’’مگر صاب......!!‘‘ میں نے غصّے سے چیخ کر کہا ’’یہ میرا حکم ہے، فوراً واپس آؤ‘‘ ’’ٹھیک ہے صاب‘‘۔ کبیر نے فون کاٹ دیا۔ میں اس طرح گہرے گہرے سانس لے رہا تھا، جیسے میلوں دُور سے بھاگ کر آیا ہوں، پھر مجھ سے وہاں ٹھہرا نہیں گیا اور میں گھر واپس لوٹ آیا۔ خود کو کمرے میں بند کر کے اندھیروں کے حوالے کردیا۔ آج میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی اور آخری بازی ہار آیا تھا۔ کچھ بھی نہیں بچا تھا میرے پاس۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں تجوریوں میں بھری اپنی ساری دولت کو، اس عالی شان گھر کے صحن میں جمع کر کے اپنے ہر اثاثے سمیت جلا کر راکھ کر دوں، آگ لگا دوں اس ساری جائداد اور شان و شوکت کو، کس کام کا تھا یہ سب کچھ۔ اتنا لمبا سفر طے کرنے کے بعد بھی میرے دل کا دامن آج بھی اسی پری زاد کی طرح تہی دست اور خالی تھا، جو کبھی اسی شہر کے ایک کچے مکان میں رہا کرتا تھا۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ دل کی ویران خالی بستیاں مقدروں سے بسا کرتی ہیں اور میرے نصیب میں میرے مَن کی یہی سُونی حویلی ہی لکھی تھی، لیکن اب میں اپنے اس دشمنِ دل کی مزید کسی چال میں آنے والا نہیں تھا۔ بہت مَن مانیاں کر چکا تھا یہ اپنی، بڑی ذلت اور خواری اٹھائی تھی آج تک میں نے اس دل کے کہنے میں آ کر، مگر اب اس وحشی دل کو سزا دینے کا وقت آ چکا تھا اور مجھ جیسے دل جلے جب خود کو سزا دینے پر آتے ہیں، تو وہ سزا بڑی سخت ہوتی ہے۔ اگلے روز میں نے ایک پاور آف اٹارنی کے ذریعے کچھ اہم فیصلے کیے۔ اپنے تمام پھیلے ہوئے کاروبار اور عملے کو ایک ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام کر کے سب کے حصّے مقرر کردیے۔ میری آمدنی کا ایک بہت بڑا حصّہ اسی ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام ڈاکٹر پال کے پلاسٹک سرجری کے ادارے کو جاتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر پال کو ایک آخری ای میل لکھی۔ ’’محترم ڈاکٹر پال! میں نے اپنی پلاسٹک سرجری کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے، کیوں کہ آپ ہی کے ادارے کی تعارفی سطر کے مطابق یہ بات بالکل درست نکلی کہ چہرے بدلے جاسکتے ہیں، تقدیریں نہیں۔ اور مجھے شاید اس بات کا احساس بہت دیر میں ہوا کہ مجھے اپنی تقدیر بدلنے کی ضرورت چہرہ بدلنے سے کہیں زیادہ تھی، مگر افسوس، میں کسی ایسے ادارے کو نہیں جانتا، جو اللہ سے سفارش کر کے میری تقدیر بدل ڈالتا۔ میرے ادارے کی آمدنی سے ایک بڑا حصّہ ہر ماہ آپ کے ادارے کو ملتا رہے گا۔ میری درخواست ہے کہ آپ یہ رقم اُن لوگوں کے مفت علاج پر صرف کیجیے گا، جو اپنی سرجری کروانا چاہتے ہیں، مگر اس کی استطاعت نہیں رکھتے۔ میری آمدنی کا دوسرا بڑا حصّہ میرے اپنے ملک میں ایسے پلاسٹک سرجری کے اداروں کو جائے گا، جو یہاں کے نادار مریضوں کے چہروں کا علاج کریں گے اور پوری سہولیات نہ ہونے کی صورت میں، ایسے لوگوں کو آپ کے ادارے تک پہنچائیں گے۔ میرا اسٹاف آپ کے ادارے کو یہاں کے اداروں سے منسلک کروادے گا۔ یہ میری آخری ای میل ہے، کیوں کہ اس کے بعد میں خود کو اس دنیا کی بھیڑ میں کہیں گم کردوں گا، اس لیے کہ میں نہیں چاہتا کہ جس کے لیے میں اپنے چہرے کی سرجری کروا کر اسے خوش نُما بنانا چاہتا تھا، وہ کبھی میرے اس چہرے کو دیکھے اور اس کی آنکھوں میں میرے لیے حقارت یا ہم دردی کی وہ لہر پیدا ہو، جو ازل سے میرا مقدر ہے، اور اگر کبھی ایسا ہوا تو وہ لمحہ میرے لیے موت کی اذیت سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہوگا۔ میں نے ساری دنیا کی نظریں جھیل لیں، مگر اس ایک نظر کو کبھی برداشت نہیں کر پاؤں گا۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا...... دعا گو، پری زاد......‘‘

شام تک سارے کاغذات تیار ہو چکے تھے۔ کمالی سمیت چند دیگر سینئرز اور وفادار عملے کے ارکان کو بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل کر دیا گیا۔ میرے بہن بھائیوں، دوستوں، رشتے داروں اور عملے سمیت سبھی کے لیے ماہانہ مشاہرے کے علاوہ حصّے کے طور پر ایک معقول رقم مخصوص کردی گئی۔ میں نے کچھ ایسا انتظام کر دیا تھا کہ میرے جانے کے بعد بھی سارا سلسلہ اسی طرح چلتا رہے۔ جب کمالی کو میں نے رات گئے طلب کر کے ساری تفصیلات سے آگاہ کیا، تو وہ ایک دم گھبرا سا گیا ’’مگر سر! آپ کہاں جارہے ہیں؟ اور معاف کیجیے گا سر، یہ پاور آف اٹارنی سے کہیں زیادہ کوئی وصیت نامہ لگتا ہے۔ میں آپ کو کہیں جانے نہیں دوں گا، اسٹاف سے یہ سب کچھ اکیلے نہیں سنبھلے گا سر!‘‘ میں نے اسے تسلی دی ’’فکر مت کرو، سب یونہی چلتا رہے گا، اور میں کہیں نہیں جارہا...... بس اچانک کچھ ضروری مسائل پیش آ گئے ہیں، اس لیے کچھ عرصہ شاید غیر حاضر رہوں گا اور یاد رہے، میرے کہیں جانے تک یہ کاغذ تمہارے پاس امانت کے طور پر رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم میرا یہ بھرم ضرور قائم رکھو گے‘‘۔ کمالی کی پلکیں بھیگ گئیں ’’میں آخری سانس تک آپ کا ہر بھرم نبھاؤں گا سر، مگر یہ تو بتا دیں کہ آپ جا کہاں رہے ہیں؟ کبھی آپ سے رابطہ کرنا ہو تو کیسے کیا جائے؟‘‘ ’’فی الحال تو میرا خود اپنے آپ سے رابطہ بھی ممکن نہیں ہے کمالی، میں کوشش کروں گا کہ تمہیں مطلع کرسکوں۔ اب تم جاؤ، اور ہاں، کبیر خان کا خاص خیال رکھنا، ایسے وفادار بہت نایاب ہوتے ہیں‘‘۔ کمالی افسردہ سا، دل میں بہت سی باتیں لیے لوٹ گیا۔ کچھ دیر میں کبیر خان آ گیا۔ وہ کچھ چُپ چُپ سا تھا۔ میں نے مُسکرا کر اسے دیکھا۔ ’’مجھ سے ابھی تک ناراض ہو کبیر خان؟‘‘ کبیر نے جلدی سے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ’’نہیں صاب...... ہم تو آپ کا غلام ہے۔ مگر، آپ نے اس ڈاکٹر کو معاف کر کے اچھا نہیں کیا۔ دشمن پر رحم نہیں کھانا چاہیے، کیوں کہ جب اس کا وقت آئے گا تو وہ آپ پر رحم نہیں کرے گا‘‘۔ میں نے ایک گہری سانس لی ’’تم ٹھیک کہتے ہو کبیر خان، مگر محبت شاید ہمیں بزدل بنا دیتی ہے۔ کبھی کبھی محبت میں ہم ایسے لوگوں کو بھی بخش دیتے ہیں، جو خود ہمارے قتل کا باعث بن جاتے ہیں اور اس جنگل نُما دنیا کا بس یہی تو قانون ہے، مار دو یا پھر خود مر جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میں نے خود کو مار دیا ہے کبیر خان......‘‘ کبیر سَر جُھکائے واپس چلا گیا۔

اگلے دو دن بھی پَر لگا کر اُڑ گئے اور پھر عدنان اور عینی کی امریکا روانگی کا دن بھی آ گیا۔ وہ دونوں بے حد خوش دکھائی دے رہے تھے۔ عینی کی اب بھی وہی ضد تھی۔ ’’میں تو کہتی ہوں آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں، تین چار ہفتے میں سارے ٹیسٹ ہو جائیں گے، اور پھر آپریشن کے بعد ہم سب اکٹھے واپس

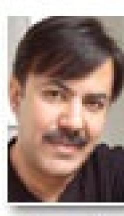
آجائیں گے۔ کتنا مزہ آئے گا، جب ہم تینوں وہاں ایک ساتھ ہوں گے، ورنہ یہ عدنان تو اپنی بورنگ باتوں سے میرا سر کھا جائے گا اتنے بہت سے دن''۔ میں نے وعدہ کیا۔ تم لوگ پہنچو، میں بھی جلد آنے کی کوشش کروں گا، یہاں پیچھے بہت سے کام ادھورے پڑے ہیں''۔ عدنان نے سر ہلایا ''کوشش نہیں جناب، آپ کو اس بلّی کے آپریشن سے پہلے ہر حال میں پہنچنا ہی ہوگا۔ اسے اکیلے برداشت کرنا خود میرے بس کی بات بھی نہیں ہے، ہاں البتہ آپ کی موجودگی میں کافی سوبر برتاؤ کرتی ہے''۔ عینی نے اسے گھورا'' بکومت، پَری زاد جانتے ہیں کہ میں کتنی سوبر اور ویل مینرڈ ہوں، تمہاری گواہی کی ضرورت نہیں''۔ اتنے میں اندر سے ان کی فلائٹ کا اعلان ہونے لگا۔ میں نے اُن دونوں کو رخصت کیا'' ٹھیک ہے بابا، تم دونوں ہی بہت اچھے ہو۔ چلو، اب دیر نہ کرو، فلائٹ کا اعلان ہوگیا ہے''۔ عینی جاتے جاتے ایک لمحے کے لیے پلٹی، میرا دل بے قابو ہونے لگا، وہ میرا سب کچھ لُوٹ کر اپنے ساتھ لے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی بھیگ رہی تھیں ''پَری زاد، وقت پر پہنچنے کی کوشش کیجیے گا۔ میں وہاں روزانہ آپ کو بہت یاد کروں گی، اپنا بہت خیال رکھیے گا''۔ میری آواز کپکپا سی گئی۔ مجھے یوں لگا، جیسے میرا دل کسی نے مُٹھی میں لے کر بہت زور سے مسل ڈالا ہو'' تم بھی ہمیشہ میری یادوں میں رہوگی، میری پیاری آرجے...... الوداع......'' وہ ایک لمحہ رُکی اور پلٹ کر اندر لاؤنج کی جانب بڑھ گئی۔ میں بہت دیر تک اسے لوگوں کی بھیڑ میں گم ہوتا دیکھتا رہا۔ اپنی زندگی کے، خود سے قدم بہ قدم دور جانے کا یہ نظارہ شاید دنیا میں مجھ سے پہلے کسی بدنصیب نے نہ کیا ہو۔ عینی چلی گئی۔ میں، جہاز کی اُڑان بھرنے کی اناؤنسمنٹ تک وہیں بیٹھا رہا۔ لوہے اور چند دیگر دھاتوں کا بنا ہوا ایک دیوہیکل ہوائی جہاز مجھ سے میرا سب کچھ چھین کر بہت دُور اُڑان بھر گیا۔

گھر واپس لوٹا تو آدھی رات ڈھل چکی تھی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ گاڑی نکالے، مگر کبیر خان کو اطلاع نہ کرے۔ مجھے شاید کچھ دیر کے لیے کسی کام سے باہر جانا پڑے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر میں نے روزمرّہ اور ماہانہ خرچوں کے کچھ چیکس پر دستخط کیے اور کمالی کے نام ایک خط میں سارے معاملات کی تفصیل لکھ ڈالی۔ فجر سے کچھ دیر قبل مَیں تنہا گھر سے باہر نکلا اور ڈرائیور کو ریلوے اسٹیشن چلنے کے لیے کہا۔ عینی کے جانے کے بعد میرا دل اور دماغ جیسے بالکل سُن سے ہوگئے تھے۔ میں چل پھر رہا تھا، سانس لے رہا تھا، مگر زندہ نہیں تھا۔ پتا نہیں صرف سانس لینا ہی زندگی کی شرط کیوں ٹھہرا دی گئی ہے؟ جیون تو اس سے کہیں بڑھ کر اور سوا ہے۔ ڈرائیور کو باہر انتظار کرتے چھوڑ کر میں ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہنچا تو کوئی گاڑی روانگی کے لیے تیار کھڑی تھی۔ میں نے بنا سوچے سمجھے آخری اسٹیشن کا ٹکٹ لیا اور درجہ بندی کے اہتمام کی فکر کیے بغیر پہلی بوگی میں سوار ہو کر ایک خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر میں ٹرین نے سیٹی بجائی اور پلیٹ فارم چھوڑ دیا، مگر یادیں دماغ کا پلیٹ فارم بھلا کب چھوڑتی ہیں۔ ٹرین اسٹیشن در اسٹیشن ہوتی جانے کہاں چلی جا رہی تھی۔ لوگ ڈبے میں سوار ہوتے اور اپنی منزل آنے پر اترتے رہے، مگر میری منزل کہاں تھی۔ یہ میں بھی نہیں جانتا تھا۔ دو دن بعد ٹرین کسی بڑے جنکشن پر آ کر کھڑی ہوگئی اور سبھی مسافر اتر گئے۔ پتا چلا کہ یہ آخری اسٹیشن ہے۔ اب اگلے دن یہی ٹرین یہاں سے واپس میرے شہر تک جائے گی۔ کاش! یہ ٹرین تمام عمر یونہی چلتی رہتی، آگے بڑھتی رہتی اور اس کا کوئی آخری اسٹیشن نہ آتا۔ کتنا نادان تھا میں، کیا سوچ کر ٹرین میں آ بیٹھا تھا کہ میرے بقیہ تمام عُمر کا سفر اسی ٹرین میں کٹ جائے گا۔ جب تیسری بار ٹرین کے عملے نے مجھے آ کر یہ بتایا کہ اب یہ گاڑی آگے کہیں نہیں جائے گی، تو میں نیچے اتر آیا اور کچھ فاصلے پر بچھے لکڑی کے ایک پُرانے سے بینچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ دنیا کے سارے ریلوے اسٹیشن شاید ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ ناساز ٹھیک ہی کہتا تھا، منزلیں اپنی جگہ ہیں، راستے اپنی جگہ، جب قدم ہی ساتھ نہ دیں، تو مسافر کیا کرے؟ یہاں پر موجود سبھی مسافر کوئی نہ کوئی منزل اور مقصدِ سفر رکھتے تھے۔ ہر کسی کو کہیں جانے کی جلدی تھی، بچّے، بوڑھے، عورتیں اور مرد، بھیڑ، ہجوم اور بھانت بھانت کی بولیاں، عجلت، زادِ راہ اور راستوں کی فکر۔ سبھی کسی نہ کسی دُھن میں مگن تھے، مگر میں بے حس سا بیٹھا اطمینان سے یہ سب دیکھتا رہا۔ شام ڈھلی اور پھر گہری رات نے ڈیرے ڈال دیئے۔ میرے پیچھے وہاں گھر میں ضرور طوفان آ چکا ہوگا۔ کئی گھنٹے انتظار کے بعد میرے واپس نہ لوٹنے پر کبیر نے ضرور اسٹیشن کے باہر میرے انتظار میں کھڑے ڈرائیور سے رابطہ کیا ہوگا یا وہ اس سے بھی پہلے میری تلاش میں نکل چکا ہوگا اور پھر جب ان لوگوں نے مجھے اسٹیشن پر نہیں پایا ہوگا، تو گھر میں کہرام مچ گیا ہوگا۔ کمالی کو تو میرے جانے کا تھوڑا بہت علم تھا، مگر کبیر ٹِک کر بیٹھنے والا نہیں تھا۔ وہ ضرور میری تلاش میں سب چھوڑ چھاڑ گھر سے نکل پڑا ہوگا۔ کہیں وہ دوسری ٹرین پکڑ کر ہر اسٹیشن کھوجتا یہاں تک بھی نہ آ پہنچے۔ میں گھبرا کر اُٹھ کھڑا گیا۔ گھر سے نکلتے وقت میرے کوٹ کی جیب میں پڑے بٹوے میں بہت سے بڑے نوٹ ابھی باقی تھے۔ میں نے ٹکٹ گھر سے کسی دوسری مخالف سمت جاتی گاڑی کا ایک ٹکٹ لیا اور صبح منہ اندھیرے اس گاڑی میں سوار ہو کر پھر سے ڈبے سے باہر کی بھاگتی دنیا کا نظارہ شروع کر دیا۔ مجھے اپنے ماضی، اپنے دل کی حماقتوں اور اپنی پرانی پہچان سے کچھ ایسی چِڑ ہوگئی تھی کہ میں نے اگلے کئی دنوں تک اسی بے مقصد سفر کو اپنی ذات کھو دینے کا بہانہ بنا لیا۔ جہاں گاڑی رُک جاتی، میں وہاں سے کسی اور جانب کا کوئی ٹکٹ لے کر کسی اور گاڑی میں بیٹھ جاتا۔ مجھے شہروں یا بستیوں کے ناموں سے کوئی غرض نہیں تھی، نہ ہی میں نے اس عرصے میں کسی ریلوے پلیٹ فارم سے باہر نکل کر اس شہر، بستی یا گاؤں کو نظر بھر دیکھا تھا۔ میں تو بس چلتے رہنا چاہتا تھا۔ میری شیو بڑھتے بڑھتے داڑھی کی صورت اختیار کرنے لگی تھی اور میرے کپڑے دھول اور مٹی سے غرق ہو چکے تھے، مگر اب مجھے کسی چیز سے کوئی غرض نہیں تھی۔ جہاں بھوک یا پیاس کا احساس ستاتا تو میں اُتر کر کسی پلیٹ فارم پر لگے نلکے سے پیاس بُجھا لیتا اور کسی ٹھیلے والے سے کچھ لے کر کھا لیتا، مجھ پر ایک عجیب سی حقیقت بھی آشکار ہوئی کہ اسی دو گھونٹ پانی اور چار لقموں کے لیے ہم اپنی زندگیوں کو عُمر بھر نہ جانے کیسے کیسے عذاب اور جوکھم میں ڈالے رکھتے ہیں، جب کہ ان دونوں چیزوں کا حصول کبھی اتنی زندگی کا طلب گار نہیں ہوتا، جتنی زندگی ہم اس بھوک اور پیاس کے لیے گنواتے ہیں۔ رفتہ رفتہ میری جیب میں موجود رقم ختم ہونے لگی اور پھر ایک دن جب کسی قصبے کے چھوٹے اسٹیشن پر میں نے جیب سے ٹکٹ لینے کے لیے پیسے نکالنا چاہے، تو میرے ہاتھوں میں صرف چند سکّے آئے۔ میں نے الٹ پلٹ کر ساری جیبیں دیکھ ڈالیں، مگر کچھ بھی نہ بچا تھا، میں تھکا ہارا سا اسٹیشن سے باہر آ گیا، دُور ایک تانگے والا درخت کے سائے میں کھڑا اپنے گھوڑے کو چارہ ڈال رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے میری جانب لپکا۔ ''کہاں جاؤ گے بادشاہو...... اس علاقے کے تو نہیں لگتے......'' میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سارے سکّے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے'' جہاں تک یہ سکّے لے جا سکتے ہیں، لے چلو۔ اس بستی سے پَرے، کسی ویرانے میں......'' تانگے والے نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''بستی سے پَرے تو قبرستان ہے...... اوہ اچھا، اب سمجھا، کسی بڑے بوڑھے کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آئے ہو۔ آؤ بیٹھ جاؤ، میں پہنچا دیتا ہوں''۔ میں چُپ چاپ تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور تانگے والے نے قصبے کے باہر ہی سے ایک لمبا چکر کاٹ کر ایک بڑے سے قبرستان کی چار دیواری کے باہر تانگا روک دیا'' واپس جاؤ گے، میں یہیں انتظار کروں کیا؟'' میں خالی ذہن لیے نیچے اُتر آیا۔ ''نہیں تم جاؤ، میں دیر تک یہاں رکوں گا''۔ تانگے والے کے چہرے پر ایک بار پھر بہت سے سوال اُبھرے، مگر میرا بے زار سا رویہ دیکھ کر اس نے مجھ سے مزید کوئی بات نہیں کی اور چابک مار کر تانگا موڑ لیا اور کچھ ہی دیر میں ویران سڑک کے آس پاس بکھرے کھیتوں میں کہیں گم ہوگیا۔ میں کچھ دیر تک یونہی باہر کھڑا سوچتا رہا اور پھر قبرستان کے لکڑی والے بڑے گیٹ کو دھکیل کر اندر داخل ہوگیا۔ دُور دُور تک نئی اور پرانی قبروں کا ایک جال سا بچھا تھا۔ میں قبروں کے کتبے اور ان پر لکھے سنِ وفات پڑھتا ہوا آگے بڑھتا رہا، کچھ تازہ قبروں پر اگربتیوں کے جلے ہوئے ٹوٹے اور کچھ ماش کے دانے بکھرے ہوئے تھے، مُرجھائے ہوئے خشک

پھولوں کی پتّیاں جابجا بکھری تھیں۔ جانے لوگ مٹی میں چلے جانے والوں کے لیے اتنے پھول لے کر کیوں آتے ہیں۔ اس کی زندگی ہی میں اسے گلابوں سے کیوں نہیں نہارتے۔ چلتے چلتے میں تھک گیا تو ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور آنکھیں موند لیں۔

ایک عجیب سی خاموشی چارسو پھیلی ہوئی تھی۔ انسان کی عُمر بھر کی فریاد اور چیخ پکار کا صلہ بس یہی اک خاموشی ہے۔ اچانک میرے بہت قریب ایک کرخت سی آواز ابھری۔ ''کون ہے بھئی تُو...... اور یہاں کیا کر رہا ہے؟'' میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ ایک سخت گیر سا ہڈیوں کے ڈھانچے نما بوڑھا کمر پر ہاتھ رکھے تنا ہوا کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پایا۔ ''میں...... وہ...... دراصل......'' اس نے کڑے تیوروں سے میری طرف دیکھا۔ ''کوئی قبر کھدوانی ہے کیا؟'' ''نہیں نہیں، میں تو بس......'' اس نے مجھے دوبارہ سر سے پیر تک غور سے دیکھا۔ ''اچھا...... میں سمجھا، ڈاکٹری کی پڑھائی والوں کے لیے پُرانی قبروں سے ہڈیاں چُرانے آیا ہے تُو...... پر کان کھول کر سن لے، فقیرا نام ہے میرا۔ میرے باپ دادا بھی اسی قبرستان کے گورکن تھے۔ خبردار، جو یہاں سے ایک ہڈی بھی اِدھر اُدھر کی...... ہاں، میرے ساتھ سیدھی طرح سودا کرے گا تو میں خود تیرے مطلب کی ہڈیاں تجھے بیچ دوں گا''۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس کرخت طبیعت بوڑھے کو کیسے سمجھاؤں کہ جو وہ مجھے سمجھ رہا ہے، میں وہ نہیں۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''نہیں، میں یہاں مُردوں کی ہڈیاں تلاش کرنے نہیں آیا۔ تھک گیا تھا، اس لیے کچھ دیر کمر ٹکانے کے لیے رک گیا''۔ فقیرے نے مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھا ''کہیں تُو، اس چھوٹے قبرستان کے گورکن سلامے کا ساتھی تو نہیں ہے، سچ بتا، کس ارادے سے یہاں آیا تھا؟'' مجھے بھی غصّہ آگیا اور میں نے سخت لہجے میں فقیرے کو جھاڑ دیا ''تمہیں ایک بار کی کہی بات سمجھ نہیں آتی کیا۔ میں کسی سلامے کو نہیں جانتا اور نہ ہی میرا، تمہاری قبروں کی اس جاگیر پر قبضے کا کوئی ارادہ ہے۔ میں مسافر ہوں، بس راہ بھٹک کر اس طرف آ گیا تھا۔ سوچا تھا، شاید یہاں کچھ سکون مل جائے، مگر یہاں بھی تم جیسے بیوپاری، ٹھیکے دار بیٹھے ہیں''۔ میں نے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔ پیچھے سے فقیرے کی ڈھیلی سی آواز سنائی دی ''ذرا رُک تو سہی......'' میں نے پلٹ کر اُسے دیکھا ''معاف کردے، دراصل پچھلے چند دنوں سے یہ سارے گدھ میرے قبرستان پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ ایک عامل کو بھی بھیجا تھا لوگوں کو ڈرا کر بھگانے کے لیے۔ اس لیے میں سمجھا کہ پھر انہی کی کوئی شرارت ہے۔ نام کیا ہے تیرا، اس علاقے کا تو نہیں لگتا''۔ مجھے جلدی میں کوئی دوسرا نام نہیں سوجھا تو میں نے اپنے پُرانے ڈرائیور کا نام بتا دیا ''اکبر نام ہے میرا...... میں یہاں کا نہیں ہوں، بلکہ میں کہیں کا نہیں ہوں۔ نہ گھر بار ہے نہ کوئی رشتے دار۔ بس، یونہی بستی بستی بھٹکتا رہتا ہوں۔ یہاں بھی بھٹکتے ہوئے ہی آ گیا تھا۔ تم ناراض ہوتے ہو تو یہاں سے بھی چلا جاتا ہوں''۔ فقیرا بالکل ہی نرم پڑ گیا ''او نہیں نہیں، بس ایسے ہی غصّے میں کچھ زیادہ بک گیا میں۔ تیرا جب تک جی چاہے، یہاں رہ سکتا ہے۔ آدمی تو مجھے بھلا معلوم ہوتا ہے۔ روٹی کھائے گا؟'' میں نے جیبوں میں ہاتھ ڈال کر انہیں الٹ دیا ''میرے پاس پیسے نہیں ہیں''۔ فقیرا زور سے ہنس پڑا ''اوئے جھلّے! پیسے کس نے مانگے ہیں تجھ سے، چل آ جا، میری کوٹھری یہیں اسی قبرستان میں ہے۔ صبح ہی ایک مُردہ دفنایا تھا، اس کے گھر والے میٹھے چاولوں کی دیگ بانٹ گئے تھے۔ ابھی بہت سے چاول پڑے ہیں''۔ میں چُپ چاپ فقیرے کے پیچھے چل پڑا۔ اس کی چھوٹی سی کُٹیا میں ایک جھلنگا سی چارپائی، کونے میں پڑی پانی کی صراحی اور گلاس اور ایک جانب چھوٹی سی دیوار کے پیچھے بنے باورچی خانہ نما کونے میں چند پرانے سلور کے برتن پڑے تھے۔ ایک جانب گینتی، بیلچہ، کدال، رسّی اور قبر کھودنے کا دیگر سامان رکھا ہوا تھا۔ فقیرے نے ایک پلیٹ میں چاول ڈال کر میرے سامنے رکھ دیئے اور مجھے اپنے بارے میں بتاتا رہا کہ وہ یہاں تنہا رہتا ہے۔ شادی اس نے کبھی کی نہیں، اور میری طرح اس کا بھی کوئی رشتے دار نہیں ہے۔ باتوں باتوں میں شام ڈھل گئی اور جب میں فقیرے کی کٹیا سے باہر نکلا تو رات ڈھل چکی تھی۔ میں نے فقیرے سے رخصت چاہی تو اس نے مجھ سے پوچھا ''اب کہاں جائے گا......؟'' ''پتا نہیں، جہاں یہ رستہ لے جائے''۔ فقیرے نے چند لمحے سوچا اور پھر مجھے آواز دے کر روک لیا ''تُو یہیں کیوں نہیں رہ جاتا، تیرا ٹھکانہ بھی ہو جائے گا اور میرا ہاتھ بٹانے والا بھی مجھے مل جائے گا''۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا ''مگر میں یہاں کیا کروں گا......؟'' وہ زور سے ہنسا۔ ''میری طرح قبریں کھودے گا اور کیا کرے گا......؟؟''

(جاری ہے)



.......ہاشم ندیم.......

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف ومنفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ’’خدا اور محبت‘‘ اور ’’بچپن کا دسمبر‘‘ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ’’عبداللہ‘‘ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغہ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ’’عبداللہ‘‘ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

’’پری زاد‘‘ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ’’سنڈے میگزین‘‘ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

میں نے حیرت سے فقیرے کی طرف دیکھا۔ ’’کیا......!! میں نے آج تک کبھی کوئی قبر نہیں کھودی‘‘۔ فقیرا زور سے ہنسا۔ ’’جھوٹ بولتا ہے تُو! ہم سب تو ہر وقت کسی نہ کسی کی قبر کھود رہے ہوتے ہیں۔ فکر نہ کر، میں تجھے سب سکھادوں گا، محنت سے جی تو نہیں چُرائے گا؟‘‘ میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ ’’اب میرے پاس چُرانے کے لیے کچھ نہیں ہے، جی بھی نہیں‘‘۔ فقیرے نے سُنی اَن سُنی کردی۔ ’’ٹھیک ہے پھر آجا اور ہاں، تُو نے یہ کپڑے کیسے پہن رکھے ہیں، لگتا ہے کسی گورے انگریز کی قبر سے چُرا کر لایا ہے یا پھر لنڈے بازار کا مال ہے، گورکن ایسے کپڑے نہیں پہنتے، چل کیا یاد کرے گا، میں تجھے اپنا ایک جوڑا دے دوں گا، کپڑے بدل کر آرام کرلے، صبح بڑا کام کرنا ہے‘‘۔ ہم دونوں اندر جھونپڑی میں داخل ہوگئے۔ فقیرے نے کسی کونے میں پڑے ایک ٹرنک سے ایک بستر نما گدیلا اور ایک چادر نکال کر میرے حوالے کردی۔ ’’یہیں ایک طرف اپنا بستر ڈال لے اور میں رات کو ذرا دیر سے سوتا ہوں، تیری آنکھ لگے تو بھلے سوجانا‘‘۔ فقیرے نے اپنی جیب سے ایک مخصوص برانڈ کی بیڑی ٹنڈولی اور اپنی چارپائی کے تکیے کے نیچے سے ایک پڑیا نکالی اور کاغذ میں لپٹی بہت سی بھورے رنگ کی راڈ نما تیلیوں میں سے ایک چُن کر اُسے اپنی ہتھیلی پر رکھ کر رگڑنے لگا اور کچھ ہی دیر میں وہ اس تیلی کی ایک چھوٹی سی گولی بنانے میں کام یاب ہوگیا۔ پھر اس نے وہ گولی بیڑی کے تمباکو میں شامل کرکے بیڑی دوبارہ جوڑ کر سلگالی۔ جھونپڑی میں ایک عجیب سی ناگوار بُو پھیل گئی۔ فقیرے نے زوردار تیسرا کش لگایا اور دھواں فضا میں پھیلا کر بولا۔ ’’کبھی چرس پی ہے اکبرے......؟‘‘ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ زور سے ہنسا۔ ’’اچھا ہے نہ پیا کر، خون بھی جلا کر پی جاتی ہے یہ کم بخت۔ پر میرا اس کے بنا گزارا نہیں، قبرستان کی راتیں بڑی کالی اور لمبی ہوتی ہیں، سچ بتاؤں تو نوجوانی میں مجھے یہاں اکیلے رہتے بڑا ڈر لگتا تھا، بس انہی دنوں میں یہ لت لگ گئی‘‘۔ فقیرا ساری رات نہ جانے کیا کچھ بڑبڑاتا رہا اور میں چپ چاپ اس کی رام کہانی سُنتا رہا۔ شاید اسے بہت دنوں کے بعد کوئی سُننے والا ملا تھا، پھر نہ جانے رات کے کس پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔ جب تک وہ بولتا رہا، میرا دھیان بٹا رہا، مگر خاموشی ہوتے ہی میرے اندر چُھپے کئی آسیب اور عفریت مجھے سالم نگلنے کے لیے اندھیرے میں میرے سامنے آکھڑے ہوئے۔

مجھے گھر چھوڑے مہینہ بھر ہونے کو آیا تھا۔ اب تک تو انہوں نے تھک ہار کر میری کھوج ختم کردی ہوگی۔ وہاں نیویارک میں عینی کے تمام ٹیسٹ ہوچکے ہوں گے اور شاید آج کل میں اس کا آپریشن بھی ہونے والا ہوگا۔ وہ مجھے عین وقت پر وہاں نہ پاکر کتنی مایوس ہوئی ہوگی، مگر یہ مایوسی یقیناً اُس مایوسی سے کہیں کم ہوگی، جو آنکھیں ملنے کے بعد اسے مجھے دیکھ کر ہوتی۔ عدنان نے ضرور اسے سمجھا بُجھا کر آپریشن پر راضی کرلیا ہوگا۔ کتنی خوش ہوگی وہ، جب پہلی بار، برسوں بعد اس دنیا کے رنگوں کو اپنی خُوب صورت آنکھوں سے دیکھے گی۔ ساری رات باہر قبرستان کے ویرانے سے گیدڑوں، کتّوں کے بھونکنے کی آوازیں آتی رہیں اور فقیرا بے سُدھ پڑا خراٹے لیتا رہا۔ وہاں میرے آس پاس سب ہی تو سو رہے تھے، کچھ اپنی اپنی قبروں میں اور فقیرا اپنی چارپائی پر، بس ایک میں ہی تھا، جسے نیند نہیں آرہی تھی۔ صبح ہوئی تو فقیرا اپنے اوزار اٹھا کر میرے ساتھ کٹیا سے باہر نکل آیا۔ اس نے آس پاس پھر کر نئی قبر کے لیے جگہ منتخب کی اور پھر کسی بوڑھے گدھ کی طرح قبرستان کے داخلی دروازے پر نظریں جما کر بیٹھ گیا۔ گھنٹے بھر بعد ہی کچھ غم زدہ سے لوگ قبرستان میں داخل ہوئے اور فقیرے کو نئی قبر کا بیعانہ پکڑا گئے۔ فقیرے نے ان کے جاتے ہی خوشی سے نعرہ لگایا۔ ’’واہ بھئی اکبرے تُو تو میرے لیے بڑا خوش بخت ثابت ہوا ہے، پتا ہے دو دن سے فارغ بیٹھا تھا میں۔ کوئی مر کر ہی نہیں دے رہا تھا ساری بستی میں۔ چل آجا شاباش، ہمیں گھنٹے بھر میں قبر تیار کرنی ہوگی، وہ لوگ دوپہر کی نماز کے بعد آئیں گے‘‘۔ میں کسی معمول کی طرح کام میں جُت گیا۔ فقیرا اپنے کام کا ماہر تھا، جلد ہی اس نے چھ فٹ گہری قبر کھود کر مغرب کی جانب لحد تیار کرلی۔ ساتھ ساتھ وہ مجھ سے مٹّی اٹھواتا اور قبر کی تیاری کے آزمودہ نسخے بھی بتاتا جارہا تھا۔ میرا جسم پسینے سے شرابور ہوچکا تھا۔ میں نے دبئی کے ابتدائی ایام میں اس سے کہیں زیادہ سخت محنت مزدوری کی تھی، مگر درمیانی عرصے میں مشقت کی عادت مجھ سے چھوٹ گئی تھی، لیکن میں فقیرے کے ساتھ جُتا رہا۔ میں خود کو اس قدر تھکا دینا چاہتا تھا کہ جسم کی ٹوٹتی رگوں سے میرے ماضی کی یادوں سمیت میری جان بھی قطرہ قطرہ بہہ کر نکل جائے۔ ظہر کی نماز کے بعد جنازہ آگیا، مرحوم کے ورثاء نے روتے دھوتے افسردہ اور سوگوار ماحول میں لاش کو قبر میں اتارا اور سب نے مٹّی ڈالنے کا فریضہ سرانجام دیا۔ فقیرا اس تمام عرصے میں ایک جانب لاتعلق سا بیٹھا بیڑیاں پھونکتا رہا، مگر یہ رات والی ’’خاص‘‘ بیڑی نہیں تھی۔ میں بھی اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ فقیرے نے مجھے کہنی ماری۔ ’’ابھی دیکھنا کچھ ہی دیر میں ان رونے دھونے والوں میں سے سگریٹ پینے والے دھیرے دھیرے ایک جانب سرکنا شروع ہوجائیں گے اور ایک دو کی ٹولیوں میں کھڑے ہوکر سگریٹ، بیڑی پھونکیں گے اور اپنے کاروبار کی باتیں شروع کردیں گے‘‘۔ اور پھر کچھ دیر میں واقعی ایسا ہی ہوا۔ میں نے حیرت سے فقیرے کی طرف دیکھا۔ وہ مُسکرایا۔ ’’برسوں سے دیکھ رہا ہوں یہ ڈراما...... سگریٹ ایسی بلا ہے، جو موت بھی بُھلا دیتی ہے اور تجھے اب کیا بتاؤں اکبرے، میں نے تو یہاں جنازے پر بھی نشے میں دُھت لوگوں کو آتے دیکھا ہے، کم بخت کہیں بیٹھے پی رہے ہوتے ہیں کہ کسی اپنے کی موت کا پیغام آجاتا ہے، بھاگے دوڑے قبرستان تو پہنچ جاتے ہیں، آخری منہ دکھائی کے لیے، مگر قدم زمین پر نہیں پڑتے ٹھیک طرح‘‘۔ میں نے فقیرے کے ہاتھ میں پکڑی بیڑی غور سے دیکھی۔ ’’تم بھی تو سارا دن یہ دھواں اندر انڈیلتے رہتے ہو، میں نے سُنا ہے اس سے کینسر ہوجاتا ہے‘‘۔ فقیرے نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی پر قابو پایا۔ ’’تُو بھی ان جاہلوں کی باتوں پر یقین کرتا ہے اکبرے، میری عمر ساٹھ سال سے اوپر ہے، پندرہ سال کی عمر میں، میں نے پہلا کش لگایا تھا، یقین کر آج تک کبھی زکام بھی نہیں ہوا مجھے، جب کہ میں نے اسی قبرستان میں اپنے ہاتھوں سے ایسے تیس پینتیس سال کے جوان مُردے بھی دفنائے ہیں، جنہوں نے عمر بھر تمباکو کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا اور اُن کے ساتھ آنے والے اس بات پر حیران تھے کہ نہ تو سگریٹ پیتا تھا، نہ شراب، پھر اچانک ہی کیسے گزر گیا۔ اب بول کیا بولتا ہے، تیرے حساب سے تو مجھے کب کا کینسر سے مرجانا چاہیے تھا‘‘۔ میں لاجواب ہوگیا۔ ’’تو پھر یہ ہر سگریٹ اور بیڑی کے پیکٹ پر موت کا ڈراوا کیوں لکھ دیتے ہیں؟‘‘ فقیرے نے دبا دبا سا قہقہہ لگایا تاکہ اس کی آواز قبر پر مٹّی ڈالتے ورثاء تک نہ پہنچے۔ ’’مجھے تو یہ بھی کچھ بڑوں کی دکان داری لگتی ہے اکبرے! یہ کیا بات ہوئی بھلا زہر ہے، تو پھر بیچتے کیوں ہیں کُھلے بازار میں، بند کردیں اس کی فروخت‘‘۔ مرحوم کے ورثاء دعا سے فارغ ہوکر دھیرے دھیرے پلٹ رہے تھے۔ قبر پر عطر، کیوڑے اور گلاب کی پتّیوں کا چھڑکاؤ کردیا گیا تھا۔ فقیرے نے جاتے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ ’’اب کچھ دن تک اس قبر کے اوپر بڑی رونق رہے گی، روزانہ کچھ لوگ آئیں گے، پھر دھیرے دھیرے ویرانی چھا جائے گی، سب اپنی اپنی دنیاداری میں اُلجھ کر یہاں سوئے شخص کو بھول جائیں گے، ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے اکبرے......!‘‘

شام ڈھلنے سے کچھ دیر قبل فقیرا بازار سے لوٹا تو اس کے ہاتھ میں کھانے پینے کا بہت سا سامان اور تازہ بیڑی کے کچھ بنڈل تھے۔ اس نے کچھ روپے میرے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ ''یہ تیری مزدوری کا حصّہ ہے، آدھے پیسوں کا میں سامان لے آیا ہوں''۔ میں نے وہ روپے دوبارہ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔ ''یہ تم ہی رکھو، اب مجھے ان کی ضرورت نہیں پڑتی''۔ فقیرے نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پھر زور سے ہنس پڑا۔ ''تُو بھی پورا ملنگ ہے، چل ٹھیک ہے، میرے پاس ہی جمع رہنے دے''۔ رات ڈھلی تو باہر قبرستان میں کچھ فاصلے پر عجیب سی جنتر منتر پڑھنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ فقیرا جھونپڑی کے باہر بیٹھا بیڑی پھونک رہا تھا۔ ''یہ آوازیں کیسی ہیں؟'' فقیرے نے حسب عادت بلاوجہ قہقہہ لگایا۔ ''کوئی عامل کسی زنانی کو بے وقوف بنانے کے لیے منتر پڑھ رہا ہے''۔ میں نے دُور اندھیرے میں دیکھا تو واقعی کوئی جعلی پیر نما شخص چغہ پہنے دو تین عورتوں سمیت ایک قبر کے گرد بیٹھا آگ جلائے کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ ''یہ سب کیا ہے فقیرے......؟'' ''یہ عورت اپنے شوہر کے ظلم سے پریشان ہے اور اپنی سوکن کو اسی قبرستان میں پہنچانا چاہتی ہے، لہٰذا اس نے اپنی ماں اور بہن کے ساتھ مل کر اس عامل کو کالے عمل کے لیے رقم دی ہے، یہ بے وقوف عورتیں گھر سے چھپ کر یہاں آئی ہیں اور رات بھر میں اچھی خاصی رقم اس ڈھونگی کو پکڑا کر واپس چل دیں گی''۔ میں نے حیرت سے فقیرے کو دیکھا۔ ''مگر تم اپنے قبرستان میں یہ ڈرامے بازی کیوں ہونے دے رہے ہو؟'' ''اوئے اکبرے! تُو واقعی بڑا بھولا ہے، جھلّے! یہ عامل مجھ سے پہلے ہی سودا کر چکا ہے، آدھے پیسے میری جیب میں آئیں گے۔ کبھی کبھی تو ان جھوٹے عاملوں کے کہنے پر میں خود ہی کسی پرانی قبر میں لیٹ جاتا ہوں اور ان کے عمل کے بیچ میں منہ سے ڈراؤنی آوازیں نکالتا ہوں، تاکہ باہر بیٹھے لوگ اپنے پیر صاحب کی ''کرامت'' کا یقین کرلیں، یاد رکھ اکبرے، قبرستان میں جو بھی دھندا ہوتا ہے، اس کا آدھا حصّہ قبرستان کے رکھوالے اور گورکن کو جاتا ہے''۔ میں حیرت سے منہ کھولے فقیرے کی باتیں سُن رہا تھا۔ میں تو جیتے جاگتے انسانوں کی دنیا کے پھندوں اور مکروفریب کے جال کو رو رہا تھا، مجھے کیا پتا تھا کہ یہاں مُردوں کی بستی کے بکھیڑے زندوں سے بھی نرالے ہیں۔ اُس رات فقیرے نے مجھے یہ بھی بتایا کہ پرانی اور خالی قبریں باقاعدہ نشے بازوں اور جواریوں کو کرائے پر دی جاتی ہیں، تاکہ وہ رات بھر اپنا شغل اطمینان سے جاری رکھ سکیں۔ علاقہ حوالدار بھی حصّہ ملنے کے بعد یہاں کا رُخ نہیں کرتا۔ جعلی عامل اور پیر اپنے نئے گاہکوں پر اثر اور رعب ڈالنے کے لیے پہلی ملاقات ہی میں انہیں اپنے ڈیرے سے سیدھا فقیرے کے قبرستان بھیج دیتے ہیں کہ جاکر فلاں قبرستان کی فلاں قبر کے سرہانے کھدائی کرو، تمہارے خلاف دبایا گیا تعویذ یا سفلی عمل وہیں ملے گا۔ ضرورت مند بے چارا بھاگا بھاگا قبرستان آتا ہے، جہاں فقیرا پہلے ہی سے کسی کالی مرغی کا سر، سڑے ہوئے انڈے یا کسی بکرے کی سری دبا چکا ہوتا ہے۔ سائل اپنے عامل کی کرامت کا بھرپور نظارہ دیکھ کر اپنی عمر بھر کی پونجی عامل پر لٹا دیتا ہے اور فقیرے کا حصّہ اُسے مل جاتا ہے''۔ میں دن بھر بیٹھا حیرت سے فقیرے کی باتیں سُنتا رہا۔ ''ہر جا جہانِ دیگر'' کا مطلب مجھے اب سمجھ آرہا تھا۔ میرا دن تو ان سب روزمرہ کی مصروفیات میں گزر جاتا تھا اور میں خود کو شدید حد تک تھکانے کے لیے فقیرے کے حصّے کا کام بھی خود کرنے لگا تھا، مگر رات کاٹے نہیں کٹتی تھی۔ اچانک ہی کسی پہر وہ میری آنکھوں کے دریچے کھول کر میرے دل کے آنگن میں آکر بیٹھ جاتی، میں لاکھ خود کو چھپاتا، اپنی آنکھیں میچ لیتا، مگر وہ مجھ سے ہم کلام رہتی۔ مجھے اپنے شب و روز بتاتی، میری کرخت انگلیاں، کدال اور بیلچہ چلانے سے کھردرے چھالوں بھرے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگاتی اور مجھ سے شکوہ کرتی کہ میں اسے تنہا چھوڑ کر کہاں چلا گیا ہوں، پھر میں گھبرا کر اٹھ بیٹھتا اور جھونپڑی سے باہر نکل کر ساری رات تارے گنتا رہتا۔

ایک ایسی ہی رات فقیرا بھی میری آہٹ پر باہر آگیا۔ ''کیا بات ہے اکبرے! تُو سوتا کیوں نہیں ہے، کوئی پریشانی ہے، تو مجھے بتا، جوان جہان بندہ ہے تُو، کہیں کوئی عشق وشق تو نہیں ہوگیا تجھے......؟'' میں مُسکرا دیا۔ ''کیوں کیا وہ سارے جو راتوں کو جاگتے ہیں، ان سب کو عشق کی بیماری ہوتی ہے کیا؟'' فقیرا بھی ہنس پڑا۔ ''ہاں اپنا تجربہ تو یہی کہتا ہے کہ جوانی کے یہ رت جگے عشق کا نتیجہ ہوتے ہیں، تُو شادی کیوں نہیں کرلیتا، کب تک یوں اکیلا در بدر خوار ہوتا رہے گا؟'' ''اور اگر یہی سوال میں تم سے پوچھوں کہ تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی، تو پھر......؟'' فقیرے نے ایک لمبی سی سرد آہ بھری۔ ''او نئیں یار......! یہ زنانیاں بڑی مطلبی ہوتی ہیں، ان سے بندہ دُور ہی رہے تو اچھا ہے، میں نے تو آج تک یہی دیکھا ہے کہ دنیا میں جتنے مسئلے ہوتے ہیں، انہی کی وجہ سے ہوتے ہیں، اچھا خاصا مرد اُن کے چکر میں نہ دین کا رہتا ہے، نہ دنیا کا''۔ میں نے غور سے افسردہ فقیرے کو دیکھا۔ ''پھر تو میرا شک سولہ آنے سچ ہے کہ تم نے بھی کبھی کسی سے بھرپور عشق کیا ہے فقیرے...... ورنہ یوں غم زدہ نہ بیٹھے ہوتے''۔ فقیرے نے تازہ بیڑی سلگائی۔ ''کیوں دل پشوری کرتا ہے اکبرے، ہاں تھی ایک...... یہیں قبرستان میں ملاقات ہوئی تھی، جوانی میں بیوہ ہوگئی تھی، میں نے اس پر بڑا خرچہ کیا، ہر مشکل وقت میں سہارا دیا، پر جیسے ہی اسے مجھ سے بہتر بندہ ملا، دو بول نکاح کے پڑھوا کر جانے کہاں چلی گئی، پلٹ کر پوچھا بھی نہیں مجھ سے۔ بس، اُسی دن سے میرا ان عورتوں سے اعتبار اٹھ گیا، میری بات کان کھول کر سن لے اکبرے، یہ زنانیاں کسی کی نہیں ہوتیں، کبھی ان کے چکّر میں نہ پڑنا''۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ یہ واردات مجھ پر جانے کتنی مرتبہ بیت چکی ہے۔ اگلی رات دُور کسی قبر کے سرہانے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ اگرچہ میں ان باتوں کا بہت حد تک عادی ہوچکا تھا، مگر آواز میں اتنا درد تھا کہ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں کٹیا سے باہر نکلنے لگا تو فقیرے نے مجھے آواز دے کر روک لیا۔ ''باہر نہ جا اکبرے! کوئی دکھیاری ہے، قبر پر چلّہ کاٹنے آئی ہے اولاد کے لیے''۔ میں نے حیرت سے فقیرے کو دیکھا۔ ''مگر قبر پر چلّہ کاٹنے سے بے اولادی کیسے دُور ہوسکتی ہے؟'' فقیرے نے جھنجلا کر کہا۔ ''تُو سمجھتا کیوں نہیں، یہ سارے کم زور عقیدے کے لوگ ہیں، میں نے تو یہاں عورتوں کو اولاد کی خواہش میں کسی نومولود بچّے کی قبر پر نہانے کا نسخہ لے کر آتے بھی دیکھا ہے، بس جو ہو رہا ہے، اسے ہونے دے۔ ہم ان کو یہاں آنے سے روکیں گے، تو یہ کسی اور قبرستان چلے جائیں گے۔ تُو چپ کرکے سوجا''۔ میں نے زمین پر سر ٹکا لیا، مگر میرا دھیان اب بھی باہر تھا۔ ''فقیرے......! کیا تم نے کبھی کوئی اچھی بات نہیں دیکھی اس قبرستان میں؟'' ''ہاں بالکل دیکھی ہے، ایک بار کسی اللہ والے کو دفنا گئے تھے، لوگ یہاں۔ پتا نہیں، کتنے دن اس کی قبر سے تازہ گلاب کی خوشبو آتی رہی اور کبھی کبھی تو رات کے اندھیرے میں مجھے وہ قبر بہت نورانی بھی محسوس ہوتی تھی، جیسے روشنی نکل رہی ہو اندر سے، اور کبھی کبھی کسی گناہ گار کی قبر سے عذاب کی آوازیں بھی سنائی دے جاتی ہیں۔ دیکھ اکبرے...... قبر میں جانے کے بعد بندے کا رابطہ ڈائریکٹ اس کے رب کے ساتھ ہوجاتا ہے، پھر میرے تیرے جیسے گناہ گار انسانوں کو ان معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے، سوجا چپ کرکے، کل صبح فجر کے بعد ہی ایک قبر کھودنی ہے، تگڑی رقم ملے گی ان شاءاللہ''۔

اگلے روز فقیرا کہیں سے اخبار اٹھا لایا۔ ''چل بھئی اکبرے، منڈوا دیکھنے چلتے ہیں''۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''منڈوا......؟'' ''ہاں یار! وہ کیا کہتے ہیں سنیما، یہ دیکھ بڑی زبردست پکچر لگی ہے بازار والے سنیما میں''۔ میں نے اخبار پر نظر دوڑائی تو میرے ہاتھ کپکپا سے گئے۔ لبنیٰ کی فلم ریلیز ہوچکی تھی اور سُپر ہٹ ہوکر سلور جوبلی منانے کو آئی تھی۔ میں بہت دیر تک فلم کی خبریں پڑھتا رہا۔ اسے لبنیٰ عرف شہ پارہ کے کیریئر کی بہترین فلم قرار دیا جارہا تھا۔ شہ پارہ کا انٹرویو بھی چھپا تھا، جس میں اس نے کُھل کر مجھے یاد کیا تھا اور کہا تھا کہ پری زاد نہ ہوتا تو یہ فلم کبھی بن ہی نہ پاتی۔ اس نے میرے لیے پیغام بھی چھوڑا تھا کہ میں جہاں کہیں بھی ہوں، یہ جان لوں کہ شہ پارہ کا خواب پورا ہوگیا ہے اور اس نے پری زاد کو اپنا خواب گر، اپنا سب سے بڑا محسن قرار دیا تھا۔ میں ایک دم بہت اداس ہوگیا۔ میں نے فقیرے کو اکیلے فلم دیکھنے کے لیے بھیج دیا۔ فلمیں وہ لوگ دیکھتے ہیں، جو خواب دیکھنا جانتے ہوں، وہ اپنے کسی خواب کو سنیما کے پردے پر جیتا جاگتا دیکھنا چاہتے ہیں، مگر میرا تو کوئی خواب ہی نہیں بچا تھا، سب سپنے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوچکے تھے، میں بھلا اب اس قابل ہی کہاں تھا کہ کوئی خواب دیکھ سکتا۔ فقیرے کے جانے کے بعد میں نے سارے اخبار کو دوبارہ غور سے دیکھا۔ مجھے گھر چھوڑے ہوئے چھ ماہ سے زائد ہوچکے تھے، مگر اخبار کو دیکھ کر لگتا تھا، جیسے کل کی بات ہو۔ وہی بزنس اور کاروبار کی خبریں، وہی جھگڑے فساد کی باتیں، وہی شادی، بیاہ کی تقریبات، وہی دنیا فتح کرلینے کے دعوے...... کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ ہم انسان کتنے بھولے ہوتے ہیں، جو یہ سوچ لیے

بیٹھے ہوتے ہیں کہ ہمارے جاتے ہی سب کچھ رُک جائے گا یا بدل جائے گا، مگر کچھ نہیں رکتا، کچھ نہیں بدلتا۔ سب کچھ ویسا ہی رہتا ہے، بس ہم نہیں ہوتے۔ گویا ہمارا ہونا نہ ہونا سب برابر ہے، تو پھر اس نہ ہونے کے برابر ہونے کا اتنا زعم کیوں، اتنا گھمنڈ کس لیے......؟ مجھے پھر اس دشمنِ جاں کا خیال ستانے لگا۔ اب تک تو اس کی بینائی واپس آچکی ہو گی، جانے وہ واپس آنے کے بعد مجھے یاد بھی کرتی ہو گی کہ نہیں۔ میں آتے وقت دفتر اور گھر سے اپنی ہر ممکنہ تصویر جلا کر وہاں سے نکلا تھا، تاکہ جب کبھی عینی واپس آئے تو اسے میری کوئی بھی مورت دکھائی نہ دے جائے۔ ویسے بھی میں شروع ہی سے تصویریں کھنچوانے سے گریز کرتا تھا۔ وہ ایک بار تو ضرور میرے گھر یا دفتر آئی ہو گی اور اس کی آنکھوں نے مجھے وہاں کھوجا بھی ضرور ہو گا۔ کیسی دِکھتی ہوں گی، اس کی وہ کھوجتی ہوئی آنکھیں......اس نازنین نے میرے دفتر اور گھر کے نرم قالین پر اپنے نازک قدم رکھتے ہوئے میرے زیرِ استعمال چیزوں کو چھوا بھی ضرور ہو گا۔ پھر وہ عدنان کے شانے پر سر رکھ کر بہت دیر روتی رہی ہو گی، مگر عدنان نے اسے سنبھال لیا ہو گا۔ اس کی کومل جبیں کو عدنان کا شانہ ہی جچتا تھا۔ میری اس بے وقعت زندگی کے لیے تو بس اتنا ہی کافی تھا کہ میں کسی طور اس کی یادوں میں زندہ رہوں۔ کہ میں تمہارے ہی دَم سے زندہ ہوں......مر ہی جاؤں، جو تم فرصت ہو۔

مگر مجھ جیسے کم نصیبوں کو مرنے کی فرصت بھی کہاں میسّر تھی۔ دن، ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے گئے اور پھر ایک دن فقیرا صبح سویرے کسی کام سے بازار گیا تو شام تک واپس نہ لوٹا۔ میں جھونپڑی کے باہر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک پولیس کی پُرانی ولیز جیپ قبرستان میں داخل ہوئی اور میرے قریب آکر رُک گئی۔ خاکی رنگ کی جیپ سے دو سپاہی نیچے اُترے اور ان میں سے ایک نے حسبِ عادت کڑک کر مجھ سے پوچھا۔ ''اکبر تیرا ہی نام ہے؟'' میں کھڑا ہو گیا۔ ''ہاں، سب خیر تو ہے......؟'' ''خیر نہیں ہے، تیرے ساتھی فقیرے پر ساتھ والے چھوٹے قبرستان کے گورکن سلامے اور اس کے دوستوں نے حملہ کر دیا ہے، اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے، جلدی چل، وہ تجھ سے ملنا چاہتا ہے''۔ میں بوکھلایا سا اُن کے ساتھ جیپ میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی۔ پولیس والوں کی آپس میں بات چیت سے مجھے پتا چلا کہ ان دونوں کی بہت پُرانی دشمنی چل رہی تھی، قبرستان کی حد بندی پر، اور آج فقیرا، سلامے اور اس کے ساتھیوں کے ہتھے چڑھ ہی گیا۔ ہم اسپتال پہنچے تو فقیرا آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''دیکھ لے اکبرے! قبرستان کے دھندے نے قبر تک پہنچا دیا، پر تُو ایسی غلطی نہ کرنا، بندہ جتنی بھی حد بندیاں کر لے، اس کی آخری حد اس کی قبر ہی ہوتی ہے''۔ فقیرا دھیرے دھیرے پھر سے غنودگی میں چلا گیا اور پھر دوبارہ کبھی ہوش کی دنیا میں واپس نہیں آیا۔ سلاما اور اس کے ساتھی قتلِ عمد کے جرم میں پکڑے گئے اور سرکاری وکیل نے عدالت کے ذریعے انہیں سولی تک پہنچانے کا پورا بندوبست کر لیا۔ فقیرے کو اسی کی جاگیر، قبرستان کی چھوٹی سی قبر میں اتار دیا گیا۔ میرا جی اچاٹ ہو گیا اور فقیرے کے چالیسویں کے بعد میں نے اپنی پوٹلی اٹھائی اور اسٹیشن سے پہلی گاڑی پکڑ لی، پھر سے وہی سفر اور وہی انجان رستے......! مگر میری حالت روز بہ روز ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ جاڑے کا اثر تھا یا پھر مسلسل برسات کا، مگر میرا بدن تپنے لگا اور پھر شدید تیز بخار نے مجھے آگھیرا۔ مجبوراً مجھے ایک چھوٹے سے ویران اسٹیشن پر اترنا پڑا۔ فقیرا مجھے ملنگ کہہ کر چھیڑتا تھا، مگر اب میرا حلیہ اور میری ظاہری حالت واقعی کسی ملنگ سے بھی بدتر تھی۔ رات ڈھل رہی تھی اور اسٹیشن ویران پڑا تھا۔ مجھے شدید سردی لگ رہی تھی، لہٰذا میں نے اپنی پرانی چادر کی بُکل مار کر خود کو اچھی طرح لپیٹ لیا۔ دُور چائے کے ٹھیلے پر گرم گرم چائے بن رہی تھی۔ ٹھیلے پر بدنما سی لکھائی میں لکھا تھا ''خانو کی چائے، ہر غم بھگائے'' ٹھیلے والے نے مجھے ٹھٹھرتے دیکھا تو ایک کپ چائے لے کر میرے قریب آ گیا۔ ''چائے پیو گے؟'' میں نے انکار کیا۔ ''نہیں مجھے طلب نہیں ہے''۔ ٹھیلے والے نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''عجیب بھکاری ہو، بھئی میں خود اپنی مرضی سے دے رہا ہوں، تجھ سے پیسے نہیں مانگ رہا خانو!'' میں نے غصّے سے اس کی طرف دیکھا۔ ''بھکاری......؟ ہاں ٹھیک کہا تم نے، میں بھکاری ہی ہوں، بہت بھیک مانگی ہے میں نے ساری زندگی، پر کچھ نہیں ملا......اب کچھ چاہیے بھی نہیں، جاؤ مجھے تنگ مت کرو''۔ خانو جانے میری ڈانٹ کو کیا سمجھا کہ اس کا لہجہ ایک دم عاجزانہ ہو گیا۔ ''معاف کرنا سائیں! تم تو کوئی اللہ لوک ہو، مجھ سے گستاخی ہو گئی''۔ میں نے اسے جھاڑ دیا۔ ''بے وقوفی کی باتیں مت کرو، میں کوئی سائیں نہیں ہوں، اکیلا چھوڑ دو مجھے!'' خانو نے جاتے جاتے بھی تین بار مڑ کر مجھے دیکھا۔ میں نے تھک کر ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگالی، جس کے تنے کے ارد گرد پکی اینٹوں اور سیمنٹ کا چوبارہ اٹھا کر ایک گول پلیٹ فارم سا بنا دیا گیا تھا۔ پھر مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں کب مکمل بے سُدھ ہو کر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا اور پھر جب میری آنکھ کھلی تو سورج کی تیز کرنوں نے میری آنکھیں چندھیا دیں۔ میرے ارد گرد لوگوں کی بھیڑ اکٹھی تھی اور وہ سب آپس میں نہ جانے کیا سرگوشیاں کر رہے تھے۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر خانو نے سب کو ڈانٹ کر ایک طرف سمیٹا۔ ''چلو بابا......! کیا بھیڑ لگا رکھی ہے......جوگی بابا کو ہوش آ گیا ہے، شاید لمبے مراقبے میں چلے گئے تھے''۔ میں نے چونک کر آس پاس کھڑے لوگوں کو دیکھا تو میری آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ’’خدا اور محبت‘‘ اور ’’بچپن کا دسمبر‘‘ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ’’عبداللہ‘‘ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انھیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ’’عبداللہ‘‘ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چُکے ہیں۔

’’پری زاد‘‘ ایک اچھوتے، حسّاس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ’’سنڈے میگزین‘‘ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

وہ سب ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لیے یوں سر جھکائے میرے ارد گرد دائرے میں کھڑے تھے، جیسے میں کوئی پیر، ولی یا بزرگ ہوں۔ میں گھبرا کر کھڑا ہوا اور نقاہت سے چکرا گیا۔ میرے ڈگمگاتے جسم کو تھامنے کے لیے کئی ہاتھ بہ یک وقت آگے بڑھے، تو میں نے سب کو جھٹک دیا۔ ’’تم لوگوں کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا، جاؤ یہاں سے، مجھے تنہا چھوڑ دو‘‘۔ خانُو نے دوبارہ سب کو جھاڑا، جیسے وہ میرا نائب ہو۔ ’’سُنا نہیں بابا! جاؤ یہاں سے ابھی۔ سائیں جلال میں ہے‘‘۔ لوگ عقیدت سے سلام کرتے وہاں سے بادل نخواستہ چھٹنے لگے۔ خانُو نے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے پوچھا۔ ’’کھانا کھاؤ گے سائیں؟‘‘ میرا صبر جواب دے گیا۔ ’’آخر تم میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟‘‘ خانو منمنایا۔ ’’آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں سائیں! شاید آپ کی دعا سے خانُو کے دن پھر جائیں۔ پچھلے سال باڑھ میں میرا سب کچھ بہہ گیا تھا۔ اِدھر ٹرینوں کی بدحالی نے بھی دھندا مندا کر دیا ہے سائیں‘‘۔ میں نے جھنجھلا کر اسے دھتکارا۔ ’’جاہل انسان! تم میری بات کیوں نہیں سمجھتے۔ میں کوئی پیر فقیر نہیں ہوں، اگر میری دُعا میں اثر ہوتا، تو آج میں خود یوں دربدر خوار نہ ہوتا‘‘۔ مگر خانُو ٹس سے مس نہ ہوا۔ آخر کب تک ہم ظاہر پرست انسان بیرونی حُلیے اور لباس کی بنیاد پر لوگوں کے زُہد و تقویٰ کا فیصلہ کرتے رہیں گے؟ سر اور داڑھی کے بے تحاشا بڑھے بال، چہرے اور لباس پر وقت کی دُھول اور غم کی شکنیں، چادر پر درد کی سلوٹیں اور جھولی میں ناکامیوں کے کیکر اور کانٹے...... کیا کسی جوگی کا یہ حلیہ کافی ہوتا ہے، اُسے درویش ثابت کرنے کے لیے؟ میں نے جان چُھڑوانے کے لیے بے زاری سے کہا۔ ’’اگر تمہاری تسلّی میری دُعا ہی سے ہوتی ہے، تو جاؤ میں نے تمہیں دعا دی‘‘۔ خانو کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں اور وہ آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر جانے کیا کیا منّتیں مانگتا وہاں سے ٹل گیا۔ میں نے تھک کر دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ ان چھوٹے دیہات، قصبوں کے لوگ کتنے سادہ لوح ہوتے ہیں یا پھر شاید آج کا انسان اپنے غم کے ہاتھوں اس قدر ٹوٹا ہوا ہے کہ اُسے ہمیشہ کسی مسیحا کا انتظار رہتا ہے۔ کاش! انہیں کوئی سمجھا سکتا کہ میں مسیحا نہیں۔ اُن سے زیادہ دنیاداری کے داغوں سے اٹا برص کا وہ مریض ہوں، جو خود ’’شفائے عشق‘‘ کی تلاش میں زمانوں سے بھٹک رہا ہے۔ بہ مشکل ایک دن ہی سکون سے گزر پایا اور اگلی صبح جب میں اپنے بخار سے تپتے جسم کو ایک بوسیدہ سے کمبل میں لپیٹے درخت کے نیچے لیٹا تھا، تب ہی اچانک وہی بے وقوف خانُو دور سے ہاتھ میں نہ جانے کیا کاغذ پکڑے، لہراتا شور مچاتا میرے قدموں سے آ کر لپٹ گیا۔ ’’تم واقعی اللہ لوک ہو سائیں! کمال کر دیا ایک ہی رات میں، جیو سائیں...... جیو‘‘۔ میں نے جلدی سے اپنے پیر لپیٹ کر اسے دھکا دیا۔ ’’ہٹو پیچھے، یہ کیا کر رہے ہو؟‘‘ خانُو خوشی سے چلّایا۔ ’’سائیں! یہ دیکھو، آپ کی دُعا سے میرا دس ہزار کا بانڈ نکل آیا ہے۔ سارے دلِدّر دُور ہو گئے، پھر بھی تم کہتے ہو کہ تم میرے سائیں نہیں ہو۔ مجھے اپنے قدموں میں پڑا رہنے دو‘‘۔ کچھ ہی دیر میں آس پاس تمام ریلوے اسٹیشن کے عملے تک یہ خبر پہنچ چکی تھی اور اگلے چند دنوں کے اندر میری زندگی میں نت نئے عذابوں کا ایک دَور شروع ہو گیا۔ میرے ارد گرد قریب اور دُور دراز کے سادہ لوح دیہاتیوں کا ایک ہجوم جمع رہتا، جو میرے قدموں میں دس، بیس اور پچاس کے نوٹ نذرانے کے طور پر پھینک کر نہ جانے کون کون سی منّتیں پوری کرنے کی دعائیں مانگتے رہتے۔ میں جتنا ان لوگوں کو دھتکارتا اور قدموں میں پڑی اس ریزگاری کو لات مارتا، اُتنا ہی ان کی نظر میں معتبر ٹھہرتا۔ میرے بخار اور نقاہت نے مجھے اس قابل بھی نہیں چھوڑا تھا کہ میں کسی رات منہ اندھیرے چپ چاپ وہاں سے کسی اور منزل کی جانب نکل جاؤں، لیکن میں جاتا بھی تو کہاں جاتا؟ ہر طرف اُسی انسان کا سامنا تھا مجھے۔ اور بھلا انسان سے بڑا امتحان اور کیا ہو گا اس جہانِ خراب میں۔ خانُو مجھے اس بھیڑ کے ہاتھوں آزار میں مبتلا دیکھتا تو ڈانٹ ڈپٹ کر لوگوں کو

وہاں سے ہٹا دیتا، مگر دو چار گھنٹے بعد پھر وہی ہجوم، پھر وہی بھانت بھانت کے انسان اور ان کی عجیب و غریب فرمائشیں، کوئی عورت دُہائی دیتی۔ ’’سائیں! میری بہو، بیٹا نہیں جَنتی، چار لڑکیاں اوپر تلے سینے پر مونگ دَل رہی ہیں، دعا کرو اس بار بیٹا ہو جائے‘‘۔ کوئی دوسرا کہتا۔ ’’بیٹے کو نوکری نہیں ملتی جوگی سائیں! بس، ایک نوکری دلا دو‘‘۔ تیسری جانب سے ایک اور آواز آتی۔ ’’بس ایک دُکان کا سوال ہے سائیں، کاروبار جما دو‘‘۔ میں آنکھیں بند کیے منہ لپیٹے پڑا رہتا اور وہ میری خاموشی ہی کو میری دُعا سمجھ کر کچھ دیر رونے دھونے کے بعد اٹھ کر چلے جاتے۔ اُن میں سے کوئی نہ جانے کب لکڑی کی ایک تختی پر جلی حروف میں ’’آستانہ جوگی سائیں‘‘ لکھوا کر لے آیا اور تختی کو درخت کے ایک اونچے حصے پر کیل سے ٹھونک گیا۔ وہ لوگ میری نقاہت اور بیماری کو میرا روزہ یا فاقہ سمجھتے تھے اور میری مردم بے زاری کو پیری فقیری کی نشانی، اُوپر سے قدرت بھی عجب طرح مہربان تھی۔ میرے ارد گرد موجود لوگوں کے جمگھٹے میں سے کسی نہ کسی کی مُراد بر آتی اور وہ اُسے میری ’’کرامات‘‘ کے کھاتے میں ڈال دیتا۔ سو میں سے باقی اُن ناوے ناکام، مُرادوں کو کوئی نہیں گنتا تھا، جو کبھی پوری نہیں ہو پاتی تھیں۔ کالی رات کے گُھپ اندھیرے میں ایک معمولی دیا سلائی بھی دُور سے جلتی نظر آ جاتی ہے۔ آس پاس بکھری تاریکیوں پر کوئی نظر نہیں ڈالتا۔ میں نے کئی بار کوشش کی کہ وہاں سے چپ چاپ اٹھ کر کسی روز اسٹیشن سے گزرتی کسی گاڑی میں بیٹھ کر کہیں دُور نکل جاؤں۔ ایک آدھ بار نظر بچا کر اسٹیشن سے باہر سڑک پر بھی نکل آیا، مگر یہ جوگی سائیں کا لقب اور حلیہ آس پاس اور دُور دراز کے علاقوں میں میری کچھ ایسی پہچان بن چکا تھا، جیسے قیدی کے پیروں میں بیڑیاں یا کسی پیدائشی غلام کے ماتھے پر گُھدی کوئی سیاہ مُہر۔ میں جہاں بھی جاتا، میری پیشانی پر ثبت یہ غلام کی مُہر لوگوں کو میرے ارد گرد اکٹھا کر دیتی، میرا دم گھٹنے لگتا، میں گھبرا کر انہیں جھڑکتا، دُور ہٹاتا، وہ میرے اور قریب آتے اور تھک ہار کر میں واپس اُسی آستانے کی راہ لیتا، جہاں سے یہ مُہرِ غلامی میری جبیں پر کندہ کی گئی تھی۔ ایک آدھ بار کسی ویرانے کی راہ بھی اپنائی، مگر مجھ جیسے سیاہ بختوں کو ویرانہ بھی راس نہیں آتا۔ وہاں میری خبر زیادہ تیزی سے پھیلتی اور پھر جمع ہوتی خلقت کی وجہ سے اس ویرانے کی حُرمت بھی مجروح ہو جاتی تھی۔ میں دنیا کو دھتکارتے دھتکارتے تھک کر نڈھال ہو چکا تھا۔ کیسی عجیب ہے یہ دنیا، جب انسان اسے اپنانا چاہتا ہے، یہ اسے دھکے دے کر دُور بھگاتی ہے، خوار کرتی ہے، ہر پل سسکا کر تڑپاتی ہے، مگر جب وہی انسان دنیا سے بے زار ہو کر اسے لات مارتا ہے اور کنارہ کش ہونے کی کوشش کرتا ہے، تب یہی دنیا خود اس کے قدموں سے لپٹ کر منّتیں، ترلے کرتی ہے کہ اسے ٹھکرا کر نہ جائے۔ اور پھر مجھ جیسوں کا سفر بھی بھلا کیا سفر تھا، میرے لیے تو سب علاقے، جگہیں، لوگ، موسم اور رویّے، سب ہی ایک جیسے تھے۔ کم از کم خانُو والے ریلوے اسٹیشن پر میرے پوشیدہ رہنے کے لیے ایک بھیس تو موجود تھا، لہٰذا مختلف علاقوں کی خاک چھاننے کے بعد میں دوبارہ اسی جگہ پہنچ گیا، جس کی مٹی سے میرے اس نئے بہروپ کا خمیر اٹھایا گیا تھا۔ مجھے واپس وہاں پا کر سارے اسٹیشن پر

جشن سا برپا ہو گیا۔ اُداس بیٹھے خانُو نے نعرے لگا لگا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ’’سائیں! کیا بتاؤں تم کو، جب سے تم روٹھ گئے ہو۔ سارا دھندا مندا ہو گیا ہے۔ سب پریشان ہیں، کہتے ہیں سائیں کی برکت اٹھ گئی ہے یہاں سے، اسی لیے کال پڑ گیا ہے، مگر اب یہ ویرانی دُور ہو جائے گی۔ بس سائیں، اب ہم سب کا بیڑہ پار ہے‘‘۔ میں چپ چاپ بیٹھا اس بے وقوف کی داستان سُنتا رہا۔ دوسرے روز ہی علاقے کی ایک پُرانی بند ٹرین پھر سے رواں کر دی گئی، ہجوم بے قابو سا ہو گیا۔ عجب مداری بنا کر رکھ دیا تھا اس تقدیر نے بھی۔

میں سارا دن سر جُھکائے درخت تلے بیٹھا رہتا اور لوگ آتے جاتے رہتے۔ ایسی ہی ایک گرم دوپہر جب پرندے بھی آگ برساتے سورج سے بچنے کے لیے اپنے ٹھکانوں میں پَر سمیٹے بیٹھے تھے، پلیٹ فارم پر اچانک ہلچل سی مچ گئی۔ پتا چلا کہ علاقے کے سب سے بڑے زمیں دار کی تیسری نئی نویلی دُلہن اپنی خادماؤں اور خاص کارندوں کے جُھرمٹ میں تشریف لائی ہیں۔ نوکرانیوں نے نذر نیاز کی پراتیں میرے

قدموں میں رکھ دیں اور غلاموں نے ارد گرد لگی بھیڑ کو جھڑک کر پرے بھگا دیا۔ لڑکی نوجوان تھی اور اس کو سب ''چھوٹی سرکار'' کے نام سے پکار رہے تھے۔ وہ میرے قریب آکر بیٹھ گئی۔ میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اس کی چوڑیاں کھنکیں۔ ''میرا نام

گل ناز ہے جوگی سائیں...... رب کا دیا سب کچھ ہے، پر گود ابھی سُونی ہے۔ آپ کی ایک نظر چاہیے''۔ اس کی نرم و ملائم آواز پر میں نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ واقعی وہ اسمِ بامسمّٰی تھی، اپنے نام کی طرح، جس پر پھول بھی رشک کریں، وہ گل ناز تھی۔ سُنہری دمکتا رنگ، آنکھوں میں کاجل اور ناک میں سونے کا لونگ، سیاہ کڑھی ہوئی شال لپیٹے وہ خود گلاب کا پھول لگ رہی تھی۔ پل بھر ہی میں مجھے اس کے حسین چہرے میں سب سے پہلے ناہید، پھر لبنیٰ، لیلیٰ، صبا اور عینی کا چہرہ جھلکتا نظر آیا۔ میں نے گھبرا کر جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ ''نہیں، اب اور نہیں...... بس...... عورت، چلی جا یہاں سے، جا، پھر کبھی اپنی صورت نہ دکھانا مجھے''۔ گل ناز ڈر کر پیچھے ہٹی، تو خانو دُور سے بھاگتا ہوا آیا۔ ''جوگی سائیں جلال میں آ گیا ہے چھوٹی سرکار۔ بس سمجھو، آپ کی مُراد پوری ہوئی''۔ لڑکی ابھی تک گھبرائی ہوئی تھی۔ ''اچھا؟ میں تو سمجھی کہ سائیں مجھ سے ناراض ہو گئے''۔ خانو نے بڑے زُعم سے جواب دیا۔ ''یہی تو بات ہے ہمارے سائیں کی۔ عورت اور پیسے کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، مگر آج تک جس کو بھی سائیں نے ڈانٹا، اس کی نیّا پار ہوئی''۔ گل ناز کچھ دیر مزید عقیدت سے ہاتھ جوڑے میرے قدموں میں بیٹھی رہی اور پھر دھیرے سے اُٹھ کر خراماں خراماں واپس چلی گئی۔ اگلے چند دنوں میں چاروں طرف یہ خبر پھیل چکی تھی کہ جوگی سائیں کو عورت اور خصوصاً خُوب صُورت عورت کے وجود ہی سے شدید نفرت ہے۔ اب میں انہیں کیسے سمجھاتا کہ حُسن کا یہی زہر تو ہے، جو ازل سے میری رگ رگ میں سرائیت کر کے میری رُوح کو تمام عمر جُھلساتا رہا ہے اور میں جل جل کر اتنی بار راکھ ہو چکا ہوں کہ اب کوئی چنگاری باقی نہیں رہی، پھر ایک دن ایک نوجوان جوڑا جھجکتے ہوئے میرے پاس آیا۔ لڑکی اور لڑکا دونوں کافی سہمے ہوئے لگتے تھے۔ لڑکے نے بند مُٹھی کھولی اور پچاس روپے کا مُڑا تُڑا سا نوٹ میرے قدموں میں ڈال دیا۔ ''ہمارے لیے دُعا کریں سائیں جی کہ ہماری شادی ہو جائے۔ ہم دونوں کے گھر والے ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور ہمارا رشتہ ناممکن ہے''۔ میں نے ہنسوں کے اس جوڑے کی طرف دیکھا۔ ''صرف پچاس روپے میں شادی چاہتے ہو؟ اتنا سستا ہے تمہارا رشتہ......؟'' لڑکا کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ ''میرے پاس تو فی الحال بس اتنے ہی ہیں''۔ میں نے نوٹ پرے کر دیا۔ ''اتنے پیسوں میں جوگی سائیں شادی نہیں کرواتا''۔ لڑکے نے پریشان ہو کر لڑکی کی طرف دیکھا، لڑکی نے جلدی سے اپنے کانوں میں پہنی سونے کی بالیاں اتار کر میرے سامنے رکھ دیں۔ میں نے لڑکے کی طرف دیکھا۔ ''لگتا ہے یہ تم سے زیادہ محبت کرتی ہے، یہ بالیاں واپس اٹھا لو لڑکی، محبت اگر سچی ہو تو بذاتِ خود دنیا کی سب سے بڑی دُعا بن جاتی ہے۔ واپس چلے جاؤ تم دونوں اپنے گھروں کو۔ اور اس اُمید کے ساتھ جاؤ کہ تمہاری محبت ہی تمہاری دعا ہے، تمہاری منّت اور تمہارا تعویذ ہے''۔ وہ دونوں یوں خوش باش اُٹھے، جیسے آج ہی ان کا رشتہ طے ہو گیا ہو۔ اُف یہ محبت کرنے والوں کی ''زود فہمیاں''...... ''محبت کرنے والے ہمیشہ ایک

دوسرے کو پانے کی دُھن میں کیوں سر گرداں رہتے ہیں۔ کاش! یہ نادان جان پاتے کہ دنیا میں کسی کا محبوب ہونا ہی کائنات کا سب سے بڑا اعزاز ہوتا ہے۔ محبت کو تو محبوبیت سے غرض ہونی چاہیے، نہ کہ وصَل یا وصال سے۔ کسی کا محبوب ہونا کتنا بڑا عہدہ و مرتبہ ہے، یہ کوئی مجھ سے پوچھے۔ مجھ جیسے تو اپنی تمام عُمر اسی مسند پر ایک لمحہ بیٹھنے کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ اپنا سارا جیون جلا دیتے ہیں، مگر وہ پل بھر کے لیے بھی کسی کا محبوب نہیں بن پاتے۔ اور پھر میری طرح یہی ایک خواہش دل میں لیے ہمیشہ کے لیے خاک میں مل کر خاک ہو جاتے ہیں۔

میرے خاک ہونے کے دن بھی قریب آ رہے تھے، میری حالت اب زیادہ تر ابتر رہنے لگی تھی۔ مجھے دن، تاریخ، مہینے اور سَن سے اب کوئی سروکار نہیں تھا، مگر دُور کھڑے خانو کے ٹھیلے پر بدلتے ریلوے کے لائسنس سے اتنا پتا چل جاتا تھا کہ مجھے گھر چھوڑے پانچ سال سے بھی کچھ زائد عرصہ ہو چکا تھا اور پھر موسم نے کروٹ بدلی اور جاڑے کی سردی اور کہرے نے ماحول پر اپنا سفید غلاف لپیٹ دیا۔ میں رات بھر گیلے لحاف تلے بارش میں بھیگتا رہا اور نتیجہ اگلے روز صاف ظاہر تھا۔ خانو کسی کام سے مجھے اٹھانے آیا تو میرا ہاتھ چُھوتے ہی اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ ''اوہو...... تمہیں تو تیز تاپ ہے سائیں۔ میں ابھی حکیم صاب کو لے کر آتا ہوں''۔ خانو الٹے قدموں واپس بھاگ گیا۔ میں نے آواز دے کر اُسے روکنے کی کوشش کی کہ اب یہ روگ حکیم، طبیب یا ویدوں کے بس سے باہر کی بات ہے، ڈاکٹر اور طبیب مرض کا علاج کر سکتے ہیں، مریض کا نہیں۔ خاص طور پر جب مریض مجھ جیسا ہو کہ جسے خود اپنے فنا ہونے کا انتظار سب سے زیادہ ہو، میں نے خود کو تباہ و برباد کرنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے تھے، مگر یہ زندگی بھی اس دوغلی دنیا جیسی ہی تھی، جو اس سے جان چھڑانا چاہے، یہ اسی کے دامن سے لپٹی رہتی ہے۔ خانو گھنٹہ بھر بعد ہی کسی بزرگ حکیم کی جڑی بوٹیوں سے بنی دواؤں کا بکسہ ہاتھ میں تھامے دوبارہ نمودار ہو گیا۔ حکیم صاحب نے میری نبض دیکھ کر تشویش سے سر ہلایا۔ خانو غور سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ حکیم نے چمڑے کے بکس میں سے چند سفوف نکالے اور یک جا کر کے تین چار پُڑیاں سی بنا دیں۔ ''یہ لو خانو میاں...... صبح، دوپہر، شام۔ دن میں تین تین مرتبہ سادے پانی میں گھول کر پلانی ہے یہ دوا۔ سردی لگ گئی ہے تیرے سائیں کو۔ بہت احتیاط کی ضرورت ہے''۔ خانو نے کسی تجربہ کار اور مُستعد تیمار دار کی طرح میرے طبیب کی ساری ہدایات ازبر کر لیں۔ شاید غالب نے خانو جیسے ہمدردوں کے لیے ہی کہا تھا کہ: ''پڑیئے گر بیمار...... کوئی نہ ہو تیمار دار'' مگر میرا تیمار دار کسی صورت میرا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ حکیم صاحب نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ یہ جو میں ساری خلقت کو دعائیں بانٹتا پھرتا ہوں، خود اپنے لیے شفایابی کی دُعا کیوں نہیں کرتا۔ حکیم نے جاتے جاتے میرا شانہ تھپتھپایا اور مُسکرا کر بولے ''فکر نہ کریں سائیں جی، جلد ہی بھلے چنگے ہو جائیں گے''۔ میری زبان بے ساختہ پھسل پڑی۔ ''کچھ مزید بیمار کرنے کی دوا بھی کرتے ہیں کیا آپ؟'' حکیم نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''نہیں، مجھے صرف شفا دینے کا حکم ہے۔ سو، اپنی سی کوشش جاری رکھتا ہوں۔ مگر لگتا ہے، یہ ہنر آپ نے خوب سیکھ رکھا ہے، پر تقدیر سے لڑنے کا کچھ فائدہ نہیں سائیں جی۔ جو جتنی سانسیں لکھوا کر لایا ہے، اُسے اُتنی جینی ہیں۔ خود کو سزا دینا مناسب نہیں''۔ خانو حیرت سے میرے اور حکیم صاحب کے درمیان ہونے والا یہ مکالمہ سُن رہا تھا۔ حکیم صاحب جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ''دنیا کی ہر طب کا تعلق کسی نہ کسی طور انسان کے اعصاب اور اس کی شفایابی کی خواہش سے ضرور ہوتا ہے۔ جینے کی خواہش اور صحت کی آرزو، بیمار عضو کے خلیوں کے دروازے، دوا کو اندر کشید کرنے کے لیے کھول دیتی ہے، ورنہ سب دوائیں ناکام و نامراد لوٹ جاتی ہیں۔ اپنے جینے کی کوئی وجہ پیدا کیجیے صاحب''۔ حکیم صاحب پلٹ گئے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ حکمت کا تعلق صرف علاج اور دوا دارو کے علم سے نہیں ہوتا۔ انسان کے اندر جھانک لینا ہی اصل دانش و حکمت ہے۔ اس چھوٹے سے قصبے کا یہ حکیم بھی کچھ ایسا ہی دانا تھا، جو صرف انسان کی نبض ہی دیکھنا نہیں جانتا تھا، اُس نبض کی بولی بھی پڑھ سکتا تھا۔

خانو شدومد سے حکیم صاحب کی ہدایات کے مطابق میری تیمار داری میں جُتا رہا۔ تیسرے دن ڈھول، بتاشوں کے ساتھ ایک ہجوم نذر اور نیاز کی دیگیں، سبز چادریں، سنہری غلاف اور نہ جانے کیا کچھ اٹھائے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر آ پہنچا۔ عُقدہ کھلا کہ زمیں دار صاحب کی خدا نے سن لی ہے اور ان کی گل ناز نے انہیں خوش خبری سُنا دی ہے کہ ان شاءاللہ جلد ہی ان کے آنگن میں پھول کِھلنے والا ہے۔ تھوڑی دیر میں جشن منانے والے یک دم خاموش اور مؤدب سے کھڑے ہو گئے۔ پتا چلا کہ زمیں دار صاحب خود تشریف لا رہے ہیں۔ زمیں دار پکّی عُمر کا ایک سخت گیر اور جہاں دیدہ شخص دکھائی دیتا تھا۔ گل ناز بھی اُس کے ساتھ میرے قدم بوسی کے لیے آئی تھی۔ اس نے دُور ہی

سے اشارہ کر کے اپنے سر کے اشارے سے سائیں کو میری نشان دہی کرا دی۔ زمیں دار مؤدب سا میرے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ ''میں پہلے اس جھلّی کی باتوں پر یقین نہیں کرتا تھا سائیں جی...... بچّہ تو مرد کے نصیب سے ہوتا ہے، میں اسے ہمیشہ یہی سمجھاتا رہا، پر یہ چُھپ چُھپ کر پیروں فقیروں کے دَر پر منّتیں مانگتی اور چڑھاوے چڑھاتی رہی، مگر اس کے نصیب کا چڑھاوا تو یہیں اسی قصبے کے ریلوے پلیٹ فارم پر انتظار کر رہا تھا۔ آپ بھی ہماری یہ نذر نیاز قبول کرو۔ اور ہاں، آج کے بعد آپ کا تین وقت کا کھانا میری حویلی سے آیا کرے گا۔ خدا کے لیے انکار نہ کرنا''۔ میں نے سر جھکائے، شرمائی سی بیٹھی گُل ناز کی طرف دیکھا۔ سارا اسٹیشن دُور کھڑے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ میں چُپ رہا۔ مگر صاف نظر آ رہا تھا کہ مزید مشکلات منہ کھولے میری جانب بڑھ رہی ہیں اور میرا رہا سہا چین اور سکون بھی غارت ہونے والا ہے۔ میں نے اُسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اب مزید اس پلیٹ فارم پر ٹکے رہنا ان کم زور عقیدہ لوگوں کو زیادہ بھٹکانے کا باعث ہو گا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تنہائی بھی کسی کے لیے اتنی بڑی نعمت ثابت ہو سکتی ہے کہ وہ کم نصیب اس کے لیے ترس ہی جائے۔ میرا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا، جتنا میں تنہا رہنا چاہتا تھا، میرے گرد ہجوم اُسی قدر بڑھتا جا رہا تھا۔ رات گئے ایک مال گاڑی اسٹیشن پر لگی، تو میں نے اپنے بکھرے وجود کو سمیٹا۔ پلیٹ فارم پر لگے گھڑیال نے رات کے تین بجنے کا اعلان کیا اور میں دھیرے دھیرے رینگتی مال گاڑی میں سوار ہو گیا۔ خانو سمیت سارا پلیٹ فارم چین کی نیند سو رہا تھا۔ میں ایک نسبتاً خالی بوگی میں فرش پر بکھرے خشک بُھوسے پر نیم دراز ہو گیا۔

اگلی دوپہر کسی نے بوگی کا آہنی دروازہ سرکایا تو میری آنکھ کُھل گئی۔ کوئی ریلوے اہل کار تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے دُرشت لہجے میں پوچھا۔ ''تم کون ہو، اور یہاں خالی بوگی میں کیا کر رہے ہو؟'' میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ ''فقیر ہوں، ٹکٹ کے پیسے نہیں تھے، اس لیے یہاں بیٹھ گیا۔ تم اپنا سامان دیکھ لو، میں نے کچھ نہیں اٹھایا''۔ ریلوے اہل کار کا لہجہ تبدیل ہو گیا۔ ''میرا یہ مطلب نہیں تھا بادشاہو! پر آپ کو کہاں جانا ہے۔ یہ مال گاڑی تو اب ہفتہ بھر اسی جنکشن پر لگی رہے گی۔ کوئی خدمت ہو ہمارے لائق تو بتاؤ''۔ ''نہیں، تمہاری مہربانی۔ میں یہیں اُتر جاتا ہوں''۔ مَیں چُپ چاپ گاڑی سے اتر کر ایک طرف ہو لیا۔ ریلوے اسٹیشن سُنسان پڑا تھا۔ شاید یہاں گاڑیوں کا گزر کم ہی ہوتا ہو گا، سہ پہر کی دھوپ ڈھل رہی تھی۔ مجھے ریلوے پلیٹ فارم کا ایک بُرا تجربہ پہلے ہی ہو چکا تھا، لہٰذا اس بار میں نے پلیٹ فارم پر ڈیرہ جمانے کے بجائے، قصبے سے دُور جاتی ایک پگڈنڈی کی راہ لی۔ سارا راستہ کنکر اور کانٹوں سے اَٹا پڑا تھا اور دُور دُور تک سبزے کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ درخت اور جھاڑیاں خشک پڑی تھیں اور راستے بھر دُھول اُڑتی رہی۔ عجیب قحط سالی کی سی کیفیت طاری تھی۔ سارے علاقے میں، میں نے ایک خشک ہوتے جوہڑ سے پرے ڈیرہ جمانے کا فیصلہ کیا، جہاں ایک بُوڑھے درخت کی بے تحاشا پھیلی ہوئی شاخوں اور جڑوں نے ایک مسکن بنا رکھا تھا۔ شام ہونے سے پہلے میں نے آس پاس کی تھوڑی سی جگہ سے کنکر اور کانٹے ہٹا کر اپنے گزارے کے لیے تھوڑی سی زمین صاف کر لی، لیکن اس ذرا سی مشقت ہی نے مجھے نڈھال کر کے رکھ دیا تھا۔ میں وہیں درخت سے ٹیک لگا کر سُستا رہا تھا کہ دُور سے ایک بُوڑھا شخص سائیکل پر کسی بچّے کو بٹھائے خراماں خراماں پیڈل مارتا میرے قریب سے گزرا اور پھر آگے جا کر نہ جانے اسے کیا خیال آیا کہ وہ دوبارہ میری طرف پلٹا۔ میں نے بےزاری سے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر وہی آدم زاد...... ؟ بوڑھے نے میرے قریب آ کر اچھی طرح میرا جائزہ لیا۔ میں نے چُپ رہنے ہی میں عافیت جانی۔ بوڑھے نے مجھ سے پوچھا ''اس علاقے میں نئے آئے لگتے ہو جی...... میرا نام مہر دین ہے، اور یہ میرا پوتا ہے کمالا۔ کوئی روٹی ٹکر چاہیے ہو تو بتاؤ جی۔ میں اس علاقے کا ڈاکیا ہوں''۔ میں نے دُور کھڑی سُرخ سائیکل کے پہیے سے کھیلتے بچّے پر نظر ڈالی۔ ''نہیں میرے پاس جھولے میں کچھ چنے اور گُڑ موجود ہے۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ تم جاؤ یہاں سے''۔ بوڑھے مہر دین پر میری کرختگی کا کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ وہ آس پاس میلوں دُور تک پھیلی بنجر و بے آب زمین کو دیکھتے ہوئے حسرت سے بولا۔ ''صاف پانی کا بڑا کال ہے یہاں۔ انسان اور جناور، بندے اور ڈنگر سارے اسی جوہڑ سے پانی پیتے ہیں۔ برسوں سے بارش کا ایک چھینٹا بھی نہیں برسا یہاں پر۔ میں کوشش کروں گا کہ کہیں سے ایک صراحی صاف پانی لا دوں تمہیں''۔ بوڑھا اٹھ کھڑا ہوا۔ ''چل کمالے! تیری ماں راہ دیکھتی ہو گی''۔ مہر دین اپنی سائیکل کی طرف جاتے جاتے دو پَل کے لیے رُکا۔ ''جوگی اور سائیں لوگوں کی دُعا میں بڑا اثر ہوتا ہے، ہمارے علاقے کے لیے بھی دو بول پڑھ دینا، جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھاؤ''۔ میں خاموش رہا۔ مہر دین نے ایک لمبی سی ٹھنڈی آہ بھری اور آگے بڑھ گیا۔ میں نے سُکون کی سانس لی اور آنکھیں موند لیں، مگر سُکون بھلا کب لکھا تھا، لکھنے والے نے میری قسمت میں۔

اگلی صبح جب میری آنکھ کُھلی تو آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ زور کا مینہ برسا کہ ہر طرف جل تھل ہو گیا۔ اچانک ایک جانب سے شور سا اٹھا۔ میں نے گھبرا کر دیکھا تو مہر دین ایک ہجوم کی قیادت کرتا، میری جانب دوڑا چلا آ رہا تھا۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغہ حُسنِ کار کردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حسّاس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اِک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بد صورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہر گز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین'' روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

خلیل جبران نے کہا تھا ''جب کبھی میں نے صبر کی زمین میں اپنے درد کا پودا سینچا' بدلے میں اس نے مجھے خوشی کا پھل دیا'' مگر شاید میرے نصیب میں صرف درد' غم اور پریشانی کے تناور درخت ہی لکھے تھے۔ مہر دین اور اس شور مچاتے ہجوم کی صورت میں ایک نئی مصیبت میری جانب بڑھی چلی آرہی تھی۔ بارش کی بوچھاڑ تیز تر اور ان سب کے نعروں کا شور ہنگامہ خیز تھا۔ پاؤں میں پُرانے چپّل اور سَروں پر ناکافی اور چھید بھری برائے نام چھتریاں' وہ سب میرے قریب پہنچے تو میرے بپھرے ہوئے تیور دیکھ کر خاموش کھڑے ہوگئے۔ کچھ لمحوں تک ہمارے درمیان صرف برستی بوندوں کی بولی مترجم کے فرائض سرانجام دیتی رہی' مگر دنیا کا سب سے مشکل کام شاید خاموش رہنا ہے۔ سو' ان سب کو بھی یہ خاموشی کھلنے لگی اور پھر مہر دین ہی نے سب سے پہلے ہمّت کی اور ہلکے سے کھنکار کر بولا ''یہ سب یہاں تمہارا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں سائیں لوکو...... میں تو کل ہی سمجھ گیا تھا کہ اب اپنے اس بنجر اور خشک علاقے کی قسمت بھی کھلنے والی ہے' مگر تم نے تو ایک رات ہی میں کرشمہ کر دکھایا''۔ میں نے درشت لہجے میں ان سب کو دھتکارا۔ ''یہ بوڑھا مہر دین دیوانہ ہو گیا ہے شاید...... اور تم سب بھی نِرے بدھو ہو' جو اس کی باتوں میں آکر یہاں چلے آئے ہو......؟ بارشیں اپنے وقت ہی پر برستی ہیں، چاہے آسمان کے بادلوں کی ہوں یا پھر نصیب کی' جاؤ جا کر پانی ذخیرہ کرنے کی کوئی تدبیر کرو' ورنہ پھر سالوں تک پانی کو ترستے رہو گے''۔ پتا نہیں' انہیں میری بات کتنی سمجھ آئی اور کتنی رائیگاں گئی' مگر ان میں سے کچھ بزرگ اور کچّی عُمر کے چند لوگ آگے بڑھے' کسی نے چادر' کسی نے چاول' گڑ اور چنوں سے بھرے جھولے میرے سامنے خالی کر دیئے' کوئی جیب میں چند سکّے بھر کر لایا تھا، تو کسی نے دودھ سے بھری گڈوی میرے سامنے دھر دی۔ مہر دین رو پڑا۔ ''ہمارے پاس بس یہی کچھ ہے سائیں لوکو! اسے قبول کرلو اور وعدہ کرو' اب تم یہاں سے کہیں نہیں جاؤ گے۔ ہمیشہ ہمارا سایہ بن کر یہیں ڈیرہ ڈالے رہو گے''۔ میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ان لوگوں کو مزید سمجھانا بے فائدہ تھا' اس لمحے میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس برستی بارش سے لڑ پڑوں' انسان اپنے ظاہری دشمن سے جنگ لڑ سکتا ہے' اُسے ہرا کر شکست دے سکتا ہے۔ اپنی ''فتح'' جیت سکتا ہے' مگر مقدر سے نہیں لڑ سکتا۔ سو، مقدر کے ہاتھوں زخمی ہو کر میں وہیں درخت کے نیچے بیٹھا بھیگتا رہا، پر...... کچھ بارشیں صرف بنجر دھرتی کو سیراب کرنے کے لیے ہی برستی ہیں' جو دل کے سلگتے آنگن کو بھگو دے' ایسا ساون میری قسمت میں بھلا کب تھا؟ اگلے روز مہر دین میرے پاس آیا، تو میں نے سختی سے اسے منع کیا کہ اگر اس کی بستی والوں نے مجھے زیادہ تنگ کیا یا آس پاس کے علاقوں میں اس اتفاقیہ بارش کا خوامخواہ چرچا کیا، تو میں چُپ چاپ یہاں سے اُٹھ کر کسی اور جانب نکل جاؤں گا۔ مہر دین نے فوراً اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا اور قسم کھائی کہ وہ ایسا ''گناہ'' کرے گا' نہ کسی اور کو کرنے دے گا۔

میرے پاس اس کے علاوہ اور چارہ بھی کیا تھا؟ کسی نئی بستی یا جنگل کی جانب نکلنے سے پہلے کچھ دن یہاں بِتانا اب ناگزیر لگنے لگا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اس بار یہ جوگی سائیں کا لقب اور ان بھولے بھالے لوگوں کی یہ ضعیف الاعتقادی کا بُت ہمیشہ کے لیے توڑ کر ہی آگے بڑھوں گا۔ مہر دین نے میری دھمکی شاید بہت موثر انداز میں بستی کے لوگوں تک پہنچادی تھی، اسی لیے چند دن سکون رہا۔ البتہ عصر کے بعد مغرب تک کے وقفے میں اِکا دُکا ضرورت مند مجھ سے کچھ فاصلے پر دُور پگڈنڈی پر آبیٹھتے اور دُور ہی سے دُعا کی التجا کرکے واپس پلٹ جاتے۔ انسان اور دُعا کا بھی کتنا پُرانا، کیسا ازلی، ابدی رشتہ ہے۔ جانے کائنات میں دُعا پہلے وارد ہوئی ہو گی یا انسان؟ میں دن بھر خود کو یہاں وہاں الجھائے رکھنے کی کوشش میں کسی نہ کسی طور صبح سے شام تو کرلیتا تھا' مگر شام ڈھلتے ہی اس کی یادیں کالی رات کے سایوں کی طرح مجھے گھیر لیتیں۔ جانے وہ کیسی ہو گی۔ واپس آکر اس نے دوبارہ اپنا ریڈیو پروگرام شروع کیا ہو گا کہ نہیں؟ اب وہ کیسی دِکھتی ہو گی؟ کچھ چہروں کا حُسن صرف ضرب کھانا جانتا ہے' کبھی تقسیم نہیں ہوتا۔ وہ بھی دُگنی چوگنی دل کش اور حسین ہو چکی ہو گی۔ کاش! دنیا کے کسی جرّاح کے پاس تو وہ نشتر ہوتا، جو ایک ہی چرکے میں ہمارے سارے جسم سے ان یادوں کا سارا زہر نکال پھینکتا۔

اگلے روز مہر دین کے ساتھ ایک دوسرا بوڑھا بھی کھنکارتے ہوئے، عصر کے بعد میرے قدموں میں آکر بیٹھ گیا۔ ''یہ شکور دین ہے سائیں لوکو...... اپنا شکورا...... اس کی نواسی کو بڑے زور کا بخار ہو گیا ہے۔ اگر آپ اجازت دو تو دُعا کے لیے اسے یہاں لے آئیں''۔ میں نے ناگواری سے مہر دین کی طرف دیکھا۔ اس نے جلدی سے وضاحت پیش کی۔ ''میں نے اسے بہت سمجھایا ہے سائیں، پر یہ جھلا میری بات سمجھتا ہی نہیں، کہتا ہے' سائیں سے روبرو دُعا کی درخواست کر دیکھو۔ بڑا مجبور ہے بے چارہ۔ اس کی سکینہ کو جن آتے ہیں جناب۔ دُور کی دُعا سے وہ شیطان بھلا کہاں جان چھوڑیں گے اس کی''۔ میں نے جان چھڑانے کے لیے کہہ دیا کہ میں دُعا کر دوں گا، اگر تین دن تک لڑکی کی طبیعت نہ سنبھلے، تو اسے لے آنا۔ ان دُور دراز کے علاقوں میں جوان لڑکیوں کو مختلف گھریلو اور معاشرتی مسائل کی وجہ سے ہسٹریا کے یا دیگر نفسیاتی دورے پڑتے رہتے ہیں' جن کا دورانیہ چند گھنٹوں کا ہوتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ شکورے کی نواسی بھی ایک آدھ دن میں بھلی چنگی ہو جائے گی' مگر ہمیشہ کی طرح میری یہ خوش فہمی بھی تیسرے دن ہی دور ہو گئی۔ جب شکورا سیاہ چادر میں لپٹی گم صُم سی ایک لڑکی کو لے کر میرے ٹھکانے پر آ پہنچا۔ میں خود اپنے ہی الفاظ کے جال میں پھنس چکا تھا۔

سو، بادلِ نخواستہ دکھاوے کے طور پر دُعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ گلابی شام کے ڈھلتے سورج کی کرن سے سکینہ کے ناک کا لونگ پل بھر کے لیے چمکا تو ایک لمحے کے لیے میری نظر اس کی نظر سے ٹکرائی۔ اُف...... کس قدر ویران آنکھیں تھیں۔ کسی برباد شہر کی طرح' جس کا سب کچھ لوٹ کر، جاتے ہوئے لٹیرے تیل چھڑک کر آگ بھی لگا گئے ہوں۔ کچھ ایسا ہی دھواں اٹھتا محسوس ہو رہا تھا مجھے سکینہ کی ان جلتی آنکھوں سے۔ شکورا اپنی دُھن میں بولے جا رہا تھا'' کچھ عرصہ پہلے تک بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ ہنستی بولتی تھی' ساری سکھیوں سمیت پورے گاؤں میں اودھم مچاتی پھرتی تھی۔ کوئی بھی محفوظ نہیں تھا، ان کی شیطانیوں سے، باغوں میں جھولے جھولتی تھیں' ایک گھر کی چھت سے دوسری چھت تک کد کڑے لگاتی پھرتی تھی یہ' پھر نہ جانے کیا ہوا۔ رفتہ رفتہ اسے چپ لگتی گئی' ساری ہنسی اور قہقہے کھو گئے اور یہ ایسی ہو گئی۔ اس کی نانی کہتی ہے کہ وہ اسی لیے ان کڑیوں کو شام ڈھلنے کے بعد ویران جگہوں پر جانے سے منع کرتی تھی۔ ضرور کسی ویران درخت تلے بیٹھے بیٹھے اسے کوئی جن چمٹ گیا ہے۔ بس سائیں جی' اب تمہاری دُعا ہی کا آسرا ہے' کچھ ایسا پڑھ کر پھونکو کہ میری سکینہ پھر سے پہلے جیسی ہو جائے''۔ اس تمام عرصے میں، سکینہ ہم دونوں سے لاتعلق سی بیٹھی' کچی زمین پر ایک تنکے کی مدد سے لکیریں بناتی اور مٹاتی رہی' ڈھلتی شام میں، اس کے چہرے کی پیلاہٹ نے آس پاس کے ماحول میں سرسوں سی بکھیر رکھی تھی۔ میں نے بنا کچھ کہے چپ چاپ دُعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ میری دیکھا دیکھی پہلے شکورے اور پھر سکینہ نے بھی اس کی تقلید میں ہاتھ اٹھا دیئے۔ خود اپنے لیے دعا مانگتی مجھے وہ بہت معصوم لگی۔ میں نے چہرے پر ہاتھ پھیر کر شکورے سے کہا'' اسے کسی اچھے حکیم یا طبیب کو دکھاؤ، ہو سکے تو شہر لے جا کر کسی بڑے ڈاکٹر سے علاج کرواؤ، دُعا کے ساتھ دوا بھی ضروری ہے''۔ شکورے نے آہ بھری'' آپ ٹھیک کہتے ہو سائیں جی، پر یہ پگلی کسی کی سُنتی کب ہے' میں نے شہر چلنے کا کہا تو صاف انکار کر دیا اس نے، کہتی ہے، اس کا جو ہونا ہے' اِدھر ہی ہونا ہے''۔ میں نے غور سے سکینہ کی طرف دیکھا'' کیوں لڑکی! کیوں تنگ کرتی ہو اپنے بزرگوں کو۔ بات کیوں نہیں مان لیتی ان کی......؟'' سکینہ میری ڈانٹ سے گھبرا سی گئی'' جی...... وہ......'' مجھے لگا کہ اپنے نانا کی وجہ سے وہ کُھل کر بات نہیں کر پا رہی تھی' سر جھکا کر بس اتنا ہی بول پائی'' ٹھیک ہے جی...... آپ کہتے ہو تو مان لوں گی''۔ شکورا خوش ہو گیا'' دیکھا سائیں! میں جانتا تھا اس کا علاج تمہارے پاس ہی ملے گا''۔ شکورا سکینہ کو ساتھ لیے واپس پلٹ گیا، مگر نہ جانے کیوں ان دونوں کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک مجھے سکینہ کی ویران خالی سیاہ بڑی بڑی آنکھیں اپنے آس پاس ہی بھٹکتی ہوئی محسوس ہوتی رہیں۔ سورج کی زردی شب کی سیاہی میں تبدیل ہوئی تو رات کا چاند سکینہ کے چہرے کا سورج مُکھی لیے آسمان پر دوبارہ نمودار ہو گیا۔ جانے وہ کیا کہنا چاہتی تھی؟ اُس کی آنکھوں میں زمانے بھر کا وہ کرب' کیسا تھا؟

اگلی صبح مہر دین تازہ پانی کی صراحی لایا تو اس نے خود ہی شکورے کا ذکر' چھیڑ دیا'' کل سے ذرا سکون ہے' نیاڑوں کے گھر میں' کیسی ہنستی بولتی چڑیا سی تھی بے چاری سکینہ' اب تو جیسے منہ میں زبان ہی نہیں ہے اس کے''۔ میں نے مہر دین کی طرف دیکھا۔'' اچانک ایسا کیا ہو گیا اِسے...... اور اس کی یہ حالت کب سے ہے؟'''' تین سال ہو گئے ہیں سرکار، بہت علاج کروایا' بڑے پھیرے لگائے ہیں شکورے نے

آس پاس کی ساری بستیوں کے' کوئی مزار کوئی درگاہ نہیں چھوڑی' جہاں اس نے دُعا نہ کی ہو، علاقے کے سارے وید' حکیم اور طبیب بھی تھک کر ہمت ہار چکے ہیں۔ کسی نے شکورے کو مشورہ دیا تھا کہ کچھ عرصے کے لیے لڑکی کو لے کر کسی دُور دراز کی بستی چلا جائے، شاید ماحول بدلنے سے کچھ بہتری ہو' مگر یہ طریقہ بھی بے فائدہ رہا۔ آخر کار' شکورے کو واپس لوٹنا ہی پڑا۔ ابھی چند دن پہلے، جس رات تمہاری دُعا سے علاقے میں بارش برسی تھی' اس سے ایک رات پہلے ہی تو شکورا واپس لوٹا تھا اپنی سکینہ کو لے کر''۔ میں نے بے خیالی میں مہر دین سے پوچھا'' کہاں لے گیا تھا شکورا دین اپنی نواسی کو؟'''' شکر گڑھ، وہیں ریلوے پلیٹ فارم کے قریب ہی گھر ہے اس کے داماد کا''۔ میں چونک سا گیا' یہ تو وہی علاقہ تھا' جس کے پلیٹ فارم پر خانو کا کیبن واقع تھا۔'' کتنا عرصہ رہی وہاں سکینہ؟'''' لگ بھگ چھ ماہ، مگر وہاں بھی اس جھلی کا مَن نہیں لگا۔ بس دن بھر بیٹھی آسمان کو تکتی رہتی تھی''۔ پھر کچھ سوچ کر مہر دین خود ہی اُداس ہو گیا'' اور پتا ہے سائیں جی! کبھی کبھی تو بالکل جو گنوں جیسی حرکتیں کرتی ہے، اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی ہے''۔ مہر دین کی باتیں سُن کر میرے اندر کی بے چینی مزید بڑھ گئی۔ میں نے مہر دین سے کہا کہ وہ شام ڈھلنے سے پہلے شکورے کو میرے پاس بھیج دے۔ سرِ شام ہی شکورا سکینہ سمیت آ گیا۔'' حکم سائیں''۔'' سکینہ کیسی ہے اب؟'' شکور دین نے گہرا سانس لیا'' پہلے سے کچھ بہتر ہے سائیں! ایک آدھ دن میں شہر کی بڑی ڈاکٹرنی کو بھی دکھانے لے جاؤں گا۔ سکینہ کے باپ کو بھیجا ہے میں نے شہر' ڈاکٹرنی کا پتا لگانے اور وقت لینے کے لیے''۔ میں نے اپنے اندر اُبھرتے ایک عجیب سے موہوم خدشے کی تصدیق چاہی۔'' جب تم سکینہ کو دوسری بستی لے گئے تھے، ماحول بدلنے کے لیے' تب وہاں اس کا میل جول کن لوگوں کے ساتھ تھا؟'' شکورے نے تاسف بھرے لہجے میں سکینہ کی حالتِ زار بیان کی'' وہ کب کسی سے ملتی ہے سائیں جی! وہاں بھی سارا دن گم صُم بیٹھی رہتی تھی''۔ سکینہ اس وقت بھی ہم دونوں کی باتوں سے لاتعلق سے بیٹھی زمین پر تنکے کی مدد سے اپنا پسندیدہ کھیل کھیل رہی تھی۔ اتنے میں گاؤں سے ایک پکی عمر کا جوڑا آ کر ہم سے کچھ دور فاصلے پر بیٹھ گیا۔ عورت کافی پریشان نظر آ رہی تھی۔ مرد نے منت کی'' سائیں جی! ہمارا چھوٹا بیٹا بہت بیمار ہے۔ چار بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ دُعا کرو کہ ٹھیک ہو جائے۔ بڑا تیز بخار ہے اسے تین دن سے''۔ میرا جی چاہا کہ میں انہیں بُری طرح دھتکار دوں۔ میں نے مرد کو جھاڑا کہ وہ کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کے بجائے یہاں کیوں آ گیا ہے؟ مرد نے بتایا کہ وہ کافی علاج کروا چکا ہے، مگر بچے کی حالت نہیں سدھر رہی۔ تنکے کی مدد سے زمین پر لکیریں کھینچتی سکینہ نے دھیرے سے خود کلامی کی'' ٹھیک ہو جائے گا صبح تک رب کی مرضی سے، بس آج کی رات کی سختی ہے''۔ شکورا گاؤں سے آئے ہوئے جوڑے سے بات چیت میں مصروف تھا، اس لیے میرے علاوہ کسی نے بھی سکینہ کی یہ

سرگوشی نہیں سُنی۔ ویسے بھی اس کی آواز اتنی دھیمی تھی' جیسے وہ خود اپنے آپ سے بڑبڑا رہی ہو۔ میں جانتا تھا کہ عورت اور مرد دعا لیے بنا وہاں سے نہیں ٹلیں گے' لہٰذا حسبِ معمول میں نے اپنے سدا کے خالی ہاتھوں کا کشکول ہوا میں بلند کرلیا۔ اس جوڑے کے جانے کے بعد شکورا اور سکینہ بھی اٹھ کر چلے گئے۔ شکورے نے جاتے جاتے بتایا کہ اگر شہر میں بات بن گئی تو وہ سکینہ کو کل ہی شہر لے جائے گا۔ میرے اندر کی بے چینی بڑھتی ہی جارہی تھی، جیسے کوئی بہت بڑا سربستہ راز اپنے قفل کھولنے کو بے تاب ہو' مگر میں اپنی کم علمی اور جہالت کی وجہ سے اس کی کنجی کہیں کھو بیٹھا ہوں۔

اگلی صبح سورج کچھ زیادہ ہی ناراض سا نمودار ہوا اور اپنا غصہ، جھلستی کرنوں کی صورت، بن سایہ جان داروں پر برسانے لگا۔ دوپہر سے پہلے ہی گزشتہ روز والا مرد بھاگتا ہوا آیا اور میرے قدموں میں گر گیا ''میرے کاکے کا بخار اتر گیا ہے سائیں جی، کل رات تو ہم سمجھے تھے کہ بس جان لے کر ہی چھوڑے گا یہ بخار اس کی۔ بڑا تڑپا ہے ساری رات بستر پر' جیسے کوئی مچھلی بن پانی کے تڑپتی ہے۔ سچ بتاؤں سائیں، میں تو امید چھوڑ بیٹھا تھا' مگر پھر تمہاری دعا نے فجر کے بعد ایسا اثر دکھایا کہ سورج نکلنے تک میرا بچہ بھلا چنگا ہو کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سب تمہاری کرامت ہے سائیں۔ سارے تمہاری دُعا کے کرشمے اور برکتیں ہیں۔ قربان جاؤں میں اپنے سوہنڑے رب کے، اُس نے تمہیں ہم غریبوں کی مدد کے لیے بھیجا ہے' اس بستی میں''۔ وہ جوش میں نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا، مگر میرے تو سارے الفاظ ہی جانے کہاں کھو گئے تھے۔ کل ہی میرے سامنے سکینہ نے یہ سرگوشی کی تھی کہ شکورے کا بچہ رات بھر کی سختی کے بعد صبح شفایاب ہو جائے گا اور اس کی کہی ہوئی بات ہُوبہو ٹھیک ہوئی تھی، یہ سب کیا ماجرا تھا؟ اور پھر میرے ذہن میں یکے بعد دیگرے جھماکے ہوتے گئے' سکینہ بھی اُسی دن واپس اپنی بستی پہنچی تھی' جس دن میں نے یہاں ڈیرہ ڈالا تھا اور پھر اُسی رات اس علاقے میں برسوں بعد بارش برسی تھی۔ دوسرا جھماکا ہوا' اور مجھے مہردین کی بات یاد آئی کہ سکینہ کا نانا سکینہ کو ماحول کی تبدیلی کے لیے اسی قصبے میں لے گیا تھا، جہاں ریلوے پلیٹ فارم پر میرا ٹھکانہ تھا۔ میں بے چینی سے کھڑا ہو گیا اور ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ جہاں جہاں قدرت نے میری دعا کی لاج رکھی تھی، وہاں آس پاس سکینہ کی موجودگی کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ میرا جی چاہا کہ میں اسی وقت سکینہ کے گھر چلا جاؤں' مگر لوگ میری اس حرکت کا نہ جانے کیا مطلب لیتے، میں دو چار قدم بڑھ کر واپس پلٹ آیا۔ اتنے میں دور پگڈنڈی پر سورج کی قہر برساتی دھوپ کی گرمی سے تپتی زمین سے اٹھتی سراب کی لہروں میں مجھے شکورے کا ہیولا دھیرے دھیرے لاٹھی ٹیکتا، شہر کی جانب جاتی بڑی سڑک کی جانب بڑھتا دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے سر جُھکائے گٹھری سی بنی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ضرور وہ سکینہ ہی ہو گی۔ ایسے موقعوں پر انسان کے دل اور زبان سے ہمیشہ کچھ اس قسم کے غیر تشکرانہ فقرے ادا ہوتے ہیں کہ ''کاش! میں اس وقت کچھ اور مانگ لیتا، تو خدا وہ بھی ضرور دے دیتا'' مگر ہم انسان بھی کتنے بھولے ہیں۔ بھلا اس لمحے کسی کو کچھ اور مانگنے کا خیال ہی کب آتا ہے۔ ہمیں ٹھیک قبولیت کے لمحے قدرت جو عطا کرتی ہے، ہم اسی پر شکر ادا کیوں نہیں کرتے؟ مگر میں ان لوگوں میں سے نہیں تھا۔ مجھے اس لمحے شکورا اور سکینہ ہی اپنی ہر چاہت، ہر دُعا کا بدل نظر آرہے تھے۔ شکورا میرے قریب پہنچا تو گرمی کی وجہ سے بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ ''شہر کی بڑی ڈاکٹرنی سے بات ہو گئی ہے سائیں جی...... اس نمازی کو وہیں لے جا رہا ہوں۔ اس کے باپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اگر تمہارا حکم نہ ہوتا تو کبھی نہ جاتا۔ دُعا کرنا ہمارے لیے۔ اگر بس وقت پر مل گئی تو رات تک واپسی ہو گی' ورنہ کل تیری خدمت میں حاضری دوں گا''۔

سکینہ حسبِ معمول سر جُھکائے کھڑی تھی۔ میں نے شکورے کو دو لمحے درخت کے نیچے ستانے کا اشارہ کیا۔ سکینہ نے خود کو سمیٹا اور اپنے کمزور اور مضمحل سے وجود کو شکورے کے پیچھے چھپا لیا۔ شکورے نے سوالی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے تسلی دی ''کچھ دیر سستالو، شاید شہر جانے کی ضرورت نہ رہے اب، تم شکر گڑھ کے اسٹیشن پر کھوکھا لگانے والے خانو کو جانتے ہو؟'' شکورے نے حیرت سے میری طرف دیکھا ''ہاں جی...... وہ میرے داماد کا ہمسایہ ہے۔ وہیں ریلوے اسٹیشن کے باہر ہی تو کوارٹر ہے میری بیاہتا بیٹی کا''۔ ''اور اس علاقے کا چوہدری......؟ کبھی اس سے ملاقات ہوئی ہے تمہاری یا سکینہ کی؟'' ''نہیں جی' براہِ راست تو ملاقات نہیں ہوئی، ہاں ایک آدھ بار میں جب سکینہ کو لے کر ریاست پور کی بڑی درگاہ پر دُعا کے لیے گیا تھا' تب وہاں چوہدری صاحب بھی اپنی گھر والی کے ساتھ دُعا کے لیے آئے ہوئے تھے۔ وہیں دُعا کرتے دیکھا تھا انہیں''۔ اب میرے پاس مزید شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں تھی۔ میں نے شکورے کو ایک جانب ہٹنے کا اشارہ کیا اور براہِ راست سکینہ کی طرف دیکھا، وہ میری نظروں کی کاٹ سے گھبرا کر مزید سٹ گئی' میری آواز خود میرے لیے اجنبی تھی ''کون ہو تم......؟''

(جاری ہے)



........ہاشم ندیم........

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، مُلک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ’’خدا اور محبت ‘‘اور ’’بچپن کا دسمبر‘‘ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ’’عبداللہ‘‘ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کار کردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ’’عبداللہ‘‘ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چُکے ہیں۔

’’پری زاد‘‘ ایک اچھوتے، حسّاس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ’’سنڈے میگزین‘‘ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

میرا سوال سُن کر سکینہ سے زیادہ شکورے کے چہرے پر حیرت اور تعجب کی ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ سکینہ نے گھبرا کر اپنے نانا کی طرف دیکھا جیسے اس سے اپنی شناخت کی تصدیق چاہتی ہو۔ شکورے نے گڑبڑا کر کچھ کہنے کی کوشش کی ’’سائیں یہ میری نواسی......‘‘ میں نے ہاتھ اٹھا کر شکورے کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ’’سکینہ کو جواب دینے دو‘‘ سکینہ مزید بوکھلا گئی ’’وہ جی......میں......میں تو بس سکینہ ہوں‘‘۔ ’’نہیں، تم وہ نہیں جو نظر آتی ہو۔ ساری دنیا کو دعائیں دیتی پھرتی ہو۔ ان کے لیے رب سے مانگتی ہو، پھر خود کو اس جوگن کے بھیس میں کیوں ڈھال رکھا ہے؟ کیوں فقیرنی بنی پھرتی ہو؟ کیوں خود کو اور اپنے گھر والوں کو اس عذاب میں ڈال رکھا ہے؟ بولو، بولتی کیوں نہیں......؟‘‘ شکورا میرے غصّے بھرے لہجے کو میرا جلال سمجھ کر ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گیا۔ سکینہ بالکل روہانسی ہو گئی اور اس نے خود کو شکورے کی اوٹ میں چُھپالیا، پھر مجھے احساس ہوا کہ شاید غصّے میں میرا لہجہ کچھ زیادہ ہی تلخ اور بلند ہو گیا تھا۔ یہ لڑکیاں جانے کس ریشم کی بنی ہوتی ہیں، لہجوں کی تیز دھار سے بھی کٹ کٹ جاتی ہیں۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور شکورے سے کہا کہ فی الحال وہ واپس اپنے گھر چلا جائے، جب ضرورت ہوئی تو میں خود اسے بُلالوں گا۔ شکورے کا دل وہاں سے اٹھ کر جانے کو نہیں تھا، مگر میرے لہجے کی سختی نے اسے بادلِ نخواستہ اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ سکینہ بھی چُپ چاپ اس کے پیچھے چل دی۔ اس کی گھبراہٹ اور آنکھوں میں اُمڈتے سوالوں سے ایک بات تو مجھ پر واضح ہو گئی تھی کہ خود اسے بھی اپنی ان دعاؤں کی قبولیت کی کرامت کا کوئی علم نہیں۔ ساری بات مجھ پر دھیرے دھیرے کُھلنے لگی تھی، جانے یہ اتفاق تھا یا میری تقدیر کا ایک اور مذاق، مگر سچ یہی تھا کہ خانو والے پلیٹ فارم سے جہاں میرے ماتھے پر جوگی سائیں کی مُہر لگی تھی، ہر اس جگہ کے آس پاس سکینہ موجود رہی تھی، جہاں لوگ میری دُعا کی قبولیت کے لیے بھٹکتے رہے تھے اور آج تک ان سب جگہوں پر خانو سمیت جس ضرورت مند کی دُعا بھی قبول ہوئی، دراصل وہ سکینہ کی دُعا کی بدولت ہی ممکن ہو سکا تھا۔ قدرت یہ سب میرے کھاتے میں ڈالتی رہی اور سیدھے سادے لوگ میرے مرید بنتے چلے گئے۔ کسی کو بھی یہ پتا نہیں چلا کہ ان کی یہ دُعائیں ایک نڈھال اور لاغر سی لڑکی کی سفارش کے بدلے قبولیت کا رنگ لاتی ہیں۔ اگلے ایک دو روز میں، میں نے باتوں باتوں میں شکورے سے ان سب باتوں کی تصدیق بھی کرلی۔ خانو کی بیوی اپنے ہمسایوں کے سامنے ہر لمحہ خانو کی غریبی اور اپنی معاشی مشکلات کا رونا روتی رہتی تھی اور خانو کا بانڈ کُھلنے سے پہلے بھی وہ کئی بار سکینہ کے سامنے اس خواہش کا اظہار کر چکی تھی کہ اگر خانو کا بانڈ کُھل جائے، تو ان کے دن پھر جائیں گے، ٹھیک اسی طرح سارے گاؤں کو پتا تھا کہ چوہدرانی کو اولاد کی خواہش ہے، جیسے اس علاقے کے لوگ بارش کی تمنا میں نڈھال تھے، مگر یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں ہوا، کتنا پریشان کیا تھا مجھے اس جوگی سائیں کے لقب نے، لوگوں کو سکینہ کی اصلیت کا پتا کیوں نہیں چلا؟ لوگ تو در کنار، خود سکینہ بھی اپنے آپ سے ناواقف نظر آتی تھی، ہمارے معاشرے میں لوگ ہمیشہ سائیوں، بابوں اور جوگیوں ہی کو اپنا آخری مسیحا کیوں سمجھتے ہیں، کوئی سائینز، جوگن یا بی بی ان کی نظر میں دُکھوں کی مسیحا کیوں ثابت نہیں ہوتی؟ سچ کہتے ہیں یہ دنیا مرد نے اپنی جاگیر سمجھ رکھی ہے۔ کوئی رتبہ، کوئی عہدہ، کوئی نشست بھی تو خالی نہیں چھوڑی، اس نے حوا کی بیٹی کے لیے، مگر ایک سوال خود میرے اندر بھی کسی سنپولیے کی طرح کلبلا رہا تھا۔ سکینہ کو یہ اعزاز کب اور کیسے حاصل ہوا۔ کون سی ریاضت ایسی تھی، جو اسے اس مقام پر لے آئی تھی۔

اگلی شام علاقے سے خانہ بدوشوں کی ایک ٹولی کا گزر ہوا۔ انہوں نے میرے ڈیرے سے کچھ پرے اپنے خیمے گاڑ لیے اور شب بسری کے لیے آگ کا الاؤ روشن کرلیا۔ ان کے دو بڑے میرے پاس اجازت لینے آئے کہ اگر مجھے ناگوارِ خاطر نہ ہو تو ان کا معمول رات دیر گئے تک صوفیانہ کلام اور کافیاں گانے کا ہے، میں اب انہیں کیا بتاتا کہ کبھی میرے گھر اور گاڑی میں ہر لمحہ یہ کلام بجا کرتا تھا۔ موسیقی کا ہماری زندگی سے کچھ عجیب سا رشتہ ہے۔ ہم کبھی اسے مذہب کی وجہ سے رد کرتے ہیں اور کبھی دل کی خاطر اپنا لیتے ہیں۔ حرام اور حلال کی تقسیم میں دنیا کے بڑے بڑے گوّیے اس لت سے جان چُھڑوانے کے بعد بھی کسی نہ کسی حیثیت میں اس سے دوبارہ جڑ جاتے ہیں۔ کچھ خود کو نعتیہ اور حمدیہ کلام تک محدود کر لیتے ہیں، کچھ صرف صوفیانہ کلام کی لے پکڑ لیتے ہیں، گویا جھگڑا سُر سے نہیں سنگیت سے ہے، لَے کا نہیں، صرف تال کا ہے۔ میں جب دبئی میں تھا، تو میں نے بہت خوب صورت اور سُریلی اذان سُنی تھی۔ یہی حال میرا اسپین کی مسجد کے ایک موذن کی خوش الحانی سُن کر بھی ہوا تھا۔ ایسی آواز کہ قدم جکڑ کر رکھ دے۔ انسان خود بہ خود دعوت دینے والے کی جانب بڑھ جائے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت دبئی کے ایک رمضان کی تراویح میں سورۂ رحمان کی تلاوت سُن کر ہوئی تھی میری، شاید کچھ خوش الحانیوں کا تعلق ہماری روح کے کچھ دھاگوں، خمیر کے کچھ ریشوں سے بھی جڑا ہوتا ہے، خانہ بدوش قبیلے کا وہ خوش الحان بھی بہت سُریلا تھا۔ بابا بلھے شاہ کا کلام گڈوی کی تھاپ پر رات کی خاموشی میں سُر بکھیر رہا تھا۔

جا دَس دے دلبر ماہی نوں
میکوں یار بھلایا جاندا نئیں
سر رکھ کے یار دے قدماں وچ
سُر فیر اٹھایا جاندا نئیں
میرا دل اِک اے، میری جان اِک اے
میرا دین اِک، میرا ایمان اِک اے
جدوں رب رسولؐ قرآن اِک اے
دوجا یار بنایا جاندا نئیں

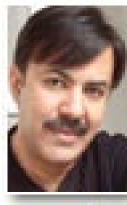
کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ گھائل روح ہمیشہ جانتی ہے کہ اس کے رستے زخموں کا مرہم کیا ہے، مسئلہ صرف دماغ کو منانے کا ہے

کہ دل اور دماغ کی یہ ازلی جنگ ہم مجبور' کم زور اور بے بس انسانوں کو سدا دو حصوں میں تقسیم رکھتی ہے' ہم دین کے ہو پاتے ہیں نہ دنیا کے' مجھ جیسے پری زاد بن جاتے ہیں، میں اک بنجارہ، جس کے لیے نہ کبھی زمین مہرباں رہی نہ آسمان۔ جانے کیا سوچ کر میری آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے' تب ہی میرے قریب سے ایک ملائم سی آواز اُبھری "آپ رو رہے ہو سائیں جی......؟؟" میں نے گھبرا کر اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں' سکینہ جانے کب سے میرے قریب کچھ قدم کے فاصلے پر آ بیٹھی تھی۔ میں نے حیرت سے آس پاس نظر ڈالی' بستی کے بہت سے گھرانے خانہ بدوشوں کے جگ راتے میں شریک ہونے کے لیے اپنے گھروں سے نکل آئے تھے۔ کچھ فاصلے پر مہر دین' اور شکورا بھی بیٹھے سر دُھنتے نظر آئے۔ "ہاں...... کچھ یاد کر کے آنکھ بھر آئی۔ تمہاری آنکھیں بھی تو ہر لمحہ چھلکنے کے لیے بے تاب رہتی ہیں۔ کیا غم ہے تمہیں؟ اگر کوئی حرج نہ سمجھو تو مجھے بتا سکتی ہو"۔ سکینہ سر جھکائے بیٹھی رہی' شکورے نے اُٹھ کر میری طرف آنے کی کوشش کی، تو مہر دین نے اسے ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھا دیا اور جانے اس کے کان میں کیا کہا۔ شاید مہر دین بھی سمجھ گیا تھا کہ سکینہ کبھی اپنے ناناکے سامنے کُھل کر زبان نہیں کھولے گی۔ سکینہ نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا" کچھ نہیں ہوا ہے مجھے سائیں جی۔ میرے گھر والے تو بس ایسے ہی ہلکان ہو رہے ہیں۔ خود ہی رُل کُھل کر ٹھیک ہو جاؤں گی۔ مجھے بھلا کیا ہونا ہے......؟" میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا" پھر ایک دم دنیا کیوں تیاگ دی تم نے' جوگن کیوں بن گئی ہو......؟" سکینہ نے پل بھر کے لیے نظریں اٹھائیں" جوگ تو آپ نے بھی لے رکھا ہے سائیں جی...... آپ نے بھی کوئی روگ لگا رکھا ہے کیا......؟" میں نے چونک کر سکینہ کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک سوال ہی میں، میرے سارے سوالوں کا جواب دے دیا تھا۔ میں بھی کتنا کم فہم اور نادان تھا۔ اتنے سامنے کی بات سمجھنے میں مجھے اتنی دیر لگ گئی تھی' دنیا کے ہر جوگ کے پیچھے یہی اِک محبت کا روگ ہی تو چھپا ہوتا ہے' یہی عشق کارفرما رہتا ہے' ہر عذاب کے درپردہ' اسی پیار کے نشتر کی کاٹ کا داغ ملتا ہے، ہر زخم کے پس منظر میں۔ محبت ہمیں سائیں بنا دیتی ہے' جوگی کے روپ میں ڈھال دیتی ہے' فقیر کے بہروپ میں لا کھڑا کرتی ہے۔ سکینہ کی کہانی بھی اسی محبت کے مارے بد نصیبوں میں سے ایک کی داستان تھی۔ تین سال پہلے جب وہ مکمل زندہ لڑکی تھی' جس کا دل بارش کی پہلی بوند کے ساتھ ہی جھولا ڈالنے کے لیے مچلنے لگتا تھا' ہوا کی سرگوشیاں جس کے دل کو گدگداتی تھیں' لمحہ بھر کے لیے ٹھہرے بادل کا سایہ، جسے دن بھر کے لیے خوش کر دیتا تھا۔ تب ایسی ہی ایک کالی رات، جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ برف بھری ٹوکریوں میں باغ سے آم چُرا کر جمع کر رہی تھی، تب ہی اُسے علاقے کے ایک گبرو، سانول نے دیکھ لیا۔ سانول علاقے کے نمبردار کا پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا بیٹا تھا، جو شہر کی یونی ورسٹی سے ایم اے لسانیات کی ڈگری لے کر آیا تھا اور اس ایک پہلی نظر نے ہی ان دونوں کا کام تمام کر کے رکھ دیا تھا۔ دنیا کتنی ترقی کر گئی ہے، چاند ستاروں پر کمند ڈالنے کی ضرورت نہیں رہی' کیوں کہ وہاں انسان کے قدم پہنچ چکے ہیں۔ صدیوں کے فاصلے لمحوں میں طے ہونے لگے ہیں۔ ہر کسی کو ہر لمحہ، ہر رابطہ میسّر ہے۔ مشین ہماری زندگی پر حاوی ہو چکی ہے۔ محبت کی روایتی داستانوں کو لوگ گزرے دنوں کا قصہ کہتے ہیں۔ ہیر رانجھا' سسّی پنوں' سوہنی مہینوال اور شیریں فرہاد' الف لیلیٰ کی کہانیاں لگتی ہیں۔ محبت ڈیجیٹل ہونے لگی ہے۔ انسان عروج کی کتنی منزلیں طے کر چکا ہے' مگر یہ پہلی نظر...... یہ آج بھی اپنے اندر وہی زمانے بھر کے عجائبات چھپائے بیٹھی ہے۔ کوئی سائنس دان آج تک اس پہلی نظر کے ڈنک کا علاج نہیں ڈھونڈ پایا۔ کوئی تریاق دریافت نہیں ہوا' نظر کے زہر کا آج تک۔ ہر خرابی کی جڑ یہی ایک پہلی نظر ہی تو ہے۔ نئے زمانے کے نئے لوگ لاکھ انکار کریں' لاکھ مذاق اڑائیں' مگر سچ یہی ہے کہ محبت اور نظر کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ پھر چاہے یہ نظر کبھی بھی اور کسی بھی طور ہماری زندگیوں میں وارد ہو جائے، یہی معاملہ سکینہ اور سانول کے ساتھ بھی ہوا۔ دونوں ایک بار ملے اور پھر ملتے ہی گئے۔ مگر ظالم زمانے کو بھلا یہ ملاپ کب بھاتا ہے' سماج سدا سے محبت کرنے والوں کا دشمن رہا ہے۔ سو' یہاں بھی وہی ہوا۔ علاقے کے کسی بندے نے سکینہ کو سانول سے ملتے ہوئے دیکھ لیا' بات پھیل گئی۔ سانول باقاعدہ رشتہ لے کر اپنے گھر والوں سمیت سکینہ کے گھر جانا چاہتا تھا، مگر اس کے نمبردار باپ کی انا ایک مزارع کے گھر رشتہ لے جانے کے آڑے آ گئی' ویسے بھی علاقے کا پٹواری اپنی بیٹی رضیہ کو سانول کے سنگ رخصت کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا اور نمبردار بھی پٹواری کے گھر رشتہ کرنے کا خواہاں تھا۔ رجّو شکل و صورت میں بھی چندے آفتاب، چندے ماہتاب تھی' اور اس کے خوابوں میں بھی نہ جانے کب سے سانول بس رہا تھا۔ وہ تو اس کی یونی ورسٹی کی چھٹیوں کی دعائیں مانگتی پھرتی تھی، تاکہ اس کے دل نگر کا شہزادہ واپس گھر لوٹ سکے' مگر جب اسے پتا چلا کہ سانول اور سکینہ کی کہانیاں ریاست پور کے گلی کوچوں میں پھیل رہی ہیں' تو اس کے سینے پر بہ یک وقت کئی سانپ لوٹ گئے' جانے یہ محبت کی کہانیاں اتنی جلدی سارے زمانے میں کیوں اور کیسے پھیل جاتی ہیں؟ ورنہ ہر دوسری آفت آ کے گزر بھی جائے' ہم اس کی تباہی سے آخری وقت تک بے خبر رہتے ہیں۔ رضیہ جسے لاڈ سے سارے گھر والے رجّو کہتے تھے' اس لیے بھی بے چین تھی کہ اسے یقین تھا کہ بستی بھر میں صرف وہی ایک سانول کے جوڑ کی ہے' اس کے حُسن کے چاند کے سامنے بھلا کسی اور کے رُوپ کا چراغ کیا جلے گا' مگر اس نے جو سوچا تھا' سب اس کے الٹ ہو رہا تھا۔ یہ معمولی سے کمّی کمین گھرانے کی سکینہ کہاں اس کے سپنوں کی تجوری پر ڈاکا ڈالنے آ گئی تھی۔ رجّو کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ کسی طرح سکینہ کے چہرے پر تیزاب پھینک کر اسے عمر بھر کے لیے داغ دار کر دے۔ جانے علاقے کے سب سے وجیہہ نوجوان کو اس کے اندر کیا نظر آتا تھا؟ یہ رقیب بھی کتنے ظالم ہوتے ہیں' جانے دنیا میں محبت پہلے اتری تھی یا رقابت؟ رقیب ہر لمحہ اپنے حریف کی سانسیں بند کر دینے کی فکر میں گھلتا رہتا ہے۔ رجّو کا بھی یہی حال تھا، اور پھر آخر کار اس کے دل کی مُراد بر آئی۔ سانول کی ماں نے اس کے سامنے اپنا دوپٹا ڈال دیا اور بہنوں نے اپنی چادریں پھیلا دیں کہ ان کی محبت اور مان کی خاطر وہ رجّو سے بیاہ کے لیے ہاں کر دے۔ دنیا میں چور اور ڈاکو دوسروں کے گھروں میں بڑے بڑے ڈاکے ڈالتے ہیں' مگر اس جہاں کا سب سے بڑا ڈاکا، یہ رشتوں کا ڈاکا ہوتا ہے۔ جو ہمارے ماں باپ' بہن بھائی اپنی محبتوں اور خدمتوں کی دُہائی دے کر کسی اپنے ہی چہیتے کی محبت لُوٹ کر مارتے ہیں۔ سانول بھی باپ کی ضد' ماں کے آنسوؤں اور بہنوں کی آہوں کے سامنے آخر کار مجبور ہو گیا اور اس نے اپنی ہی محبت کا خرمن جلا ڈالا' کہتے ہیں ریاست پور کی بڑی باراتوں میں سے ایک بارات تھی نمبردار کے بیٹے کی۔ سانول کی جنج کیا چڑھی' سکینہ کے دل کا دریا ہمیشہ کے لیے اُتر گیا۔

شادی سے ایک رات پہلے سانول آخری بار سکینہ سے ملنے آیا۔ اس نے سکینہ کو اپنے دل کی حالت بتائی اور مجبوریوں کی ساری داستان بیان کی کہ وہ اپنی ماں اور بہنوں کی محبت کا اتنا مقروض ہے کہ جس کے سود کے طور پر ان دونوں کو اپنی محبت عمر بھر کے لیے گروی رکھنی پڑے گی۔ سکینہ چپ رہی۔ محبت میں عورت اپنی مجبوری بیان کرے تو اس

پر دنیا بڑے سخت الزامات لگاتی ہے۔ بے وفائی کے طعنے اور سنگ دلی کے طنز کیے جاتے ہیں۔ تیروں سے عورت کا سینہ چھلنی کر دیا جاتا ہے' مگر مرد جب محبت میں اپنی مجبوری بیان کرتا ہے، تو اسے اپنے رشتوں کا وفادار' زمانہ شناس اور مخلص کہا جاتا ہے۔ اس کی قربانیوں کے گن گائے جاتے ہیں اور زمانہ اسے اپنی پلکوں پر بٹھاتا ہے۔ سانول بھی رجو کی پلکوں کی ڈولی چڑھ گیا' سارا گاؤں ان دونوں کی خوب صورت اور سجیلی جوڑی دیکھنے کے لیے اُمڈ آیا تھا۔ ایسے لگتا تھا، جیسے دونوں کو بس قدرت نے ایک دوسرے کے لیے ہی تراشا تھا۔ دلوں کے حال تو خدا بہتر جانتا ہے' مگر کہنے والے کہتے تھے کہ سانول اور رجو کی نظر ایک دوسرے سے ہٹائے نہیں ہٹ رہی تھی۔ رجو نے جب شادی کی رات سانول کے گھر میں پہلا قدم رکھا' تب ہی سے سانول کی ماں' بہنیں رجو پر صدقے واری جا رہی تھیں۔ نصف شب تک رسمیں چلتی رہیں اور ماں بہنوں نے اپنے ویر شہزادے کی بارات کا ہر ارمان جی بھر کے پورا کیا۔ سارا محلہ سانول کے گھر کی طرف سے آنے والی شہنائیوں کی آواز اور ڈھول بتاشوں کی دھمک سے رات بھر گونجتا رہا۔ ان کے قہقہوں کی آواز سکینہ کے گھر کے آنگن تک بھی آ رہی تھی۔ سکینہ کا دل کبھی نہ پھٹتا اگر ان رفسی کی آوازوں میں خود اس کے اپنے محبوب کی آواز شامل نہ ہوتی۔ اس درد کا احساس صرف وہ کر سکتا ہے' جس نے زندگی میں کبھی خود محبت کی ہو۔ جگر کیسے چھلنی ہوتا ہے اور سینے سے جلتے دل کا دھواں کیسے نکلتا ہے' جب اپنا ہی سانول کسی اور سانوری کے ساتھ شبِ عروسی منا رہا ہو۔ سکینہ کے اندر بھی کچھ ایسا شور مچا کہ سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا اور پھر اسے ایسی چپ لگی کہ لوگ اس کی آواز سننے کو بھی ترس گئے۔ جسم کے اندر بہتا خون سوکھتا چلا گیا۔ ہونٹوں سے مسکان کا رشتہ کچھ ایسے ٹوٹا کہ وہ سدا کے لیے مسکرانا ہی بھول گئی۔ محبت جب انسان کی شریانوں اور بہتی نسوں میں خون کے ساتھ دوڑتی ہو، تب وہی محبت روٹھ جانے پر، لہو کی روانی روک بھی دیتی ہے۔ خون صرف بہہ کر ہی خشک نہیں ہوتا' کبھی کبھی نسوں کے اندر بھی اپنا بہاؤ کھو بیٹھتا ہے۔ محبت کا مریض دن بہ دن لاغر اور کمزور ہوتا جاتا ہے۔ دنیا بھر کے طبیب اس کے مرض کی شناخت ڈھونڈنے میں لگے رہتے ہیں' مگر مرض کا سرا نہیں ملتا' مریض سوکھ کر کانٹا ہو جاتا ہے اور یہ ظاہر پرست حکیم اور وید اس کھوج میں گھلتے رہتے ہیں کہ آخر بنا کوئی چوٹ لگے، بنا کسی بیماری کے، اس مریض کا وزن دن بہ دن کم کیوں ہوتا جا رہا ہے۔ گالوں کی سُرخی پیلاہٹ میں کیوں بدل رہی ہے، جسم کی شادابی خشک ہوتے پتے کی طرح رخصت کیوں ہو رہی ہے۔ سکینہ کے ساتھ بھی یہی سب کچھ ہو رہا تھا اور پھر تین چار ماہ کے اندر اندر وہ ایک چلتی پھرتی لاش بن گئی۔ اس کا محبوب اپنی نئی دنیا میں مگن تھا، ایک آدھ بار قصبے کے بازار یا کسی درگاہ، مزار پر سکینہ کا سامنا ہوا بھی، تو وہ نظریں چرا گیا، یا شاید وہ سکینہ کو پہچان ہی نہ پایا ہو۔ یہ تو وہ سکینہ تھی ہی نہیں' جو کبھی اس کے دل کی رانی تھی۔ سکینہ بس سانول کو دیکھتی ہی رہ گئی اور وہ آگے بڑھ گیا۔ آج بھی کتنا بانکا اور سجیلا تھا اس کا محبوب، مگر رجو کو کسی نوکرانی کی زبانی اس ٹکراؤ کی خبر ملی، تو وہ برداشت نہ کر پائی۔ اسے یوں محسوس ہوا، جیسے سانول اب بھی چھپ چھپ کر سکینہ سے ملتا ہے۔ رقیب ہمیشہ رقیب ہی رہتا ہے۔ محبوب کا درجہ پانے کے بعد بھی اس کے اندر پلتے سدا کے شکوک و شبہات کبھی اسے اس اعزاز کا حق دار نہیں بننے دیتے۔ رقیب نے چوں کہ خود کسی کی محبت پر ڈاکا مارا ہوتا ہے' اس لیے وہ ساری زندگی خود ایسی کسی چوری سے ڈرتا رہتا ہے۔ اس کی نیندیں اپنے خزانے کی حفاظت کی فکر میں اڑی رہتی ہیں۔ جلن اور حسد کے سانپ اسے ہمیشہ ڈستے رہتے ہیں۔ رجو بھی کسی ایسی ہی تپش کا شکار تھی۔ وہ یہ بات نہیں بھولی تھی کہ کبھی سانول سکینہ پر مرتا تھا۔ دونوں کی محبت کے ہر سو چرچے تھے۔ کون جانے کب سانول کے دل میں پھر سے پرانی محبوبہ کی محبت جاگ اٹھے۔ رجو سوچ سوچ کر ہلکان ہو گئی، تو پھر آخر کار اسے وہ خوف ناک فیصلہ کرنا ہی پڑا' جو صرف ایک رقیب ہی کر سکتا ہے۔ فنا کر دینے کا فیصلہ' جو محبت کرتے ہیں وہ خود کو فنا کر لیتے ہیں اور جو رقیب ہوتے ہیں' وہ دوسروں کو مار کر اپنی محبت کی بقا ڈھونڈتے ہیں۔ رجو نے علاقے کی نیاز کی رسم کے مطابق منوں دودھ خرید کر ساری بستی میں تقسیم کروایا۔ البتہ اس بانٹ میں بس ایک فرق تھا۔ سکینہ کے گھر جو دودھ کی مٹکی بھیجی گئی تھی، اس کے اندر علاقے کے سب سے زہریلے سانپ کا زہر حاصل کر کے چند بوندیں اس دودھ میں ملا دی گئی تھیں۔ سکینہ کی ماں نے پیتل کی مٹکی سے دودھ نکال کر کٹوری سکینہ کے سامنے رکھ دی۔

(جاری ہے)



......ہاشم ندیم

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ’’خدا اور محبت‘‘ اور ’’بچپن کا دسمبر‘‘ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ’’عبداللہ‘‘ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغہ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ’’عبداللہ‘‘ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

’’پری زاد‘‘ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ’’سنڈے میگزین‘‘ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:
sundaymagazine@janggroup.com.pk

ماں چاہتی تھی، اس کی مریض لاڈلی کے بے رونق چہرے پر کچھ رنگ آجائے، شاید اس تازہ اور میٹھے دودھ کی تاثیر ہی سے کچھ پل کے لیے اس کی نڈھال سی دُلاری توانائی محسوس کرے۔ سکینہ نے دودھ کی کٹوری اٹھا کر منہ سے لگائی ہی تھی کہ باہر سے اس کے بوڑھے باپ کے کھانسنے کی آواز سنائی دی، مگر دوسری آواز سُن کر تو جیسے اس کی پوری کی پوری روح ہی جھنجھنا گئی۔ یہ تو سانول کی آواز تھی۔ ہاں...... اسی سانول کی جس کی محبت نے اس کی روح کے ریشے ادھیڑ کر رکھ دیئے تھے۔ سکینہ کے ہاتھ میں کٹوری کچھ ایسے لرزی کہ سارا دودھ کپڑوں پر چھلک گیا۔ سکینہ نے کٹوری نیچے رکھ دی اور خود پردے کی اوٹ سے باہر ہونے والی بات چیت سُننے لگی۔ پتا چلا کہ سانول کسی کام سے سکینہ کی گلی سے گزر رہا تھا کہ سکینہ کے باپ کی نظر اس پر پڑ گئی۔ پرانی باتوں اور یادوں کا سلسلہ کچھ ایسا چلا کہ گِلے شکوے زبان تک آگئے۔ سانول نے سکینہ کے باپ کو یقین دلایا کہ وہ آج بھی خود کو ان کے گھرانے کا ایک فرد سمجھتا ہے، مگر سکینہ کا باپ بضد ہوگیا کہ اب ملاقات ہو ہی گئی ہے، تو دو گھڑی اس کے گھر کے صحن میں بیٹھ کر انہیں عزت بخشے۔ سانول نے اسے ٹالنے کی بہت کوشش کی، مگر اس کی ایک نہ چلی۔ سکینہ کی ماں جو دل ہی دل میں ہمیشہ ہی سانول کو اپنے داماد کے روپ میں دیکھنے کی خواہش مند تھی، اُسے گھر میں پا کر ایک بار پھر اپنی ناکام آرزو کا غم لیے سانول کی خدمت میں مصروف ہوگئی۔ گھر میں اور کچھ تو تھا نہیں پیش کرنے کے لیے، رجّو کے گھر سے آئی دودھ کی مٹکی ہی میں سے ایک کٹوری نکال کر سانول کو تھمادی، جو اس نے ایک سانس میں حلق سے نیچے اتاری اور جانے کے لیے کھڑا ہوگیا۔ شاید وہ سکینہ کا سامنا کرنے کے خیال سے گھبرا رہا تھا، مگر سانول دروازے تک بھی نہ پہنچ پایا تھا کہ لڑکھڑا کر وہیں گر گیا۔ سارے گھر میں بھونچال سا آگیا، سبھی سانول کی جانب لپکے، سکینہ بھی ساری لاج شرم بھلا کر دروازے کی جانب دوڑی۔ سانول کے ہونٹوں کے کنارے سے خون کی ایک پتلی سی لکیر نے زمین پر گلال بکھیر دیا تھا۔ سانول اور سکینہ کی نظر آخری بار ٹکرائی، اُن دونوں کی آنکھوں میں ایک عجیب سی اُداسی تھی۔ سانول کو کچھ کہنے اور سکینہ کو کچھ سُننے کی مہلت ہی نہ ملی اور سانول نے وہیں سکینہ کے سامنے دَم توڑ دیا۔ ایک قیامت آگئی، سکینہ پر تو جیسے سکتہ طاری ہوگیا۔ سکینہ کے باپ اور گھر کے باقی مردوں کو علاقے کی پولیس قتل کے الزام میں دھر کرلے گئی۔

رجّو کو جب سانول کی موت کا پتا چلا، تو اس نے لمحے بھر ہی میں صحن میں بنے کنوئیں کی منڈیر ٹاپ کر گہرائی میں چھلانگ لگا دی۔ خوش قسمتی سے گھر کی نوکرانی نے بروقت اطلاع کردی اور رجّو کو زندہ کنوئیں سے نکال لیا گیا، مگر وہ زندہ کب تھی۔ نہ جانے سانس کی روانی اور دل کے دھڑکنے کو زندگی کا نام کیوں دے دیتے ہیں لوگ...! سات دن بعد رجّو کا سکتہ ٹوٹا تو وہ پہلی بار ٹوٹ کر روئی۔ اُسے پتا چلا کہ سکینہ کے گھر والوں نے جلن اور حسد کی آگ میں جلتے ہوئے، سانول کو دودھ میں زہر ملا کر مارا۔ ساری بستی یہی سمجھتی تھی کہ یہ حرکت سکینہ کی ہوسکتی ہے، جس پر پردہ ڈالنے کے لیے اس کے گھر والوں نے خود کو قربانی کے بکرے کے طور پر پولیس کے حوالے کردیا، تو رجّو نے اپنی عزّت کی پروا بھی نہیں کی اور سیاہ چادر اوڑھ کر سکینہ کے گھر پہنچ گئی۔ سکینہ اور رجّو کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے کو ٹکر ٹکر دیکھتی رہیں اور پھر رجّو یوں لپک کر سکینہ کے سینے سے جا لگی، جیسے برسوں کے بچھڑے ملتے ہیں۔ دونوں کچھ ایسے پھوٹ پھوٹ کر روئیں کہ مانو سیلاب آگیا۔ صرف وہ دونوں ہی دنیا میں ایسی تھیں، جو ایک دوسرے کے دل کا درد سمجھ سکتی تھیں۔ اُن دونوں کا محبوب اُن سے بچھڑ گیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی رقیب تھیں، مگر رقیب سے زیادہ محبت کے بچھڑنے کا دُکھ بھلا کون جانتا ہے۔ یہاں محاورتاً نہیں حقیقتاً دونوں کا غم ایک تھا۔ صرف وہی دونوں اس کرب کی کاٹ اور جان لیوا عذاب سے واقف تھیں۔ رجّو نے پولیس کو اپنا سچا بیان ریکارڈ کروادیا۔ سکینہ کے گھر والے رہا ہوگئے اور رجّو سلاخوں کے پیچھے چلی گئی، مگر اس محبت کی بھٹی نے سکینہ کو کچھ ایسا جلایا کہ وہ تپ کر کُندن ہوگئی۔ ایک ایسا پارس بن گئی، جس سے چھو کر لوہا تو لوہا، مٹی بھی سونا بنتی گئی۔ اسے شاید یہ اعزاز اس لیے ملا کہ اس نے خود اپنے لیے دنیا ترک کر چھوڑی تھی۔ اس کے ہاتھ جب بھی اٹھے یا اس کے لب جب بھی کُھلے، صرف اوروں کے لیے ہی کُھلے، خود اپنے لیے کچھ بچا ہی کب تھا کہ وہ مانگتی۔ شاید ہم جب کسی دوسرے کے لیے اپنے خدا سے کچھ مانگتے ہیں، تب ہم خلوص، عاجزی اور بندگی کی اس معراج پر ہوتے ہیں، جو دنیا کی ہر دُعا کی قبولیت کا آخری پیمانہ ہے۔

نصف شب ڈھل چکی تھی۔ خانہ بدوش بنجاروں کا جلایا ہوا الاؤ سرد پڑ گیا تھا۔ بنجارے نے آخری تان لگائی اور محفل برخاست کردی۔ جانے اُس لمحے پھر مجھے شدت سے یہ احساس کیوں ہوا کہ میں خود بھی تو ایک بنجارہ ہوں اور وہ مجسمہ ساز کسی چاند نگر کی شہزادی تھی۔ بنجاروں کی پہنچ شہزادیوں تک بھلا کب ہوتی ہے۔ مٹی کے کھلونوں کے بدلے رُوپ کا سونا کون بیچتا ہے؟ رُوپ کے سودے صرف رُوپ کے بدلے ہوتے ہیں اور جو مجھ جیسے بے رُوپ، بدصورت ہوتے ہیں، اُن کے ہاتھ صرف خاک ہی آتی ہے، خاک کے بدلے خاک! شکورا اور مہر دین سکینہ کو لے کر واپس جانے لگے، تو میں نے شکورے سے کہا۔ ’’اتنا کچھ ہو چکا ہے اور تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا، پھر بھی تمہاری یہ خواہش ہے کہ تمہاری نواسی ہنسے بولے اور پھر سے عام زندگی جیئے......؟‘‘ شکورا شرمندگی کے مارے سر جھکائے کھڑا رہا۔ مہر دین نے اس کی مدد کی۔ ’’یہ ساری بُھلا بتانے کی باتیں ہیں سائیں جی! شرمندگی ہی شرمندگی ہے اور پھر تم سے کون سی بات چُھپی ہے سائیں!

نیاڑاں توبس اتنا چاہتا ہے کہ اس کی سکینہ بھی دوسری لڑکیوں کی طرح ڈولی چڑھ کر اپنے لاڑے کے ساتھ رخصت ہو جائے، اس کا بھی گھر بار ہو، بال بچے ہوں، یہ باتیں سب کے سامنے کہنے والی تو نہیں ہیں ناں سائیں جی......! بس تم دعا کر دو ہماری سکینہ کے لیے۔'' میں نے سر جھکائے کھڑی سکینہ پر ایک نظر ڈالی۔ ''یہ مجھ جیسے برائے نام اور دکھاوے کے سائیں بابوں کی دُعا سے بہت آگے جا چکی ہے مہر دین! اسے اس کے حال پر چھوڑ دو، اس کی خوشی اور اس کے غم کے معیار اس دنیا کی روایت سے بہت جدا ہیں، اگر تم دونوں اس کی خوشی چاہتے ہو، تو اس سے کہو کہ خود اپنے لیے خوش حالی اور اچھے گھر بار کی دعا کرے، یہ اگر مان گئی تو سب ٹھیک ہو جائے گا، ورنہ اسے زیادہ تنگ نہ کرنا۔ یہ جس حال میں خوش رہے، تم سب اسی کی خوشی میں خوش رہنا۔'' مہر دین اور شکورا سر جھکائے چُپ چاپ سکینہ کو وہاں سے لے کر چلے گئے۔ کچھ دیر ہی میں صبح کا اُجالا پھیلنے لگا۔ سویرے سے انگڑائی اور انگڑائی سے زندگی جاگنے کا استعارہ جوڑ دیا گیا ہے۔ سکینہ کی بستی بھی انگڑائی لے کر جاگ اٹھی، گھروں سے مرغوں کی بانگیں اور چھتوں کی چمنیوں سے زندگی کی نوید دیتا دھواں آسمان کی طرف بلند ہونے لگا۔ ان سارے دیہات، قصبوں اور بستیوں کی صبح ایک جیسی ہوتی ہے، شہروں کی طرح ایک جھٹکے سے نہیں، بلکہ دھیرے دھیرے جاگنے والی، سرکتی، پھیلتی دھوپ کی طرح آہستہ آہستہ بستی کے در و بام اور آنگنوں میں اترنے والی......! میں نے کسی گزرتے راہ گیر سے سانول کی قبر کا پتا پوچھا اور قبرستان جا کر فاتحہ پڑھ آیا۔ قبر کے قریب کچی زمین پر مجھے بہت سی آڑی ترچھی لکیریں کھنچی نظر آئیں، ویسی ہی لکیریں جیسی سکینہ نے میرے ڈیرے کی زمین پر کھینچ رکھی تھیں۔ میرا جی چاہا کہ میں ساری بستی کو اکٹھا کر کے انہیں یہ نوید سنا دوں کہ اب انہیں اپنی دعاؤں کی قبولیت کے لیے کسی فقیر یا مجذوب کی حمایت کی ضرورت نہیں، وہ دو ہاتھ، ہتھیلیوں کا چاند تو خود ان کی بستی کے ایک کچے گھر میں روشن ہے، مگر یہ سدا کے توہم پرست لوگ بھلا میری بات پر کہاں یقین کریں گے، ہاں اگر سکینہ کسی چوہدری، وڈیرے یا نمبردار کی بیٹی ہوتی، تو یہی لوگ آنکھیں بند کر کے میرے ہر جھوٹ پر بھی یقین کر لیتے اور اس وقت تک سکینہ کی حویلی کے باہر ضرورت مندوں کی بھیڑ لگ چکی ہوتی۔ میں آج تک کبھی یہ بات نہیں سمجھ پایا تھا کہ ہم انسان دُعا کی قبولیت کے لیے اپنے جیسے زندہ یا مُردہ انسانوں کی سفارش یا وسیلہ کیوں ڈھونڈتے ہیں، ہم اپنے رب سے براہ راست کچھ مانگتے ہوئے اتنا جھجکتے اور شرماتے کیوں ہیں؟ یہ کیسی بے یقینی ہے ہمارے اندر، یا شاید یہ بھی مایوسی کی ایک قسم ہے، مگر مایوسی کو تو کفر قرار دیا گیا ہے۔ گویا یہ سارے بے یقین بھی اپنے اعتبار کے کافر ہیں......؟

ڈیرے پر واپس پہنچنے سے پہلے میں یہ طے کر چکا تھا کہ ایک آدھ ہفتے میں یہاں سے کُوچ کر جاؤں گا کہ میں اب اس ڈھونگ کا بوجھ مزید نہیں اٹھا سکتا تھا۔ واپس آ کر میں نے دو گھڑی ستانے کے لیے کمر ٹکائی ہی تھی کہ مہر دین کا پوتا اپنی چھوٹی سی سُرخ سائیکل دوڑاتے، ہانپتا ہوا وہاں آ پہنچا۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''سب خیر تو ہے کاکے......؟'' بچّے نے مجھے چاروں طرف گھوم پھر کر یوں دیکھا جیسے تسلی کر رہا ہو کہ میں ٹھیک ہوں یا نہیں! ''کچھ نہیں سائیں جی! دادے نے کہا تھا کہ جا کر دیکھو سائیں جی ٹھیک ٹھاک ہے کہ نہیں...... بس اب میں چلا۔'' وہ جیسے آیا تھا، ویسے ہی تیز تیز پیڈل چلاتے وہاں سے بھاگ گیا۔ یہ بچّے بھی اپنی دنیا میں رہنے والے مست ملنگ ہی ہوتے ہیں، اپنی رمزیں خود ہی جانتے ہیں۔ جانے مہر دین نے اسے کس کام سے بھیجا تھا اور وہ کیا سمجھا تھا، مگر دوپہر ڈھلتے ہی مہر دین خود بھی شکورے کے ساتھ ہڑبڑایا ہوا سا وہاں آن پہنچا۔ اُن دونوں کے چہرے پر لکھی پریشانی کی لکیریں دُور سے پڑھی جا سکتی تھیں۔ ''سائیں جی! سب خیری صلا ہے ناں......؟'' ''ہاں میں ٹھیک ہوں مگر تم دونوں اتنے پریشان کیوں دکھائی دے رہے ہو......؟'' ان دونوں سے کوئی بات ٹھیک سے بُجھ نہیں پائی۔ ''وہ جی سکینہ نے آج صبح یہاں سے واپس جا کر تمہارے لیے بہت بُرا سُفنا دیکھا ہے۔'' میں ہنس پڑا۔ ''بس اتنی سی بات ہے، تم دونوں سکینہ کے بُرے سپنے سے گھبرا کر یہاں دوڑے چلے آئے...... میری زندگی پہلے ہی کسی بُرے خواب سے کم نہیں ہے، جاؤ جا کر سکینہ سے کہہ دو کہ میں بالکل ٹھیک ہوں، میرے لیے فکرمند نہ ہوا کرو تم لوگ......! کچھ نہیں ہو گا مجھے!'' لیکن میری اس بے فکری کا اُن دونوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ شکورا بولا۔ ''بات اتنی سادی نہیں ہے جی! سکینہ کے خواب سچّے ہوتے ہیں سارے...... جب سے سانول کی موت ہوئی ہے، اس کا کوئی خواب جھوٹا ثابت نہیں ہوا۔'' میں نے ان دونوں کو تسلّی دی۔ ''مگر تم دونوں اتنے پریشان کیوں ہو، آخر اس نے ایسا کیا دیکھ لیا ہے خواب میں......! میرے پاس کھونے کے لیے اب باقی کچھ نہیں بچا ہے۔'' شکورے نے گہری سانس لی۔ ''سائیں جی! اب میں کیا بتاؤں تمہیں، میری تو زبان جلتی ہے بولتے ہوئے، سکینہ نے خدانخواستہ تمہاری موت دیکھی ہے...... اس نے خواب میں دیکھا کہ ہمارا سائیں فوت ہو گیا ہے اور ہم سب اس کے لیے کفن دفن کا انتظام کر رہے ہیں۔'' مہر دین نے شکورے کو سختی سے گھورا اور شکورا گھبرا کر خاموش ہو گیا۔ وہ دونوں کافی دیر میرے قریب بیٹھے رہے، جیسے انہیں خوف ہو کہ ان کے جاتے ہی مجھے کچھ ہو جائے گا۔ پتا چلا کہ سکینہ کے ہر خواب کی تعبیر تب سے سچّی ہوتی ہے، جب سے سکینہ خود ایک خوابِ رفتہ جیسی زندگی گزار رہی ہے۔ جب شام گہری ہونے لگی، تو میں نے انہیں زبردستی واپس بھیج دیا، ورنہ ان دونوں کا ارادہ اُٹھنے کا نہیں لگ رہا تھا۔

اندھیرا ڈھلا تو میرے دل کے اندھیرے بھی میرے اردگرد رقص کرنے لگے۔ چلو اچھا ہوا، سکینہ نے مجھے میرا انجام کچھ پہلے ہی بتا دیا، ورنہ خود میں اس انجام کے لیے ہمیشہ سے تیار تھا، کہانی ختم ہونے کا وقت آ پہنچا تھا۔ میں خود بھی بہت تھک چکا تھا اس بھاگ دوڑ سے، اب لمبی نیند سونے کو جی

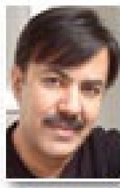
چاہتا تھا۔ رات ڈھلی تو میں نے یہی سوچ کر آنکھیں موندلیں کہ اب یہ آنکھیں شاید کبھی نہ کُھلیں، مگر حشر تک کی نیند شاید ابھی میرا مقدر نہیں تھی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ اِک نئی صبح کی نوید لے کر آئی تھی، مگر میری آنکھ کُھلنے کی وجہ کچھ اور تھی۔ دُور سڑک کے کنارے ایک بڑی امپورٹڈ گاڑی کا بونٹ کھلا ہوا تھا اور ڈرائیور سمیت ایک دوسرا شخص بونٹ پر جُھکا ہوا کچھ دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ایک تیسرا محافظ نما شخص قریبی جوہڑ سے پانی کا ایک کین بھر کر لایا اور ڈرائیور نے پانی گاڑی کے ریڈی ایٹر میں ڈال دیا۔ میں نے بے زاری سے چہرہ موڑ کر آنکھیں بند کر لیں، مگر پھر اچانک ایک مانوس سی آواز نے میرے وجود میں بجلیاں سی بھر دیں۔ وہ ڈرائیور سے کہہ رہا تھا۔ ''اور کتنا دیر لگے گا کم بخت...... سارا دن لگائے گا کیا......؟'' میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ بونٹ پر جُھکا ہوا دوسرا شخص کبیر خان تھا۔ ہاں وہ کبیر ہی تھا، جو کبھی میرا محافظ ہوا کرتا تھا۔ جانے وہ اس ویرانے میں کیا کر رہا تھا۔ ڈرائیور نے اسے کچھ کہا اور پھر

اچانک اس کی نظر دُور بیٹھے مجھ پر پڑی۔ میری رگوں میں خون جمنے لگا۔ میں کبیر سے خاصے فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا اور میرے ماضی اور حال کے حلیے میں زمین آسمان کا فرق تھا، مگر پھر بھی نہ جانے کیوں کبیر کی نظریں مجھے اپنے جسم کے آر پار ہوتی محسوس ہوئیں۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا، مگر میں نے لاتعلقی سے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر کبیر خان نے میری طرف بڑھنے کی کوشش کی تو میں کسی بھی بہانے وہاں سے اٹھ کر دوسری جانب چل پڑوں گا۔ کبیر نے اپنے ساتھ کھڑے محافظ سے کچھ کہا اور محافظ سر ہلا کر میری جانب چل پڑا۔ میں دم سادھے بیٹھا رہا۔ اچھا ہوا کہ کبیر خود میری طرف نہیں آیا، ورنہ وہ میری آواز ضرور پہچان لیتا۔ محافظ نے میرے قریب آ کر سلام کیا اور جیب سے میری ہی ایک تصویر نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ ''باباجی! ان صاحب کو یہاں آس پاس کہیں دیکھا ہے آپ نے......؟'' میں نے بظاہر لاپروائی سے تصویر پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور آنکھیں موند کر جواب دیا۔ ''یہ تو کوئی بڑا آدمی لگتا ہے اپنے حلیے سے...... اس چھوٹے سے گاؤں میں بھلا اس کا کیا کام...... کون ہے یہ آدمی......؟'' محافظ نے گہری سانس لی۔ ''یہ میرے صاحب کے صاحب ہیں، بہت عرصہ پہلے کہیں چلے گئے تھے سب چھوڑ چھاڑ کر......! ہم تب سے انہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔'' میں نے چور نظروں سے محافظ کی طرف دیکھا، مگر مجھے یاد نہیں آیا کہ وہ کون تھا، شاید کبیر یا کمالی کے ذاتی عملے کا کوئی ملازم ہو گا۔ بہر حال وہ جو کوئی بھی تھا، اس کے میرے قریب یوں دیر تک بیٹھے رہنا میرے لیے خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کبیر کسی لمحے بھی میری طرف آ سکتا تھا یا پھر شاید اسی شخص کو میری بڑھی ہوئی داڑھی اور لٹوں کے پیچھے میرے ماضی کی کوئی جھلک نظر آ جاتی، لہٰذا میں نے وہاں سے اٹھ جانے ہی میں بہتری جانی۔ ''تم لوگ یہاں اپنا وقت ضائع کر رہے ہو، یہاں آس پاس کی سبھی بستیوں میں اپنی زندگی کے بہت سے سال گزار چکا ہوں، سبھی جگہ آنا جانا لگا رہتا ہے، یہ شخص کبھی یہاں نہیں آیا، جاؤ کہیں اور تلاش کرو...... میں ذرا ڈیرے کے لیے پانی بھر لوں۔'' محافظ بھی میرے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا اور ہم دونوں مخالف سمتوں کی جانب چل پڑے۔

میں نے کچھ دُور جا کر ایک درخت کی اوٹ سے چھپ کر دیکھا تو محافظ اور کبیر آپس میں کچھ بات کر رہے تھے، پھر وہ تینوں گاڑی میں سوار ہو گئے اور ریاست پور سے مخالف سمت میں آگے بڑھ گئے، لیکن میں کبیر خان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ اتنی جلدی ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔ آج نہیں، تو کل وہ اس راستے پر ضرور پلٹتا۔ میرے دل میں یہ خدشہ ہمیشہ سے موجود تھا کہ میرے یوں چلے جانے کے بعد وہ سب ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہے ہوں گے اور پھر کبیر خان جیسا وفادار تو کبھی ٹک کر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے ہر وہ جگہ چھان ماری ہو گی، جہاں میری موجودگی کا ذرہ برابر بھی امکان رہا ہو گا۔ میرا دل ایک بار شدت سے مچلا کہ میں ایک لمحے کے لیے کبیر کو روک کر عینی کے بارے میں پوچھ لوں، پھر میں اسے اپنی قسم دے کر منا لیتا کہ وہ کبھی کسی کے سامنے میرا ذکر نہیں کرے گا، مگر پھر میں نے خود ہی اپنے اندر کے اس اُبال پر قابو پا لیا۔ کبیر مجھے اپنے ساتھ لیے بنا کبھی واپس نہ جاتا، یا پھر خود بھی عُمر بھر کے لیے یہیں ڈیرے ڈال دیتا۔ ان کے جانے کے بہت دیر بعد تک بھی میرے دل کی دھڑکنیں معمول پر نہیں آئیں، سب کچھ دوبارہ سے تازہ ہو گیا، میرے دل و دماغ میں......! یادیں کبھی پُرانی نہیں ہوتیں، یادِ ماضی کو بُھلانا صرف دل بہلاوے کی باتیں ہیں، چاہے ہم ساری عُمر بھی اپنی یادوں سے فرار لے کر بھاگتے رہیں۔ ہم جہاں تھک کر گرتے ہیں، وہیں سے یادوں کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ کبیر خان کی آمد نے میرے لیے خطرے کی گھنٹی بجا دی تھی۔ اب میرا یہاں رہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ کبھی بھی واپس پلٹ سکتا تھا۔ میں نے مہردین کے ذریعے شکورے کو بلا بھیجا۔ میری امید کے مطابق سکینہ بھی شکورے کے ساتھ چلی آئی، شاید شکورے نے اسے بھی میری روانگی کے خدشے سے آگاہ کر دیا تھا۔ سکینہ میرے لیے کافی فکرمند دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی۔ ''میری فکر نہ کرنا، میں بہت پہلے مر گیا تھا، اب صرف تصدیق ہونا باقی ہے، ہو سکے تو اپنے ماں، باپ اور نانا کی خاطر کسی بہتر اور نیک بندے کو اپنا جیون ساتھی چن لینا، میں جانتا ہوں تمہارے لیے وہ دُہری زندگی جینا بھی کسی عذاب سے کم نہیں ہو گا، مگر یہ دنیا اپنے لگے بندھے اصولوں پر چلتی ہے، سو، جیسا دیس ہے، ویسا بھیس اپنا لو۔'' میں نے شکورے اور مہردین کو سختی سے منع کیا تھا کہ وہ بستی میں میری روانگی کا کسی سے ذکر نہیں کریں گے۔ رخصت ہوتے وقت ہم چاروں کی آنکھیں نم تھیں، وہی کچھ جھوٹے وعدے ہوئے پھر سے ملنے کے، جلد لوٹ آنے کے، سدا ایک دوسرے کو یاد رکھنے کے......! جانے یہ آخری ملاقاتیں ہمیں اتنا جھوٹ بولنے پر کیوں مجبور کر دیتی ہیں، جب کہ رُکنے والے اور جانے والے دونوں ہی جانتے ہیں کہ یہ اُن کی آخری ملاقات ہے۔

صبح منہ اندھیرے میں وہاں سے چل پڑا۔ بڑی سڑک پر آتے ہی مجھے بس مل گئی۔ میں چپ چاپ سر جھکائے آخری سیٹ کے ایک کونے پر جا کر ٹک گیا۔ بس دیہاتیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ گھنٹہ بھر ہچکولے کھانے کے بعد اچانک ہی گاڑی رُک گئی۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا، آگے پولیس کا ناکہ لگا ہوا تھا۔ دو پولیس والے اوپر چڑھ آئے۔ اُن کی باتوں سے لگتا تھا، جیسے وہ کسی خاص شخص کی تلاش میں ہیں۔ اتنے میں ان میں سے ایک کی مجھ پر نظر پڑی۔ وہ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا اور پھر زور سے چلایا۔ ''یہ تو یہاں بیٹھا ہوا ہے۔''

(جاری ہے)



......ہاشم ندیم......

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ’’خدا اور محبت‘‘ اور ’’بچپن کا دسمبر‘‘ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ’’عبداللہ‘‘ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کار کردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ’’عبداللہ‘‘ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

’’پری زاد‘‘ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بد صورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہر گز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ’’سنڈے میگزین‘‘ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:
sundaymagazine@janggroup.com.pk

پولیس والے کے اس طرح چلّانے پر بس میں بیٹھے سارے دیہاتیوں نے گھبرا کر یوں پلٹ کر میری طرف دیکھا، جیسے بس میں کوئی جنگلی بھینسا گھس آیا ہو۔ کچھ ہی دیر میں میرے اردگرد کئی سپاہی بندوقیں تانے کھڑے تھے، مجھے بس سے اتار کر سڑک کنارے کھڑا کردیا گیا، مگر میں نے ایک بات محسوس کی کہ پولیس والے میرے قریب آنے سے کترا رہے تھے اور میری ہر جنبش پر ان کی مسلسل اور کڑی نظریں جمی تھیں۔ پھر انہوں نے مجھے انتہائی سختی سے ہاتھ فضا میں بلند کرکے کھڑے رہنے کا حکم دے دیا۔ کچھ دیر میں ان کا ایک افسر سرکاری جیپ میں وہاں نمودار ہوا، اور اس نے بس کے ڈرائیور اور مسافروں کے نام، پتے نوٹ کرنے کے بعد بس کو جانے کی اجازت دے دی، اس کے کاندھوں پر سجے پھول بتا رہے تھے کہ وہ انسپکٹر ہے۔ اس کے ماتحتوں نے اسے زوردار سلامی دی اور کچھ کھسر پھسر کی۔ انسپکٹر نے پہلے سر سے پاؤں تک مجھے کئی بار غور سے دیکھا، پھر اپنے ماتحتوں سے پوچھا۔ ’’اس کی تلاشی لی ہے......؟‘‘ ’’نہیں صاب جی...... ہم جانچ والے آلے کا انتظار کر رہے تھے۔‘‘ انسپکٹر نے غصّے سے انہیں جھاڑا ’’اوئے...... اس ویرانے میں بارود جانچنے والا آلہ تمہارا ماما لے کر آئے گا۔ ویسے کیا تم لوگوں کو یقین ہے کہ یہ وہی خودکش ہے، جس کی مخبری ہوئی تھی؟‘‘ ’’صاب جی! حلیہ تو بالکل وہی ہے۔ وہی لمبے بال، گھنی لٹوں جیسی بڑی داڑھی، سرخ آنکھیں، ملنگ کا بھیس...... یہ تصویر دیکھیں ذرا‘‘۔ سب انسپکٹر نے جیب سے ایک سادہ کاغذ پر بنا خاکہ نکال کر انسپکٹر کو دکھایا۔ ان کی باتوں سے مجھے اتنا تو پتا چل چکا تھا کہ انسپکٹر علاقے کا تھانے دار ہے، اور وہ کسی خودکش کی تلاش میں یہاں ناکہ لگائے بیٹھے تھے۔ میرے ہاتھ ہوا میں کھڑے کھڑے اکڑنے لگے، تو میں نے تھانے دار کو پہلی بار مخاطب کیا۔ ’’اگر آپ اجازت دیں، تو میں اپنے ہاتھ نیچے کرلوں، میں ایک فقیر ہوں۔ ریاست پور سے آرہا ہوں۔ آپ چاہیں تو تصدیق کروالیں۔ میں کوئی دہشت گرد نہیں۔‘‘ میری آواز سن کر وہ سارے یوں اچھلے، جیسے میں نے واقعی کوئی خودکش دھماکا کردیا ہو۔ تھانے دار میری بات سے زیادہ میرے لہجے اور سکون بھرے انداز سے پریشان ہوگیا تھا۔ اس نے مجھے قمیص اتارنے کو کہا۔ میں نے اپنا پھٹا پرانا چولا اتار کر ایک جانب پھینک دیا۔ کچھ دیر تک وہ سارے دُور کھڑے میرا جائزہ لیتے رہے، پھر تھانے دار کے اشارے پر ایک سپاہی نے مستعدی سے آگے بڑھ کر میری مشکیں کس دیں اور پوری طرح جامہ تلاشی لی، تو تھانے دار سمیت سب نے اطمینان کا سانس لیا اور میرے ہاتھ کھول دیے گئے۔ میرے تھیلے سے انہیں صرف کچھ چنے اور گڑ ہی ملا تھا۔ تھانے دار نے جیپ کے وائرلیس سیٹ پر اپنے کسی سینئر سے بات کی اور مجھے قمیص پہننے کا حکم دیا۔ دُور ویرانے میں سامنے سڑک کے کنارے بنے ایک چھوٹے سے کیبن نما کھوکے والے نے تھانے دار کے لیے ابلتی ہوئی دودھ پتی چائے کی ایک چینک اور چند چھوٹے پُرانے سے شیشے کے گلاس بھجوا دیے اور وہیں درخت تلے کرسی لگا کر تھانے دار کا دفتر بنا دیا گیا۔ ان چھوٹے علاقوں میں صدر اور وزیراعظم سے زیادہ تھانے دار کا کرّوفر ہوتا ہے۔ انسان غلام پیدا ہوا ہے اور سدا غلام ہی رہے گا، کبھی اپنی خواہشوں کا اور کبھی اپنے جیسے انسانوں کا۔ تھانے دار نے ازراہِ کرم مجھے بھی سائے میں اپنے سامنے زمین پر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ ’’جب تک ریاست پور سے تمہاری بات کی تصدیق نہیں ہوجاتی، تم زیرِ حراست رہو گے۔ ویسے تمہارا یہ صاف لہجہ اور بات کرنے کا انداز مجھے شک میں ڈال رہا ہے کہ تم ہمسایہ ملک کے کوئی جاسوس ہو۔ اس علاقے میں کسی کا لہجہ اتنا صاف نہیں اور یہ تمہارے حلیے سے میل بھی نہیں کھاتا...... ٹھیک ٹھیک بتاؤ تم کون ہو......؟‘‘ میرا دل چاہا کہ میں زور زور سے قہقہے لگا کر ہنسوں، کل تک جس حلیے اور بھیس کی وجہ سے یہ دنیا میری راہ میں پلکیں بچھاتی تھی، میری طرف پیٹھ کرکے چلنے کو بھی بے ادبی سمجھتی تھی، آج وہی حلیہ اور جوگی کا بھیس مجھے ایک عادی مجرم ثابت کرنے پر تُلا تھا۔ سکینہ کے حصار سے نکلتے ہی اس کی برکت کے اثرات ختم ہونا شروع ہوگئے تھے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ چالیس میل کا فاصلہ خاص ہجرت کی مسافت کو مکمل کرتا ہے۔ جیسے چالیس دن کا چلّہ تبلیغ یا دوسرے روحانی عوامل کے لیے بہت اہم ہے۔ شاید کچھ شخصیات کا حصار بھی کسی خاص شخص کی ذات پر چالیس کے ہندسے سے مشروط رہتا ہو۔ میں نے بے خیالی میں تھانے دار سے پوچھا ’’یہاں سے ریاست پور کتنی دُور ہے......؟‘‘ تھانے دار نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ’’پینتیس میل، کیوں؟ مگر تم فکر نہ کرو، ہمارا وائرلیس پر رابطہ ہے۔ ابھی گھنٹے بھر میں تمہاری اصلیت سب کے سامنے آجائے گی۔‘‘ تھانے دار نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ مجھے ہتھکڑی لگا کر دوسری آنے والی جیپ میں بٹھا کر تھانے پہنچا دیا جائے۔ ان میں سے کچھ تازہ بھرتی شدہ نوجوان سپاہیوں نے شاید آج تک کوئی دہشت گرد یا خودکش نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے وہ مجھے کسی عجوبے کی طرح برت رہے تھے۔ خودکش.... ہم بھی کیسے بدقسمت معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں کہ ہماری لغت میں جانے کب سے ایسے ہی نئے لفظ شامل ہوتے آرہے ہیں۔ خودکش، دہشت گرد، دراندازی، انتہاپسند، کوئی ایک اچھا نیا لفظ بھی تو نہیں ہمارے مقدر میں۔ ساری دنیا میں انسان اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی راحت کے سامان کے لیے دن رات جُتا رہتا ہے۔ مگر نہ جانے ہم ایک دوسرے سے محبت کرنا کب سیکھیں گے؟ کب ہماری لغت میں دہشت کُش، محبت پسند، سکون اندوز نامی لفظ شامل ہوں گے۔ ہم جینا کب سیکھیں گے؟

مجھے تھانے پہنچا دیا گیا۔ خلافِ معمول تھانے کی عمارت باہر سے بڑی پُرسکون اور خوب صُورت تھی۔ تھانے کے سامنے صاف پانی کی ایک چھوٹی سی نہر بہہ رہی تھی، جو تھانے کی عمارت کے آس پاس پھیلے وسیع و عریض اور سرسبز کھیتوں کو سیراب کرنے کے کام آتی ہوگی۔ تھانے کے پس منظر میں دُور پہاڑوں پر سورج کی دھوپ نے سونا پھیلا رکھا تھا۔ نہر کے اوپر ایک چھوٹا سا اینٹوں کا پُل تھا، جو تھانے کے مرکزی چوبی گیٹ کو باہر کی سڑک سے ملاتا تھا۔ جس کے عقب میں تھانے کی پرانی، مگر انگریز دور کی ایک پُرشکوہ عمارت اِستادہ تھی۔ اسی لمحے میں نے ایک عجیب بات محسوس کی کہ بہ ظاہر پُل اور دیواریں ایک جیسے اجزاء اور ساخت کی بنی اینٹوں سے تعمیر ہوتے ہیں، مگر ’’پُل‘‘ ملاپ کا استعارہ ہوتے ہیں، جب کہ دیواریں جدائی کی علامت بن جاتی ہیں۔ پُل لوگوں کو ملاتے ہیں اور دیواریں جدائیاں ڈال دیتی ہیں۔ تھانے کی اونچی لمبی دیواروں نے بھی میرے اور باقی دنیا کے درمیان جدائی کی فصیل کھڑی کردی اور مجھے ایک حوالاتی کمرے میں بند کردیا گیا، جو تھانے کے صحن میں دھوپ کے رُخ پر بنا ہوا تھا۔ شاید یہ بھی قیدی کو اذیت میں رکھنے کا ایک طریقہ ہو؟ ہم انسان اپنے جیسے انسانوں کو اذیت دینے کے کتنے زیادہ طریقے ایجاد کرلیتے ہیں۔ راحت دینے کے لیے ہمارے پاس تھوڑا سا بھی وقت نہیں بچتا۔ شام ڈھلے تک میں وہیں حوالات میں بیٹھا آتے جاتے سپاہیوں اور دیگر سائلوں کو دیکھتا رہا۔ شام کو عصر کے بعد ایک سپاہی نے کم دودھ،

زیادہ پانی والی پتلی سی چائے کا ایک پیالہ مجھے پکڑا دیا۔ ''جانتے ہو، دہشت گردی کی سزا کیا ہے؟ اگر تم پر الزام ثابت ہو گیا، تو سیدھے سولی چڑھ جاؤ گے۔ کیوں خود کو ہلاکت میں ڈال دیا تم نے؟'' لمحے بھر ہی میں مجھے سکینہ کی پیش گوئی یاد آ گئی، تو گویا میری فنا اس دہشت گردی کے الزام میں سولی چڑھ جانے سے عبارت ہے۔ چلو، یونہی سہی۔ میں نے چشمِ تصور سے دیکھا کہ تھانے دار نے میرے ورثاء کے طور پر ریاست پور سے شکورے اور مہردین کو بلا کر میت ان کے حوالے کر دی ہے، کیوں کہ تھانے دار کو میں پہلے ہی ریاست پور میں اپنی جان پہچان کا اشارہ دے چکا تھا۔ میرے بارے میں مزید تو یہ کچھ جانتے نہیں تھے۔ قدرت اپنے مسودے مکمل اور کسی بھی غلطی یا جھول سے پاک لکھتی ہے۔ میں نے اطمینان سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگالی۔ قضا نے میرے گرد اپنا جال مکمل بُن لیا تھا۔ اب تو سکون ہی سکون تھا۔ میں نے آنکھیں موند لیں اور وہ ناز و ادا چھم سے میری بند آنکھوں کے پردے پر آ بیٹھی۔ کاش! میں ایک بار اسے دیکھ پاتا۔ میرا دل کسی نادان بچے کی طرح مچل سا گیا، جیسے ننگے پاؤں...... پھٹے پرانے کپڑوں والے بچے...... اپنی خالی جیبوں کا احساس لیے...... دل کو اچھی لگنے والی...... مہنگی چیزیں...... کسی دکان کے بند شیشوں سے...... پہروں لگ کر تکتے ہیں ناں...... میں بھی تم کو یوں ہی محسن...... اکثر تکتا رہتا ہوں۔

میں بھی اسی خالی جیبوں والے بچے کی طرح اُسے ایک بار تکنے کی آس میں جانے کب دیوار سے ٹیک لگائے سو گیا۔ مجھ جیسوں کے لیے یہ نیند اور خواب کتنی بڑی نعمت ہیں۔ بیداری میں کچھ نہ پانے والے اکثر اپنے خوابوں میں مُرادیں پالیتے ہیں۔ میری منت بھی خواب میں پوری ہو گئی۔ میں اس کی آرٹ گیلری میں اس کے سامنے بیٹھا تھا اور وہ حسبِ معمول اپنے کومل ہاتھوں کی جادوگری سے میرے مجسمے میں جان ڈال رہی تھی۔ مجھے تو وہ خود ہمیشہ کی طرح ایک مجسمہ لگ رہی تھی۔ ہم دونوں خاموش تھے، دنیا کی کسی زبان یا ڈکشنری کا کوئی لفظ بھی تو ایسا نہیں تھا، جو ہم دونوں کے دل کی باتوں کو کسی بولی میں ڈھال کر منتقل کر سکتا ہو۔ ایسی صورت میں صرف نظر ہی نظر کے لیے زبان کا کام دیتی ہے۔ میں نہ جانے کتنی دیر اُس کے ساتھ نظر کی یہ بولی بولتا رہا اور پھر کسی نے مجھے زور سے آواز دے کر اٹھا دیا۔ ''چل بھئی ملنگ بادشاہ...... تھانے دار صاب تجھے بلا رہے ہیں'' میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں، صبح ہو چکی تھی۔ مجھے ہتھکڑیوں سمیت تھانے دار کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں پہلے سے چند دیگر پولیس افسر کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ تھانے دار خود ایک جانب مؤدب سا کھڑا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ بیٹھے ہوئے افسر خصوصی طور پر کہیں اور سے یہاں آئے تھے۔ سب نے مجھے غور سے دیکھا۔ میرے چند خاکے بنائے گئے اور پہلے سے لائے گئے چند خاکوں اور تصویروں سے میرا حلیہ جوڑا گیا، پھر ایک افسر نے جو عُہدے میں ایس پی تھا، مجھ سے پہلی بار براہِ راست بات کی۔ ''ریاست پور سے صرف اتنا پتا چلا کہ تم نے کچھ مہینے وہاں بستی سے باہر درخت تلے گزارے تھے۔ اس سے پہلے تم کہاں تھے؟'' میں دھیرے سے مُسکرایا۔ ''فقیر کا کوئی ایک ٹھکانہ کب ہوتا ہے صاب۔ اس سے پہلے شکر گڑھ کے ریلوے پلیٹ فارم پر ڈیرہ تھا اور اس سے پہلے کہیں اور ویرانہ ٹھکانہ تھا...... اب آپ کی یہ حوالات ہے۔'' ایس پی نے اُلجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''مگر تمہارا یہ لب و لہجہ، یہ اعتماد، تمہارے حلیے کو غلط ثابت کرتا ہے۔ ہمیں اُلجھا رہا ہے تمہارا یہ اعتماد، میں جانتا ہوں، جن جگہوں کا تم نے ابھی نام لیا، تم نے ضرور وہاں وقت گزارا ہو گا، مگر آخر تم ہو کون؟ تمہارا شناختی کارڈ بھی تو نہیں ہے، جس سے تمہاری پیدائش وغیرہ کا ریکارڈ دیکھا جا سکے۔'' میں نے کمرے میں بیٹھے باقی سب لوگوں پر ایک گہری نظر ڈالی۔ ''حیرت کی بات ہے، کوئی اگر آپ جیسی کوتوالی کے سامنے بات کرتے ہوئے لڑکھڑا جائے، اس کی آواز کانپے، تب بھی آپ لوگ اس پر جھوٹا ہونے کی تہمت لگا دیتے ہیں، اور اگر کوئی بنا گھبرائے اپنا مدعا بیان کر دے، تب بھی آپ لوگوں کو اس کا یہ اعتماد مشکوک لگتا ہے۔ آپ میری باتوں پر یقین نہ کریں۔ اپنی تفتیش پوری کریں۔ مجھے کوئی جلدی نہیں۔ میرے لیے اب سلاخوں کے پیچھے یا اس زندان سے باہر ہونا ایک جیسا ہے۔ میں دونوں طرف ہی قید رہتا ہوں۔ آپ اطمینان سے اپنی تسلی کریں......'' میں خاموش ہوا تو ان سب کے تنے ہوئے چہروں پر مزید کئی شکنیں پڑ چکی تھیں۔ ایس پی نے میرے سامنے ایک تصویر رکھی، جو میرے موجودہ حلیے سے کافی حد تک مشابہ تھی۔ ''ہمیں اس شخص کی تلاش ہے۔ یہ دشمن ملک کا جاسوس ہے۔ ہمارے ملک میں دہشت گردی کے بہت سے منصوبوں پر عمل کر چکا ہے اور ابھی تک معصوم لوگوں کی جان کے درپے ہے۔ تمہارا حلیہ اور تمہاری ادھوری کہانی ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر رہی ہے کہ تم ہی دہشت گرد ہو۔ جس کے نہ جانے کتنے نام اور بہروپ ہیں۔ یہ بھی تمہاری طرح بہت سے علاقوں میں جوگی، فقیر یا ملنگ کے حلیے میں گھومتا رہتا ہے اور موقع پاتے ہی اپنا کام کر جاتا ہے۔ سیکڑوں معصوموں کو دھماکوں میں موت کے گھاٹ اتار چکا ہے یہ اب تک...... لہٰذا تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ اپنی پوری شناخت واضح کر دو، ورنہ ساری عُمر انہی سلاخوں کے پیچھے پڑے سڑتے رہو گے۔'' اس کا لہجہ اور ان سب کے تیور صاف بتا رہے تھے کہ وہ کسی بھی حال میں میری شناخت جانے بِنا وہاں سے مجھے جانے نہیں دیں گے، مگر میں انہیں کیا بتاتا۔ میں جس شناخت سے ساری عُمر بھاگتا رہا تھا، وہ ایک بار پھر میرا مذاق اُڑانے کے لیے میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے پولیس والوں کو پھر وہی جواب دیا کہ میری شناخت ایک بھکاری کے علاوہ اور کچھ نہیں، مگر وہ بھلا کب ماننے والے تھے۔ مجھے دوبارہ حوالات میں بند کر دیا گیا اور اگلے روز مجھے ضلعے کی بڑی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ میری تصویریں کھینچ کر اخبار اور اشتہار کے ذریعے علاقے میں منادی کروادی گئی کہ علاقہ پولیس نے ایک مشکوک کو دہشت گردی کے شبے میں پکڑا ہے۔ کسی کو اس کے بارے میں اطلاع ہو تو آکر پولیس سے ملے۔

اگلی صبح سب سے پہلے مجھے شکورے اور مہردین کی آوازیں سنائی دیں۔ پولیس والے انہیں دو جاہل بوڑھے دیہاتی سمجھ کر دھتکار رہے تھے، جب کہ وہ دُہائیاں دے رہے تھے کہ پکڑا جانے والا کوئی دہشت گرد نہیں، ان کا جوگی سائیں ہے، مگر وہاں کوئی ان کی سُننے والا نہیں تھا۔ پولیس والوں نے صبح ہی میری انگلیوں کے نشانات لے کر جانچ کے لیے بڑے شہر بھجوا دیئے تھے۔ شکورے اور مہردین کو تھوڑی دیر کے لیے مجھ سے ملاقات کی اجازت ملی تو وہ دونوں رو پڑے۔ ''سائیں جی! تم ان کو بتا کیوں نہیں دیتے کہ تم وہ نہیں ہو، جو یہ سمجھ رہے ہیں۔'' میں دھیرے سے مسکرا دیا۔ ''شاید میں وہ نہیں ہوں، جو تم دونوں مجھے سمجھ رہے ہو اور پھر تم دونوں نے ہی تو کہا تھا کہ سکینہ کا دیکھا ہوا ہر خواب سچ ہوتا ہے، تو شاید اس کے خواب کی تعبیر کا وقت آ گیا ہے۔'' وہ دونوں میرے ہتھکڑیوں میں جکڑے ہاتھ پکڑ کر روتے رہے اور ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ شکورے نے جاتے جاتے مجھے بتایا کہ جس دن سے سکینہ نے وہ خواب دیکھا ہے، تب ہی سے وہ دعا کے لیے ہاتھ جوڑے بیٹھی ہے اور اپنے رب سے ہر گھڑی رو رو کر صرف یہی دعا مانگ رہی ہے کہ سائیں کو کچھ نہ ہو، سائیں جی کو ان سب کی عُمر لگ جائے، مگر سائیں کی آنے والی قضا ٹل جائے...... اور پھر اگلی صبح چائے پہنچانے والے سنتری نے آکر زوردار انداز میں سلاخیں کھڑکائیں۔ ''اٹھ جاؤ ملنگ بادشاہ...... تمہاری رہائی کا پروانہ آ گیا ہے۔'' میں حیران سا حوالات سے باہر نکلا تو تھانے دار نے مجھے اپنے کمرے میں بلوالیا۔ اس بار اس کا لہجہ بہت نرم اور معذرت خواہانہ تھا۔ ''معاف کرنا فقیرو...... ہم بھی انسان ہیں، ڈیوٹی کرتے وقت اونچ نیچ ہو جاتی ہے۔ ہمارا کام ہی ایسا ہے۔ شک کے اوپر ہمارے یقین کا قلعہ کھڑا رہتا ہے۔ اس کے بغیر ہمارا کام ہی نہیں چلتا۔'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ اتنی وضاحت کیوں پیش کر رہے ہیں۔ میں نے تو ہلکی سی شکایت بھی نہیں کی۔'' تھانے دار نے چائے والے لڑکے کو چائے، ناشتا میز پر سجانے کا اشارہ کیا۔ ''تم نے کوئی شکایت یا گلہ نہیں کیا۔ اس بات نے مجھے مزید شرمندہ کر رکھا ہے۔ ہم جس دہشت گرد کی تلاش میں تھے، اُسے کل رات سرحد کے قریب سے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ تمہارے فنگر پرنٹس کی رپورٹ بھی کلیئر آئی ہے۔ اب تم آزاد ہو۔ جہاں جانا چاہو، جا سکتے ہو۔ مگر پہلے ناشتا کر لو۔'' میرا دل اس وقت کچھ بھی کھانے پینے کا نہیں تھا، مگر

تھانے دار کا دل رکھنے کے لیے میں نے چائے کے چند گھونٹ حلق سے اتارے اور جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ تھانے دار میرے ساتھ برآمدے تک آیا۔ ’’کہاں جاؤ گے؟‘‘ ’’کوئی منزل نہیں ہے میری، جہاں قدم اٹھیں گے، اُسی طرف نکل جاؤں گا۔ آپ کی ہمدردی کا بہت شکریہ۔‘‘ تھانے دار مجھ سے مزید کچھ پوچھنا چاہتا تھا، مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔ ’’شاید تمھیں اپنے متعلق بات کرنا کچھ زیادہ پسند نہیں، چلو جیسے تمہاری مرضی، اکرم خان نام ہے میرا۔ کبھی کسی مدد کی ضرورت ہو تو یاد رکھنا۔ اور ہاں، کل جو دیہاتی تمہارے حق میں گواہی دینے کے لیے آئے تھے، اگر وہ دوبارہ آئیں تو انہیں کیا بتاؤں؟‘‘ میں نے پلٹ کر تھانے دار کی طرف دیکھا۔ ’’اُن سے کہیے گا یہاں فنا ہونا، میرے نصیب میں نہیں تھا، جہاں لکھی ہو گی، وہاں خود پہنچ جاؤں گا۔ میری تلاش میں بھٹکنے کی کوشش نہ کریں‘‘۔

میں اکرم خان کو وہیں ہکا بکا چھوڑ کر تھانے کی چار دیواری سے باہر نکل آیا۔ پھر وہی ٹیلے اور وہی دیوار۔ میں قصبے کی طرف جاتی پگڈنڈی کی مخالف سمت میں چل پڑا۔ راستے میں بادلوں نے مجھے تنہا چلتے دیکھ کر آپس میں سرگوشیاں کیں اور پھر سارے بادل زور سے گڑگڑا کر ہنس پڑے۔ شریر بوندیں ایک بے گھر بنجارے کے ساتھ آنکھ مچولی کا کھیل کھیلنے، بادلوں کی گود سے ایک ایک کر کے زمین کی طرف لپکنے لگیں۔ بادلوں نے بنجارے کو بھیگتے دیکھ کر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور اپنی جھولی میں بند ساری شرارتی بوندیں اس پر برسا دیں، اور پھر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ویرانے میں برستی بارش کی بوندوں کی بولی کوئی سُنے تو اسے بارش کی تنہائی پر بھی پیار آ جائے۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ مجھ سے اٹھکیلیاں اور ضد کر رہی تھیں کہ میں بھی دوسروں کی طرح ان کے شور سے گھبرا کر کسی درخت یا اوٹ کی پناہ تلاش لوں، مگر میں نہیں رُکا۔ بھیگتا رہا، اور بہت دُور تک یونہی چلتا رہا، وہ بہت دیر تک مجھے یاد آتی رہی اور اس اجنبی ویرانے کے اجنبی رستے میری تنہائی پر مُسکراتے رہے۔ یہ شاعر بھی کیسے کیسے خیال جوڑ لاتے ہیں اپنی تخیّل کی کرشماتی دنیا سے، زندگی کے ہر قدم پر ہمیں ان کے بول کسی نہ کسی طور اپنے حال سے جُڑے محسوس ہوتے ہیں۔ گھنٹہ بھر بھیگنے کے بعد مجھے سردی لگنے لگی تھی۔ مگر نہ جانے میں کہاں تھا۔ یہ کون سی جگہ تھی۔ شام ڈھلنے والی تھی، کچھ دیر بعد کسی بیل گاڑی والے نے میرے قریب سے گزرتے ہوئے آواز لگائی۔ ’’کہاں جا رہے ہو صوفیو! میں پہنچا دوں؟‘‘ میں نے اس دیہاتی سے پوچھا۔ ’’یہ رستہ کہاں جاتا ہے؟‘‘ وہ کوئی پرانا لطیفہ یاد کر کے زور سے ہنسا۔ ’’راستہ تو کہیں نہیں جاتا...... یہیں پڑا رہتا ہے دن بھر فقیرو...... بس میں ہی آتا جاتا رہتا ہوں۔‘‘ مجھے اس کی زندہ دلی اچھی لگی۔ اس دور میں بھی اگر کوئی اپنے مَن کی الجھنیں بھلا کر لبوں پر ایک ہلکی سی مسکان برقرار رکھ سکتا ہے، تو یقیناً وہ ’’دل والا‘‘ ہے۔ بیل گاڑی نے مجھے پکی سڑک تک پہنچا دیا، جہاں سے اِکاّ دُکاّ سواریاں گزر رہی تھیں، مگر میری حالت سردی لگنے کی وجہ سے بگڑتی جا رہی تھی، رات ڈھلنے سے پہلے مجھے بخار ہو چکا تھا۔ کسی بس والے نے ترس کھا کر مجھے بٹھا لیا اور بنا پوچھے ہی ایک ویران سے ریلوے اسٹیشن پر اتار دیا۔ شاید وہی بس کا آخری اسٹاپ تھا۔ ساتھ ہی اس نے اسٹیشن کے ایک چپڑاسی کو میرا خیال رکھنے کا بھی کہہ دیا۔ بخار نے میرے حواس اس بری طرح متاثر کیے تھے کہ میں خود کوئی فیصلہ لینے کے قابل ہی نہیں رہا تھا، ریلوے اہل کار نے میری حالت دیکھی، تو مجھے کسی بڑے شہر جانے والی ریل گاڑی پر سوار کروا دیا اور ٹی ٹی سے درخواست کی کہ مجھے شہر پہنچتے ہی کسی قلی یا مزدور سے کہلوا کر شہر کے بڑے اسپتال پہنچا دے۔ دو دن کا طویل سفر میرے ہوش اور بے ہوشی کے وقفوں میں یوں گزرا کہ مجھے کچھ پتا نہیں چلا۔ گاڑی رُکی تو میں بھی ٹی ٹی کو بنا بتائے لڑکھڑاتا ہوا پلیٹ فارم پر اتر آیا۔ میں مزید ان لوگوں پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا۔ تھکن کے مارے میرا بُرا حال تھا اور غنودگی کے غلبے نے مجھے ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ جب آنے اور جانے والے مسافروں کی بھیڑ چَھٹی تو میری نظر پلیٹ فارم کے گھڑیال کے ساتھ لگے جلتے بُجھتے برقی بورڈ پر پڑی، جس کے اوپر شہر کا نام لکھا ہوا تھا۔ میرے اندر ایک دم شدید اور کان پھاڑ دینے والا شور سا اُٹھا، جیسے میری روح کے سارے تار ایک ہی جھٹکے میں کسی نے جھنجھنا کر رکھ دیے ہوں۔ یہ تو میرا اپنا شہر تھا۔ ہاں، وہی شہر، جہاں میں پیدا ہوا تھا، وہی شہر جہاں وہ کوچہ جاناں تھا، جہاں وہ رہتی تھی۔ میں نے گھبرا کر اٹھنے اور پلیٹ فارم سے نکلتی ایک گاڑی میں بیٹھنے کی کوشش کی، مگر لڑکھڑا کر وہیں گر گیا۔ کسی قلی نے آخری وقت پر مجھے سنبھال لیا، ورنہ شاید میں ٹرین کے نیچے آ کر کٹ جاتا۔ میرے اردگرد لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہونے لگا۔ تماشا کہیں بھی ہو، تماش بین مل ہی جاتے ہیں۔ ویسے بھی ہمیں تماشا دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ وہ سب مجھے بُری طرح جھاڑ پلا رہے تھے اور اس حماقت پر ڈانٹ رہے تھے، کچھ نے مجھے خودکشی کے ارادے کے جُرم میں پولیس کے حوالے کر دینے کا مشورہ بھی دیا۔ خودکشی بھی کتنا عجیب جرم ہے، جُرم کا ارادہ ہو یا اگر جُرم نامکمل رہ جائے تو اس کے لیے کڑی سزا ہے، مگر یہی جُرم اگر مکمل ہو جائے تو دنیا کا ہر قانون اس کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے، اتنے میں کسی شناسا کی آواز ہجوم میں اُبھری۔ ’’ہٹو دور یہاں سے، جاؤ اپنا کام کرو تم سب لوگ......‘‘ میں نے گھبرا کر نظر اٹھائی تو میرا دل زور سے دھڑکا۔ آخر وہی ہوا، جس کا مجھے ڈر تھا۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حسّاس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اِک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آرا سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین'' روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

کبھی کبھی ہمارے خدشات حقیقت کا روپ دھارنے میں کس قدر عجلت سے کام لیتے ہیں، ہماری سوچ کی پرواز سے بھی تیز، جلد باز اندیشے، مجھے یہی خدشہ تھا کہ یہاں مجھے اپنا کوئی پُرانا جاننے والا نہ مل جائے، اور ٹھیک اُسی وقت بھیڑ کو دھکیل کر اندر آنے والے نے میرا اندیشہ سچ کر دکھایا۔ آنے والا خانو تھا، کچھ دیر کے لیے تو وہ مجھے دیکھ کر گم صم ہی رہ گیا۔ خود میں بھی اسے یہاں اپنے شہر کے پلیٹ فارم پر دیکھ کر حیرت زدہ تھا۔ خانو دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا اور رونے لگا ''کیوں ظلم کرتے ہو ہم غریبوں پر سائیں، کیوں بار بار مجھے اکیلا چھوڑ جاتے ہو؟'' میں نے بڑی مشکل سے اسے خود سے علیحدہ کیا۔ ''مگر تم یہاں کیا کر رہے ہو......؟'' آس پاس کھڑے لوگ حیرت سے ہم دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ خانو نے حسبِ عادت کسی حوالدار کی طرح سب کو ڈانٹا ''جاؤ یہاں سے بابا...... کیا مصطفیٰ قریشی کی کوئی فلم چل رہی ہے، جو تم سارے یوں منہ کھول کر کھڑے دیکھ رہے ہو۔ جاؤ، کام کرو اپنا، شُکر کرو سائیں جی اِدھر آ گیا ہے، اب دیکھنا کیسے تم سب کی قسمت بدلتی ہے۔ چلو، اب بھاگو سارے یہاں سے۔'' دھیرے دھیرے بھیڑ چَھٹنے لگی۔ خانو نے مجھے بتایا کہ اس کے حالات ذرا بہتر ہوئے تو بیوی نے ضد کی کہ اب انہیں بچوں کی تعلیم کے لیے یہ چھوٹا قصبہ چھوڑ کر کسی بڑے شہر منتقل ہو جانا چاہیے، لہٰذا خانو نے کچھ عرصہ قبل کسی سے سفارش کروا کر یہاں کے ریلوے اسٹیشن پر اپنا چھوٹا سا کیبن بنالیا اور اب وہ اپنی بیوی بچوں سمیت اسی شہر میں منتقل ہو چکا تھا۔ جانے میری قسمت کے خالی کشکول میں مقدر بار بار وہی پرانے سکّے کیوں ڈال دیتا تھا۔ مجھے خانو کے خلوص پر کوئی شک نہیں تھا۔ وہ سیدھا سادہ بے لوث انسان میرے لیے اپنی جان سے بھی گزر سکتا تھا، مگر...... وہ میرا نادان دوست تھا۔ اور مجھے شاید کسی دانا دشمن کی تلاش تھی۔ خانو کا کھوکھا یہاں بھی خوب چلتا تھا اور اس نے اپنی عادت کے مطابق یہاں بھی سب پر اپنا خواہ مخواہ کا رعب جما رکھا تھا۔ خانو نے تھوڑی دیر ہی میں پلیٹ فارم کے شیڈ سے پرے کھلے آسمان تلے ایک بوڑھے برگد کے درخت کے نیچے میرا بسیرا بنا دیا۔ فقیر کا ٹھکانہ بھی بھلا کیا ٹھکانہ ہوتا ہے۔ ایک پھٹا پرانا چھپر، جو نہ دھوپ روک سکتا ہے نہ بارش۔ درخت کے نیچے یہاں بھی پکّی اینٹ اور سیمنٹ سے بنے ایک گول چبوترے نے برگد کی جڑوں کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا، بالکل میرے غموں کی طرح، جو ہر لمحہ میرے گرد اپنا گھیرا ڈالے رکھتے تھے۔ رات کو گھر جانے سے پہلے خانو کچھ دیر میرے پاس رُکا اور میری خستہ حالی دیکھ کر گھبرا گیا ''تمہیں تو شاید شدید بخار لگتا ہے جوگی سائیں۔'' ''نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ بس تھکن ہے بہت لمبے سفر کی، تم جاؤ بیوی بچے تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے، مجھے ابھی جاگنا ہے، اس شہر کا آسمان اور یہ تارے میرے پرانے دوست ہیں۔ بہت سی باتیں کرنی ہیں، ان سے مجھے آج رات......'' نہ چاہتے ہوئے بھی خانو مجبوراً وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ مگر اس کے جاتے ہی جانے کیوں مجھے یہ احساس ستانے لگا کہ میں اسے کچھ دیر مزید روک لیتا تو اچھا تھا۔ میرے لیے یہ احساس ہی بڑا جان لیوا تھا کہ میں اپنے ہی شہر میں تنہا ہوں۔ ریت، اینٹوں اور سیمنٹ کی بنی چند عمارتوں اور سڑکوں سے پرے شاید وہ بھی اسی تاروں بھرے آسمان تلے جاگ رہی ہو گی، شاید اپنی آرٹ گیلری میں کوئی مجسمہ تراش رہی ہو گی یا پھر شاید اپنی چھت پر اپنی پسندیدہ زرد پھولوں والی نیوی بلیو شال پہنے ہاتھ میں کافی کا مگ تھامے میری طرح ستاروں سے باتیں کر رہی ہو۔ یہ آسمان بھی تو اس کی شال کی طرح تھا۔ میری آنکھیں بھیگنے لگیں، تو مجھے اپنی تنہائی کا شدت سے احساس ہوا، کبھی کبھی زندگی میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں، جب ہم خود اپنا سامنا کرنے سے بھی کتراتے ہیں۔ میں بھی ساری رات خود سے بھاگتا رہا۔

صبح تک میں مزید نڈھال ہو چکا تھا اور جب دن کی روایتی بھیڑ اور چہل پہل کا دور شروع ہوا، تو حسبِ معمول سب سے پہلے ضعیف العقیدہ لوگ ہی میرے آس پاس جمع ہونے لگے۔ شاید اس میں میری پرانی شہرت کا بھی ضرور کچھ حصّہ رہا ہو گا، کیوں کہ ریلوے کے جن اہل کاروں کی ٹرین ڈیوٹی کا رُوٹ شکر گڑھ رہا تھا، وہ مجھے پہلے سے جانتے تھے اور انہوں نے میری نام نہاد ''کرامات'' کے بہت قصّے سُن رکھے تھے۔ اسٹیشن ماسٹر نے آتے جاتے لوگوں کو یوں ٹھٹھک کر درخت کے قریب جمع ہوتے دیکھا۔ تو وہ بھی اپنے دفتر سے باہر نکل آیا اور جھڑک کر پوچھنے لگا ''یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے، کون ہے یہ مجذوب؟'' اسٹیشن ماسٹر کی آواز سن کر ریلوے کے چھوٹے موٹے اہل کار اِدھر اُدھر بدک گئے۔ اسٹیشن ماسٹر نے مجھے غور سے دیکھا ''کون ہو تم...... اور کیا تم جانتے نہیں کہ ریلوے کی سرکاری زمین پر کوئی بھی مستقل یا عارضی بسیرا ڈالنا ممنوع ہے۔'' میں بہ مشکل اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا ''بسیرے بھی بھلا کبھی ممنوع اور غیر ممنوع ہوتے ہیں جناب؟ شاید مکین ممنوعہ یا غیر ممنوعہ ہوتے ہیں۔'' میں نے جانے کے لیے قدم بڑھائے، مگر بخار کی تھکن اور نقاہت کی وجہ سے ایک زوردار چکّر آیا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اسٹیشن ماسٹر نے جلدی سے آگے بڑھ کر مجھے تھامنے کی کوشش کی ''ارے ارے...... سنبھل کے بھئی، تمہاری طبیعت تو بہت ناساز لگتی ہے۔'' اسٹیشن ماسٹر کی آواز پر قلی دوڑے چلے آئے اور انہوں نے بھی مجھے سہارا دے کر دوبارہ میرے مسکن پر بٹھا دیا، میں نے اسٹیشن ماسٹر کو تسلّی دی ''نہیں، میں ٹھیک ہوں، میں خود بھی یہاں سے جانا چاہ رہا تھا۔ آپ فکر نہ کریں۔ زیادہ دیر نہیں رکوں گا یہاں پر۔'' اسٹیشن ماسٹر کے چہرے پر ندامت کے آثار تھے۔ ''نہیں نہیں، ایسی کوئی جلدی بھی نہیں ہے۔ تم تو جانتے ہو، کچھ لوگ اسی طرح چھپر ڈالتے ہیں اور پھر دھیرے دھیرے سرکاری زمین پر پہلے پکّا جھونپڑا اور پھر چار دیواری کھڑی کر کے قبضہ کر لیتے ہیں۔ بطور اسٹیشن ماسٹر میرا فرض ہے کہ میں پلیٹ فارم اور اسٹیشن کی حدود میں کسی بھی ناجائز تجاوز کو روکوں، مگر تم اس وقت اس قابل نہیں ہو کہ اپنے بل بوتے پر ایک قدم بھی چل سکو۔ کچھ دن آرام کر لو، طبیعت سنبھل جائے تو چلے جانا۔'' میں نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔ ''آپ کی مہربانی کا بہت شکریہ۔ مگر یہ شہر مجھے کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ آپ ایک احسان اور کر دیں مجھ پر، یہاں سے کہیں بہت دُور دراز جانے والی کسی گاڑی پر سوار کروا دیں مجھے......'' اتنے میں اسٹیشن ماسٹر کے دفتر کا ایک ماتحت وہاں آ پہنچا۔ سپرنٹنڈنٹ آفس سے فون ہے آپ کا صاحب۔'' اسٹیشن ماسٹر نے سر ہلایا اور جانے سے پہلے ایک لمحے کے لیے میرے پاس رُکا ''اعجاز نام ہے میرا، فی الحال تم آرام کرو۔ میں ذرا دفتر کے معاملات نمٹا لوں، تمہارے جانے کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ ذرا صبر سے کام لو۔'' اسٹیشن ماسٹر پلٹ گیا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ مجھے زندگی میں کڑواہٹ کی اس قدر عادت ہو چکی ہے کہ اب میٹھے کی عادت ہی نہیں رہی، پھر چاہے وہ صبر کا پھل ہی کیوں نہ ہو۔

کچھ دیر بعد ایک ریلوے اہل کار بخار کے شربت کی بوتل اور چند گولیاں مجھے تھما گیا۔ ''یہ دوائیاں اسٹیشن ماسٹر صاحب نے بھیجی ہیں۔ جلدی سے یہ گولیاں اور شربت غٹک جاؤ۔ ہمارے اعجاز صاحب نے ڈسپنسر کورس بھی کر رکھا ہے۔ یہاں سب کی چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج وہ خود ہی کرتے ہیں۔ شام کو ان کی بیٹھک میں خوب ہجوم رہتا ہے۔'' وہ باتونی نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا اور تب تک وہاں سے نہیں ہلا، جب تک میں نے دوا کی خوراک لے نہیں لی، کچھ لوگ اپنے لفظ اتنے بے دریغ کیوں لٹاتے رہتے ہیں۔ جانے مجھے ہمیشہ سے ایسا کیوں لگتا تھا کہ لفظ ادا ہونے کے بعد ہمیں خالی کر جاتے ہیں۔ کچھ دیر میں خانو آ گیا اور اپنا کیبن کھولنے کے بجائے سیدھا میری طرف چلا آیا۔ ''سائیں جی، وہ کالو ٹھیلے والا بتا رہا تھا کہ اپنے اسٹیشن ماسٹر صاحب آئے تھے تمہاری طرف، سب خیر تو ہے ناں!!'' ''ہاں، سب خیر ہے، وہ اپنا فرض پورا کرنے آئے تھے۔ اچھے انسان ہیں۔'' خانو کے چہرے پر چھائی فکرمندی کی لکیریں چھٹ گئیں۔ اور وہ وہیں کھڑے کھڑے اعجاز صاحب کی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملانے لگا کہ دیکھنے میں تو اسٹیشن ماسٹر صاحب بہت سخت نظر آتے ہیں، مگر دل کے بہت اچھے ہیں، سب ملازمین کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ، جانے یہ اوپر سے سخت نظر آنے والے اکثر اندر سے اتنے نرم اور نیک دل کیوں ہوتے ہیں۔ شاید یہ ساری دنیا ہی ایسے تضادات کا مجموعہ ہے۔ میں دن بھر وہیں منہ ڈھانپے پڑا رہا۔ نقاہت اور بیماری بھی کتنی بڑی معذوری ہوتی ہے۔ یا تو ہمارے دل اور دماغ کو اتنی قوتِ پرواز نہیں دی گئی ہوتی یا پھر ہمیں اس کم زور جسم اور قوتِ ارادی کے تابع نہ کیا گیا ہوتا کہ ہم اپنے ارادوں کی تکمیل کی خواہش میں بس پھڑک کر ہی رہ جائیں۔ میں بھی سارا دن اسٹیشن چھوڑ کر کہیں دُور نکل جانے کے اپنے کم زور ارادے سے لڑتا رہا، مگر میرے لاغر جسم نے میرا ساتھ نہ دیا۔

شام کو اعجاز صاحب نے بھی دوسرا پھیرا ڈالا اور حال چال پوچھ کر جاتے جاتے جانے کیا سوچ کر دوبارہ میری طرف پلٹ آئے۔ ''بات چیت سے تو تم کافی پڑھے لکھے لگتے ہو، پھر یہ جوگ کیوں لے رکھا ہے۔ بھئی معاف کرنا میں اس پیری فقیری پر اعتبار نہیں کرتا۔ آج کل کے اس منافق دور میں اصل پیر فقیر بھلا کہاں پائے جاتے ہیں؟'' اعجاز صاحب کے لہجے میں تلخی گھلی ہوئی تھی۔ میں نے تائید کی۔ ''ٹھیک کہتے ہیں آپ، کاش! یہ چھوٹی سی بات اس ظاہر پرست دنیا کو بھی سمجھ آجائے کہ صرف حلیہ، درویشی کی ضمانت نہیں ہوتا۔ دیوانے اور مجذوب میں بڑا فرق ہوتا ہے۔'' اعجاز صاحب نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''آدمی دل چسپ لگتے ہو۔ موقع ملا تو کبھی تفصیلاً بات ہو گی۔ تم آرام کرلو۔'' اسٹیشن ماسٹر کے جاتے ہی دُور اپنے ٹھیلے پر بے چین کھڑا خانو لپک کر میرے قریب آ گیا، ''کیا کہہ رہے تھے، اسٹیشن ماسٹر صاب! میرے متعلق تو کچھ نہیں کہا۔'' ''ہاں کہہ رہے تھے کہ یہ خانو سارا دن اِدھر کی اُدھر لگاتا رہتا ہے، دل لگا کر کام نہیں کرتا، وقت ضائع کرتا ہے۔ سوچ رہے ہیں کہ تمہارے ٹھیکے کا لائسنس منسوخ کر دیں۔'' میری بات سن کر خانو کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ ''کیا بول رہے ہو جوگی سائیں، میں تو سارا دن محنت کرتا ہوں۔'' ''تم محنت کم، باتیں زیادہ کرتے ہو۔ آج سے کوشش کرو کہ انہیں دوبارہ تم سے شکایت نہ ہو۔'' خانو نے جلدی سے سر ہلایا اور کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے جلدی سے اپنے ٹھیلے کی جانب بڑھ گیا اور میں نے سکون سے سر ٹکا لیا۔ میں جانتا تھا کہ اب رات گئے تک کام میں جُتا رہے گا، میرا وہ نادان دوست۔

شام ڈھلی تو میرے دل کے اندھیرے بڑھ گئے اور اسٹیشن روشنیوں سے جگمگانے لگا، مگر جو میرے تاریک دل کو اُجال سکتا، وہ اُجالا کہاں تھا میری قسمت میں۔ خانو بے چارہ دن بھر کام میں جُتا رہا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ یہاں سے جاتے ہوئے اسے بتا کر جاؤں گا کہ میں نے اس کی ناز برداری اور خدمت گزاری سے بچنے کے لیے یہ جھوٹ بولا تھا۔ میں وہ پتھر تھا، جس سے ٹکرانے والا بچارا بدلے میں صرف زخم ہی پا سکتا تھا۔ رات ہوئی تو

اسٹیشن ماسٹر صاحب حسبِ معمول اسٹیشن کا ایک آخری جائزہ لینے کے لیے پلیٹ فارم پر سارے موجود اہل کاروں کو ہدایت دیتے نظر آئے، مگر جانے کیوں اس رات مجھے اعجاز صاحب کی چال اور آواز میں وہ بانکپن اور کڑک مفقود محسوس ہوئی، جو ان کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے وہ رک گئے ''تم سوتے نہیں ہو کیا، طبیعت اب کیسی ہے تمہاری؟'' ''ٹھیک ہوں، بس نیند آتے آتے آتی ہے۔'' وہ تھکے ہوئے انداز میں وہیں چبوترے پر میرے قریب بیٹھ گئے ''ہاں ٹھیک کہا تم نے، کبھی کبھی تو نیند بھی نخریلی شہزادی بن جاتی ہے۔'' ''آپ آج کچھ پریشان دکھائی دیتے ہیں۔ سب ٹھیک ہے؟'' انہوں نے ایک گہری سانس لی ''ہاں، اب تو ٹھیک ہی سمجھو، وہ کہتے ہیں ناں، درد کا حد سے گزر جانا ہی دوا ہو جاتا ہے۔ تم یہاں نئے ہو، اس لیے تمہیں نہیں پتا کہ آج کا دن بڑا بھاری گزرتا ہے مجھ پر۔ پُرانے ملازمین سارے واقف ہیں اس کہانی سے۔'' میں نے غور سے اس ٹوٹے ہوئے انسان کی طرف دیکھا۔ ہمارے آس پاس بکھرے ان ہزاروں لاکھوں انسانوں میں سے ہر ایک اپنے اندر کتنا غم چھپائے، کتنا درد دبائے بیٹھا ہے، مگر ہم خود غرضوں کو اپنے سوا دوسرا کوئی نظر ہی کب آتا ہے بھلا؟'' اگر مناسب سمجھیں تو مجھے کچھ بتائیں۔'' اعجاز صاحب نے لمبی گہری سانس لی ''بس بیوی کی بیماری نے پریشان کر رکھا ہے۔ اس بدنصیب نے بھی کم دن ہی خوشی دیکھی۔ اب تو سارا وقت بستر ہی پر پڑی رہتی ہے۔ ہماری ایک ہی اکلوتی بیٹی تھی ثریا...... بچپن ہی سے ہم دونوں کی جان...... لاڈ اور نازوں سے پلی۔ اسکول کالج سے لے کر یونی ورسٹی تک ہر مضمون، ہر مقابلے میں اوّل۔ چندے آفتاب، چندے ماہتاب۔ سچ پوچھو، تو اس کی خوب صورتی سے ہم دونوں میاں بیوی کبھی کبھی خوف زدہ ہو جاتے تھے، اس لیے جلد ہی

اس کے ہاتھ پیلے کر کے رخصت کرنے کے منصوبے بناتے رہتے۔ بہت سے رشتے آئے، مگر مجھے خاص طور پر کسی ایسے رشتے کی تلاش تھی، جہاں ساس نندوں کا جھمیلا بھی کم ہو، اور لڑکا معاشی طور پر بھی کافی مضبوط ہو۔ ہم نے ثریا کو بہت نازوں سے پالا تھا۔ اور ہمیں یہ ڈر تھا کہ وہ روایتی ساس نندوں کی ڈانٹ ڈپٹ اور سختی برداشت نہیں کر سکے گی۔ آخر کار، رشتہ لانے والی نے ایک ایسے لڑکے کے بارے میں بتایا، جو کچھ عرصہ پہلے ہی بیرونِ ملک سے کافی کچھ کما کر دوبارہ اپنے ملک منتقل ہوا تھا۔ اکیلا رہتا تھا اور یہاں رشتے کا بھی خواہش مند تھا۔ مجھے لگا، جیسے قدرت نے یہ رشتہ میرے صبر کے بدلے ہی بھیجا ہے۔ ہم نے ہر طرح سے چھان پھٹک کر لی۔ لڑکا واقعی بہت شریف اور خاندانی تھا۔ اور ثریا کی تصویر دیکھ کر تو اس نے رشتے والی کا در ہی پکڑ لیا تھا کہ اب وہ رشتہ کرے گا تو ہماری ثریا سے، ورنہ

ساری عمر کنوارا ہی رہے گا۔ لڑکے کا نام کلیم تھا، مگر میری بیوی اس رشتے کو قبول کرنے میں ذرا ہچکچا رہی تھی۔‘‘ میں نے حیرت سے اعجاز صاحب کی طرف دیکھا ’’مگر کیوں؟‘‘ اعجاز صاحب نے نظریں جھکالیں ’’دراصل لڑکا کچھ کم صورت تھا، ہماری ثریا کی دودھ جیسی شفاف رنگت کے سامنے کلیم کا گہرا سانولا رنگ اور نین نقوش بہت پیچ محسوس ہوتے تھے۔‘‘ اعجاز صاحب کی بات سُن کر مجھے ایک زور کا جھٹکا لگا ’’ثریا نے کلیم کو دیکھا تھا؟ میرا مطلب ہے اس کا کیا فیصلہ تھا اس بارے میں......‘‘ ’’ثریا کا فیصلہ وہی تھا، جو کسی بھی شریف مشرقی گھرانے کی لڑکی کا ہو سکتا ہے۔ اس نے یہ حق اپنے والدین کو تفویض کر دیا تھا۔ بالآخر ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد قرعہ کلیم کے نام ہی کھلا اور ہماری لاڈلی ہماری دعاؤں اور آنسوؤں کے حصار میں کلیم کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ’’پھر آپ اتنے اُداس کیوں ہیں، انسان کا تو اندر خوب صورت ہونا چاہیے کہ بیرونی بدصورتی کی تو عادت پڑ جاتی ہے۔‘‘ مجھے لگا یہ سوال میں نے اعجاز صاحب سے نہیں، خود اپنے آپ سے کیا ہے۔ اعجاز صاحب نے لمبی گہری آہ بھری۔ ’’ہاں! میری ثریا نے پہلے دن ہی سے ہماری خوشی کے لیے کلیم کو پورے دل سے قبول کر لیا تھا۔ کلیم تو پہلے ہی سے ثریا کے پیار میں دیوانہ تھا، مگر......!!‘‘ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا ’’مگر کیا؟‘‘ ’’مگر یہ دنیا والے بھلا کب کسی کو پھلتا پھولتا اور خوش دیکھ سکتے ہیں۔ کلیم اور ثریا جس محفل میں بھی جاتے اور جہاں سے بھی گزرتے، ان کی جوڑی کو دیکھ کر لوگ معنی خیز اشارے کرتے، طنزیہ مسکراہٹوں کے تبادلے ہوتے، پہلوئے حور میں لنگور، جیسے فقرے کسے جاتے۔ تنگ آ کر کلیم نے ثریا کو کہیں لے جانا ہی چھوڑ دیا، مگر لوگوں کی زبانوں کو کون روک سکتا ہے۔ کلیم اپنی محرومیوں کا غصہ ثریا پر اتارنے لگا۔ اس کے کان میں کسی نے یہ بات ڈال دی تھی کہ ضرور ثریا کے کردار میں کوئی کھوٹ یا کمی ہو گی، ورنہ اس جیسی پری چہرہ لڑکی کلیم جیسے کم صورت کو کیوں قبول کرتی؟ کلیم کا جنون بڑھتا ہی گیا اور ثریا کی خوب صورتی نے اسے نفسیاتی مریض بنا کر رکھ دیا۔ اسے گلی محلے، حتیٰ کہ شہر کا ہر بندہ اپنا مذاق اُڑاتا محسوس ہونے لگا۔ ثریا کی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی۔ مجھ سے اور ثریا کی ماں سے ایک بڑی غلطی ہو گئی تھی۔ رشتہ ہمیشہ جوڑ والوں میں کرنا چاہیے، پھر چاہے یہ جوڑ معاشی حالات کا ہو یا صورت کا۔ بے جوڑ رشتے کبھی زیادہ دیر چل نہیں پاتے۔ کلیم ثریا پر شک کرنے لگا۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ اسے دُھنک کر رکھ دیتا اور پھر ایک دن ثریا اس حالت میں گھر واپس آئی کہ اس کا چہرہ اور بدن نیل نیل تھا۔ اور......اور پھر......‘‘ اعجاز صاحب کی قوتِ گویائی جواب دینے لگی۔ میں نے بے تابی سے پوچھا ’’پھر کیا ہوا؟‘‘ ’’اور پھر ثریا کے آنے کے دو روز بعد کلیم نے اسے طلاق بھجوا دی......‘‘ میری آواز حلق میں اٹک سی گئی ’’طلاق......‘‘ ’’ہاں! طلاق۔ تین سال پہلے ہماری ثریا گھر واپس آ گئی تھی۔ بہت صابر شاکر تھی میری بیٹی، کسی سے کوئی شکوہ نہیں کیا۔ اس کی ماں نفسیاتی دباؤ اور شوگر سمیت کئی بیماریوں کا شکار ہوتی گئی، مگر ثریا سہتی رہی۔ اور پھر ایک دن چپ چاپ آنکھیں موند کر ہمیشہ کے لیے ہمیں چھوڑ گئی۔‘‘ مجھے یوں لگا، جیسے اعجاز صاحب نے کوئی کند چھری ٹھیک میرے قلب میں اتار دی ہو۔ ’’کیا...... ثریا مر گئی؟‘‘ ’’ہاں، آج اس کی تیسری برسی ہے۔‘‘ مجھ سے مزید کچھ نہیں کہا گیا۔ اعجاز صاحب اٹھ کر چلے گئے۔

مجھے لگا، وہ میری اپنی کہانی سنا کر پلٹ گئے تھے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ دنیا میں بس ایک میں ہی ان عذابوں کا شکار ہوں، مگر یہاں تو ہر قدم پر ایک ’’پری زاد‘‘ کسی نئے روپ اور نئے نام کے ساتھ دھرنا دیے بیٹھے ملتا ہے۔ اعجاز صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ جوڑے ہمیشہ جوڑ والوں کے بھلے لگتے ہیں۔ اچھا ہوا، میں عینی کی زندگی سے چپ چاپ نکل آیا۔ ہم دونوں بھی تو اسی ظالم دنیا کے باسی تھے، عینی مجھے قبول کر بھی لیتی تو یہ جگ والے ہمیں جینے نہ دیتے۔ یہاں روپ کا بدل صرف روپ ہے، ترازو کے ایک پلڑے میں حُسن ہو تو دوسرا باٹ تبھی اسے متوازن کر سکتا ہے، جب وہ خود بھی حسین ہو۔ ساری رات میرے دل و دماغ میں عجیب سی سنسناہٹ ہوتی رہی، جیسے قدرت نے میری کہانی کا انجام کسی دوسرے کی زبانی مجھ تک پہنچا دیا ہو۔ جانے کب میری آنکھ لگ گئی اور پھر خانو کی ہلکی ہلکی آوازوں نے مجھے دوبارہ جگا دیا۔ صبح ہو چکی تھی، خانو مجھے بتا رہا تھا کہ ’’سائیں یہ بی بی کب سے آپ کے جاگنے کا انتظار کر رہی ہے۔ کہتی ہے، سائیں کا بڑا نام سنا ہے۔ دعا لینے آئی ہے۔‘‘ میں نے چونک کر سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھا اور ایک لمحے میں ہی میرے لیے آسمان، زمین پر ڈھے گیا اور زمین فلک سے جا ملی۔ میرے سامنے عینی بیٹھی ہوئی تھی۔ ہاں، میری مجسمہ ساز۔ وہی قرۃ العین...... مگر اس کی آنکھوں پر یہ سیاہ چشمہ کیوں لگا ہوا تھا ابھی تک۔ میں نے خانو کو اشارہ کیا کہ وہ لڑکی سے کہے، چشمہ اتار دے، مگر خانو جا چکا تھا۔ میں نے دھیرے سے بھاری آواز میں کہا۔ ’’بی بی! اپنے چہرے سے اندھیرے کا یہ پردہ ہٹا دو تا کہ میں تمہاری آنکھوں میں جھانک کر تمہاری روح کے زخم دیکھ سکوں۔‘‘ مگر وہ رو پڑی۔ ’’نہیں سائیں جی! میری آنکھیں بے نور ہیں۔ آپ ان میں جھانک کر بھی صرف اندھیرے ہی دیکھیں گے۔ میں زور سے چلا اٹھا۔ ’’کیوں...... تمہاری آنکھیں اب تک بے نور کیوں ہیں......؟ اگر دعا ہی کروانی ہے تو اپنی بینائی کی دعا کرواؤ۔‘‘ عینی نظریں جھکا گئی۔ ’’نہیں سائیں، جس کو دیکھنے کے لیے مجھے بصارت چاہیے تھی۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ اب میں بینائی کا کیا کروں گی۔‘‘ میں اس کی بات سُن کر سسک اٹھا۔ وہ بھی روتی رہی اور پھر اچانک میرے کانوں میں خانو کی آواز گونجی۔ ’’سائیں جی! کیا ہوا، سب خیر تو ہے ناں...... تم رو کیوں رہے ہو، کیا کوئی بُرا سپنا دیکھا ہے۔‘‘ میں نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔ خانو مجھ پر جُھکا ہوا میرے گالوں سے میرے آنسو پونچھ رہا تھا۔ گویا میں واقعی خواب دیکھ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے خانو کو سمجھا بجھا کر کام پر بھیجا، مگر خود میرا چین و سکون مزید برباد ہو گیا۔ کچھ خواب ہمیں کس قدر بے سکون کر جاتے ہیں۔ سینے کے پنجرے میں بند یہ دل ایک دم ہی ہر دیوار، ہر رکاوٹ توڑ کر باہر نکلنے کو بے تاب ہو گیا۔ مجھے لگا، جیسے وہ خواب اُدھورا رہ گیا ہو۔ شاید عینی کی آنکھیں واپس مل چکی ہوں، مگر میری آواز پہچان کر اور میرے چہرے کو دیکھ کر اس نے مجھے نہ پہچاننے کے لیے یہ ساری کہانی گھڑی ہو۔ مجھے خانو پر شدید غصہ آنے لگا، جس نے درمیان میں میری نیند توڑ کر مجھے خواب کے آخری حصے اور انجام جاننے سے روک دیا۔ سکینہ نے کہا تھا کہ محبت میں ایک وقت ایسا آتا ہے، جب ہمارے خواب سچے ہونے لگتے ہیں۔ قدرت نے ایک ہی رات میں مجھے دو اشارے دیے تھے۔ پہلا ثریا اور کلیم کی کہانی سنا کر اور دوسرا یہ اُدھورا خواب دکھا کر۔ یقیناً قدرت مجھے یہ جتانا چاہ رہی تھی کہ عینی اگر بینائی ملنے کے بعد مجھے دیکھ لیتی، تو وہ ضرور رو رو کر خدا سے یہی شکوہ کرتی کہ اس چہرے کو دیکھنے سے تو بہتر تھا کہ اسے دوبارہ بصارت ہی نہ ملتی۔ وہ اندھی ہی رہتی تو اچھا تھا۔ میرے اندر چلتے جھکڑ تیز ہونے لگے۔ جیسے واقعی عینی نے مجھے دیکھ لیا ہو۔

میری حالت شام تک اتنی بگڑ گئی کہ سانس بھی اٹک اٹک کر آنے لگی۔ خانو نے مجھے یوں تڑپتے دیکھا تو بنا کچھ کہے ایک جانب بھاگ گیا۔ اور گھنٹہ بھر بعد شہر کے ایک مستند ڈاکٹر کی دواؤں کا بکس اٹھائے اس کے آگے آگے بھاگتا ہوا نمودار ہوا۔ ڈاکٹر نے میری نبض دیکھی اور تشویش سے خانو کی طرف دیکھا۔ ’’تمہارے سائیں کی حالت تو بڑی خراب ہے، میں دوا کی تین خوراکیں دیے تو جا رہا ہوں، مگر ہو سکے تو سائیں کو شہر کے بڑے اسپتال پہنچانے کی کوشش کرو۔‘‘ خانو نے تیزی سے سر ہلایا، مگر وہ اندر سے جانتا تھا کہ میں اب یہاں سے کہیں نہیں ٹلنے والا۔

اگلے روز بادل پھر ٹوٹ کر برسے، میری سانس اکھڑنے لگی تھی، جیسے سینے کی قید سے آزاد ہونے میں اسے بہت سی سلاخوں سے ٹکرا کر باہر نکلنا پڑ رہا ہو۔ میری نظر دھیرے دھیرے پتھرانے لگی، تو خانو نے روتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ’’چلو سائیں، ایک بار میری بات بھی مان لو، چلو کسی بڑے اسپتال چلتے ہیں۔‘‘ میں نے برستی بارش کی بوندوں میں خانو کے آنسو پانی میں مل کر پانی ہوتے دیکھے اور مُسکرا دیا۔ میری آواز رُک رُک کر نکل رہی تھی۔ ’’کیوں ڈھونگی کہیں کے...... ذرا سی بیماری نے ہی تمہارے سائیں کی کرامات پر تمہارا یقین اور اعتماد چھین لیا؟ ابھی کل تک تو تم سارے علاقے میں سب سے کہتے پھرتے تھے کہ تمہارا جوگی سائیں اپنی دعا سے ہر بیماری اور ہر روگ کا علاج کر سکتا ہے۔ اور آج جب خود تمہارا سائیں بیمار پڑا، تم اسے شہر کے بڑے اور تجربہ کار ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی ضد کر رہے ہو۔ اگر میری دعاؤں میں باقی لوگوں کے لیے اتنا اثر ہوتا تو کیا آج میری اپنی بیماری ایک پھونک ہی میں ہوا نہ ہو جاتی؟‘‘

تیز بارش میں بھیگتی ایکسپریس گاڑی پلیٹ فارم پر داخل ہوئی، تو ایک ہلچل سی مچ گئی۔ کچھ مسافر اترے اور کچھ ٹرین پر سوار ہو گئے۔ میں نے دُور اسٹیشن کے بیرونی گیٹ سے ایک نوجوان جوڑے کو اندر آتے دیکھا۔ مرد تیز بارش سے خود کو بچاتے ہوئے کسی کی تلاش میں برآمدے کی جانب بڑھ گیا۔ میری لمبی جٹا دھاری بالوں کی لٹیں بھیگ کر میرے چہرے کے گرد پھیل چکی تھیں۔ میں سر جھکائے یوں مراقبے میں پڑا ہوا تھا، جیسے اپنی آخری سانس نکلنے کا خود انتظار کر رہا ہوں۔ اچانک میرے قریب ہی سیاہ لباس میں کسی نازک سے سراپے کا ہیولا ابھرا اور وہ میرے قریب بیٹھ گئی۔ خانو نے اسے دبے لفظوں میں میری بیماری اور بگڑتی حالت کے بارے میں بتایا، مگر وہ برستی بارش میں یونہی دھرنا دیے بیٹھی رہی۔ خانو کو مجبوراً وہاں سے اٹھ کر جانا پڑا تا کہ وہ تنہائی میں مجھ سے اپنی منت بیان کر سکے۔ نقاہت اور غنودگی سے میری آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں، مگر جان یوں اٹکی ہوئی تھی، جیسے ضد پر اڑی ہو۔ اور پھر وہ ہلکا سا کھنکار کر بولی تو اس کی مترنم آواز نے میرے وجود میں چھپی سبھی خفیہ گھنٹیوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ مجھے یوں لگا، جیسے میرے ارد گرد زلزلہ آ گیا ہو۔ میں اس میٹھی آواز کو کیسے بھول سکتا تھا؟ ہاں...... یہ اُسی کی آواز تھی، جس کی سانسوں کی آہٹ بھی میں سُن سکتا تھا۔ میرا خواب سچ ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ ’’مجھے پتا ہے کہ آپ اپنے ارد گرد خواتین کی موجودگی پسند نہیں کرتے، اور نہ ہی کسی عورت سے ہم کلام ہونا آپ کو اچھا لگتا ہے، مگر میں آج بڑی امید لے کر آپ کے پاس آئی ہوں۔ کئی سال سے بھٹک رہی ہوں دربدر...... میرا کوئی اپنا کھو گیا ہے۔ آپ کی دعا کا بڑا چرچا سنا ہے۔ میں آپ سے التجا کرتی ہوں۔ میرے لیے بھی دعا کریں۔‘‘ میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے، میری دعا میرے سامنے بیٹھی مجھے دعا کرنے کا کہہ رہی تھی۔ وہ بے چینی اور پریشانی میں اپنی خُوب صُورت انگلیوں کو حسبِ عادت بار بار آپس میں جوڑ کر کھول رہی تھی۔ یہ وہی ہاتھ تھے، جنھوں نے کبھی میرا چہرہ چُھو کر ایک مجسمہ تراشا تھا۔ میری جُھکی نظر نے اس کے ہاتھ میں پہنی انگوٹھی دیکھی۔ میں خاموش رہا۔ وہ مجھے پہچان نہیں پائی تھی، پہچانتی بھی کیسے۔ اس نے آج تک مجھے دیکھا ہی کب تھا؟ میری سانس اکھڑنے لگی۔ مجھ میں اس کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھنے کی بھی ہمت نہ تھی۔ میری رُکتی سانسوں کی آواز سُن کر وہ گھبرا کر میرے اور قریب آ گئی ’’آپ ٹھیک تو ہیں؟‘‘ دفعتاً میری نظر اس کی آنکھوں پر لگے کالے چشمے پر پڑی تو میرے اندر بیک وقت کئی جھکڑ چلنے لگے۔ حسبِ توقع ایک چشمہ اس کی خوب صُورت سرمئی آنکھوں کا پہرے دار بنا بیٹھا تھا۔ کہیں خدانخواستہ عینی کی آنکھوں کا آپریشن واقعی ناکام تو نہیں ہو گیا تھا۔ تیز بارش اس کا نازک وجود بھگو رہی تھی، میرا جی چاہا کہ میں اس کے سامنے کھڑے ہو کر اس کے وجود کے لیے چھتری بن جاؤں، مگر میں تو خود کسی کم زور پتّے کی طرح لرز رہا تھا۔ وہ کچھ دیر یونہی دوزانو بیٹھی بھیگتی رہی اور پھر واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرا دل کسی نے مُٹھی میں لے کر مسل دیا ہو جیسے۔ اسے آواز دے کر روک لینے کی خواہش کو میں نے نہ جانے کس طرح روکا۔ بس زبان دانتوں تلے داب لی۔ مُڑتے ہوئے اچانک پانی میں اس کا پاؤں پھسلا اور وہ ڈگمگائی، میں تڑپ کر اسے گرنے سے روکنے کی کوشش کے طور پر آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ کسی سہارے کی تلاش میں فضا میں لہرائے اور میرے چہرے کو چُھو گئے۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹا، وہ کچھ لمحوں کے لیے حیرت اور صدمے سے ششدر رہ گئی اور پھر اس نے بے تابی سے دوبارہ میرے چہرے پر اپنی انگلیاں پھیریں اور زور سے چلائی ’’پری زاد...... یہ آپ ہی ہیں ناں...... آپ چپ کیوں ہیں......؟ بولتے کیوں نہیں......؟‘‘ میں اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے وہاں سے اٹھ کر چند قدم بھاگا، لیکن مجھ میں بھاگنے کی ہمت اور طاقت ہوتی، تو پھر رونا ہی کس بات کا تھا۔ میں لڑکھڑا کر یوں گرا، جیسے کوئی کسی کی نظر سے گرتا ہے، مگر مجھے دنیا کی نظر سے گرنے کی پروا ہی کب تھی۔ مجھے تو بس اس ایک نگاہ سے بچنا تھا کہ جس میں کبھی میرا ایک مقام تھا۔ مجھے زمانے کی ہر فنا قبول تھی، مگر اس کی نظر میں نفرت یا رحم اور ہمدردی کی جھلک میرے لیے دنیا کی ہر موت سے کہیں بڑھ کر فنا تھی۔ میں نے خود کو پوری طرح سمیٹ کر چھپا لیا۔ اچانک میرے کانوں میں ایک مردانہ آواز گونجی۔ ’’کہاں تک بھاگیں گے اور کب تک خود کو چھپائیں گے پری زاد صاحب...... میں آپ کو اتنا کم زور نہیں سمجھتا تھا۔‘‘ ڈاکٹر عدنان میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا، آس پاس چلتے لوگوں کی بھیڑ جمع ہونے لگی۔ عینی وہیں دُور بیٹھی رو رہی تھی۔ میں نے عدنان سے منت کی ’’مجھے جانے دو عدنان...... اس کی جس ایک نظر سے بچنے کے لیے میں نے ساری دنیا تیاگ دی۔ وہ نظر میرا پیچھا کرتے کرتے یہاں تک آ پہنچی ہے۔ میں بہت نڈھال اور بڑا گھائل ہوں عدنان۔ مجھے اور زخمی نہ کرو۔ میرا دم میرے اس آخری بھرم

کے ساتھ نکل جانے دو......'' عدنان کی آواز لرز رہی تھی، اس ایک نظر کا اتنا ہی خوف تھا تو پھر آپ نے عینی سے محبت کیوں کی تھی......؟'' ''نہیں، یہ جھوٹ ہے۔ میں نے محبت نہیں کی۔'' عدنان نے میرے لرزتے ہاتھ تھام لیے۔ ''محبت نہیں کی، تو پھر یہ جوگ، تیاگ کیسا؟ اس کا سامنا کرنے کا خوف کیوں۔ کمالی نے امریکا سے واپسی ہی پر ہمیں سب بتادیا تھا۔ کاش! آپ مجھ سے یہ بات نہ چھپاتے۔ اور پھر ہر گرہ خود کھلتی گئی۔ آپ نے میری محبت کی وجہ سے اپنے آپ کو اس حد تک برباد کرلیا پری زاد، آخر کیوں؟ ایسا کون کرتا ہے، چھین لیتے اُسے مجھ سے۔ اُس پر سب سے زیادہ حق اس ساری دنیا میں صرف آپ کا تھا۔ آپ نے وہ حق بھی مجھے سونپ دیا۔ صرف اس خوف سے کہ وہ آنکھیں ملنے کے بعد آپ کو قبول نہیں کرے گی۔ آپ نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ وہ زندگی کے اتنے اہم موڑ پر اپنے فیصلے کیسے کرے گی۔ اس نے آپ کو اپنی زندگی میں سب سے زیادہ مان دیا۔ اس کے کتنے بھرم آپ سے جڑے تھے اور آپ اسی کو بیچ منجدھار میں چھوڑ آئے۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ آپ کے بغیر کیسے چل پائے گی؟'' میں نے اپنی سانسیں جمع کیں۔ ''میں اس کی نئی رنگوں سے بھری دنیا کو اپنے وجود کی کالک سے سیاہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ صرف تم ہی اس کے قابل تھے اور میں نے صرف تمہارے بھروسے اُسے چھوڑا تھا، میں جانتا تھا۔ اگر میں اس کا ہاتھ مانگتا، تو وہ مجھے دیکھ کر بھی شاید انکار نہ کرتی۔ کیوں کہ اس کی روح میرے اَن گنت احسانات کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی، لیکن مجھے کسی احسان کا بدلہ نہیں چاہیے تھا عدنان...... میری منزل تو بس ایک نظر تھی۔ اس کی پیار بھری ایک نظر۔'' عدنان نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے، اگر آپ کو نظر کی پہچان کا اتنا ہی دعویٰ ہے، تو آج یہ بھرم بھی آزمالیتے ہیں۔ وہ آرہی ہے، دیکھتے ہیں آپ کو دیکھ کر اس کی نظر کیا کہتی ہے۔ آج آپ کے مقدر کی وہ نظر خود فیصلہ کرے گی، جب آپ حسبِ وعدہ آپریشن سے پہلے نیویارک نہیں پہنچے، تو عینی نے اپنی آنکھوں کے آپریشن سے انکار کردیا تھا، وہ جان گئی تھی کہ آپ کیوں نہیں آئے۔ میں نے آپ کی قسم دے کر اُس کا آپریشن تو کروادیا، مگر بینائی ملنے کے بعد بھی اس نے اپنی آنکھوں پر آج تک وہ سیاہ چشمہ لگا رکھا ہے۔'' میں چلا اٹھا، ''مگر کیوں، تم نے تو اس کا ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا مجھ سے۔'' تبھی عینی کی آواز میرے قریب سے اُبھری۔ ''وعدے تو آپ نے بھی بہت کیے تھے دوستی نبھانے کے پری زاد...... آپ یہ کیسے بھول گئے کہ میرا آپ سے روح کا رشتہ تھا۔ اور جب روح کے رشتے جڑ جائیں تو چہرے بے معنی ہوجاتے ہیں۔ آپ کو مجھ پر اتنا بھروسا بھی نہیں تھا۔ بس، اتنا ہی جانتے تھے آپ مجھے۔'' خانو نے صورتِ حال کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے لوگوں کو پرے دھکیل دیا تھا۔ میں وہیں زمین پر پڑا بارش میں بھیگ رہا تھا۔ عینی نے وہیں زمین پر دوزانو بیٹھ کر میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ میری جلتی روح کسی ٹھنڈے پانی کی آبشار تلے آگئی۔ اس نے میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے چھوا، تو مجھے یوں لگا، جیسے ہر داغ، ہر سیاہی ڈھلتی چلی گئی ہو۔ میں اس کے چھوتے ہی کتنا خوب صورت ہوگیا تھا۔ ''پری زاد'' بن گیا تھا۔ عینی نے اپنی آنکھوں سے سیاہ چشمہ اتار لیا، میرے نصیب کی نظر میری نظر سے ٹکرائی۔ کسی بھی طنز، حقارت، تمسخر یا نفرت سے مبرّا۔ ایک پیار بھری نظر۔ میرے مقدر کی نظر......'' وہ میرا سر گود میں لیے بیٹھی روتی رہی۔ اور برستی بارش کی بوندیں، اس کے پاک اور معطر آنسوؤں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے خود ان آنسوؤں میں مل کر پاک ہوتی رہیں۔ ''میں بھی کتنی بدنصیب ہوں۔ آپ نے سب سے چھپا کر جس محبت کو اپنے مَن میں دبائے رکھا، اس کی خبر میرے سوا باقی سب کو تھی۔ ایک بار صرف ایک بار مجھ سے کہہ کر تو دیکھتے...... تب میں آپ کو بتاتی کہ آپ میرے لیے کیا ہیں...... اتنا کم زور سمجھ رکھا تھا آپ نے قراۃ العین کو۔''

دُور کھڑے قضا کے فرشتے نے مجھے اشارہ کیا۔ ''انشا جی اٹھو...... اب کوچ کرو۔'' میں نے چند سانسیں مزید اُدھار مانگیں اور اس مہ وَش کے ہاتھوں کو تھام لیا۔ ''نہیں عینی...... میں تم پر زندگی کے رنگوں کے دروازے بند نہیں کرنا چاہتا تھا، میرے نہ ہونے سے تمہاری روشن دنیا میں ایسی کون سی کمی ہوجاتی۔ میں تو یوں بھی تمہاری زندگی میں اضافی تھا۔'' اس کے آنسو بارش کی تیز بوندوں کے ساتھ مل کر میرے چہرے کو پاک کرتے رہے۔ ''پہلے میں خود نہیں جانتی تھی پری زاد، مگر آپ سے دُور ہو کر جانا کہ میری ہر کمی آپ ہی سے پوری ہوتی ہے۔ آپ نے خود کبھی کہا نہیں اور مجھے امریکا جا کر پتا چلا کہ آپ اضافی نہیں، لازمی ہیں۔'' میں نے عینی کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''ہاں...... کبھی نہیں کہہ پایا، مگر آج کہتا ہوں، مجھے تم سے محبت ہے قراۃ العین...... شدید محبت۔'' میری نبض ڈوب رہی تھی، میرے کان میں قضا دھیرے سے گنگنائی۔ ''وحشی کو سکوں سے کیا مطلب...... جوگی کا نگر میں ٹھکانہ کیا؟'' آس پاس کا سارا شور مجھے دھیرے دھیرے سرگوشیوں میں ڈھلتا محسوس ہورہا تھا۔ جانے لوگ آپس میں کیا سرگوشیاں کررہے تھے؟ بارش تیز تر ہو کر بھی مجھے بھگو نہیں پارہی تھی۔ اتنی تیز آندھی کے باوجود، حبس سے میرا دَم کیوں گھٹ رہا تھا، وہ میرا سر گود میں لیے زاروقطار رو رہی تھی۔ زندگی سمٹ کر ان چند لمحوں میں سمٹ آتی ہے، جب عمر بھر کی ریاضت اور دعائیں رنگ لاتی ہیں۔ آج میری عمر بھر کی تپسیا بھی پوری ہوئی۔ اب بھلا کس کو جینے یا مرنے سے غرض تھی۔ کتنی صدیاں اس ایک پَل میں جی لی تھیں میں نے۔ زندگی نے ہر قرض چکا دیا تھا، میری اضافی اور مانگی ہوئی سانسیں پوری ہونے کو آئیں، تو آس پاس دھیرے دھیرے روشنی کم ہونے لگی، میری آنکھیں پتھرانے لگیں، کبھی سنا تھا کہ دھڑکن بند ہو بھی جائے تو دماغ کچھ لمحے زیادہ جیتا ہے۔ چاروں طرف ایک عجیب سا شور مچ گیا، جیسے بہت سے لوگ مل کر بین کررہے ہوں۔ جانے سب رو کیوں رہے تھے، میری پتھرائی آنکھیں تو ابھی تک اُسی نظر پر جمی ہوئی تھیں، جس نے میری تکمیل کردی تھی۔ خانو دھاڑیں مار مار کر سب سے لپٹ کر میری طرف اشارے کرکے جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ عدنان کی آنکھیں بھی برس رہی تھیں۔ اس نے عینی کو تھام رکھا تھا۔ ہاں، اب وہی تو اس کا سہارا تھا۔ کسی نے آگے بڑھ کر میرے جسم پر سفید چادر ڈال دی۔ میرا چہرہ واضح رہا۔ مجھے اپنے قدموں کی جانب سے خون کی گردش رُک کر سارے جسم میں جامد ہوتی محسوس ہوئی اور میرے ذہن کے اندھیرے بڑھنے لگے، پھر کسی نے آگے بڑھ کر میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر زور سے ''اناللہ وانا الیہ راجعون'' کہہ کر میرے پپوٹے بند کردیے۔ اور میرا دماغ ہمیشہ کے لیے اندھیروں میں ڈوب گیا۔

ہمیشہ دیر کردیتا ہوں میں......

ضروری بات کہنی ہو، کوئی وعدہ نبھانا ہو

اُسے آواز دینی ہو، اُسے واپس بلانا ہو

ہمیشہ دیر کردیتا ہوں میں......

مدد کرنی ہو اُس کی، یار کی ڈھارس بندھانا ہو

ہمیشہ دیر کردیتا ہوں میں......

بہت دیرینہ رستوں پر کسی سے ملنے جانا ہو

ہمیشہ دیر کردیتا ہوں میں......

بدلتے موسموں کی سیر میں، دل کو لگانا ہو

کسی کو یاد رکھنا ہو، کسی کو بھول جانا ہو

کسی کو موت سے پہلے، کسی غم سے بچانا ہو

حقیقت اور تھی کچھ، اُس کو جاکے یہ بتانا ہو

ہمیشہ دیر کردیتا ہوں میں......

ہمیشہ دیر کردیتا ہوں......

(ختم شد)